آجکل



دو روپے

ستمبر ۱۹۸۱ء






آجکل البم






حسرت موہانی ماہ و سال کے آئینے میں

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

ماہنامہ
آجکل
نئی دہلی

ایڈیٹر
راج نرائن راز
اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر
شونا تھ سکہ

جلد ۴۰ شمارہ ۱-۲

اگست ستمبر ۱۹۸۱ء

شرادھ بھادر آشون شک ۱۹۰۳

فون
۳۸۷۰۶۹

شرح چندہ

	ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱/۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵/۴۰ ڈالر ۲/۷۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۷/۵۰ ڈالر ۳/۷۵ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۱/۵۰ روپیہ	۳۰ سینٹ ۱۵ پینی

ترتیب

سرورق: الکا

اس شمارے کے ساتھ بچوں کا ضمیمہ پیش کیا جارہا ہے جو بلا قیمت ہے

ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر "آج کل" اردو، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ملاحظات

اقتصادی ترقّی

پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۰ جولائی کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ہم نے اقتصادی ترقی اور لوگوں، خصوصاً غریبوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے کاموں کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ہماری اقتصادی ترقّی کی حکمتِ عملی کے خاص خاص جز و ہیں: زرعی پیداوار میں اضافہ، تیز تر صنعت کاری، صنعتوں کو جدید بنیادوں پر منظّم کرنا، ٹیکنالوجی میں ترقی، ترقّی کے فوائد کی برابر تقسیم اور ترقّی کے ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ احتیاط۔

آپ نے فرمایا کہ معاشی سرگرمی کا یہ رُجحان مسلسل جاری رہا۔ حالیہ مالی سال کی پہلی سہ ماہی کے دوران میں گذشتہ سال کی اسی مدّت کی سہ ماہی کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار میں ۲ر۱۹ فیصد، کوئلے کی پیداوار میں ۲ر۶ فیصد، فولاد کی پیداوار میں ۲۰ فیصد، سیمینٹ کی پیداوار میں ۲۰ فیصد اور ریلوں کے لدان میں ۱۴ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اپریل سے مئی ۱۹۸۱ کے دوران میں گذشتہ سال کی اسی مدت کے مقابلے میں ملک کی ۲۹ بڑی صنعتوں کی پیداوار ۱ر۱۹ فیصد بڑھی۔

تاہم ہمیں اس امر کی یقین دہانی کرنی ہوگی کہ صارفین، بالخصوص غریب اور درمیانہ طبقے ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں مناسب داموں پر حاصل کر سکیں۔ ہم افراطِ زر پر قابو پانے اور معیشت پر گرفت رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔

اس خطّے میں ایف ۱۶ طیّاروں کے آنے کا مطلب ایک ایسے زمرے کے طیّاروں کی آمد ہے، جو اس خطّے کے کسی ملک کی فضائیہ کے پاس نہیں ہیں۔ اس طرح برصغیر کو اسلحہ کی دوڑ میں ڈھکیل دیا گیا ہے، جس سے ہمارے عوام پر ایسے وقت میں مالی بوجھ بڑھ گیا ہے، جبکہ ہمارے محدود وسائل کا پورا استعمال عوام کے لیے نیز سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقّی میں پیچھے رہ جانے سے ہونے والے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ چین کے ساتھ ہم اپنے تعلقات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اور ہم نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ ہمارے درمیان انتہائی دشوار اور نازک مسائل ہیں بنیادی خیرسگالی اور کوششوں کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

مواصلاتی مصنوعی سیّارہ "ایپل"

ہندوستان کو اپنی خلائی کوششوں میں ۱۹ رجون ۱۹۸۱ء کو اور کامیابی اس وقت حاصل ہوئی، جب اس کا تجرباتی مواصلاتی مصنوعی "ایپل" کامیابی کے ساتھ خلا میں داغا گیا۔ خلائی ترقّی میں ہماری یہ کامیابی سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِسے یورپی خلائی ایجنسی کے راکٹ ا کے ذریعے فرانسیسی گیانا (جنوبی امریکہ) میں کورو کے مقام سے داغا گیا طے شدہ پروگرام کے مطابق "ایپل" کو ۱۶، جولائی ۱۹۸۱ء کو ساکن مدار میں ڈگری مشرقی طول البلد میں کامیابی کے ساتھ ٹھہرا دیا گیا۔

اس مصنوعی سیّارے کے زمین کے ساکن مدار میں آجانے سے ہندوستان کے مواصلاتی نظام میں اہم تبدیلی و ترقّی واقع ہوگی۔ [اس سیّارے نے ۲ جولائی کو پہلا مواصلاتی تجربہ کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک کی مواصلاتی صلاحیتوں میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا]۔

خلا میں ساکن اور ملک کے مواصلاتی سیّاروں کے پیش رو سیّارے پر کیے گئے پہلے تجربے میں ایک ٹیلی ویژن پروگرام ٹیلی کاسٹ کرنے کی آزمائش کی گئی۔ احمد آباد کے خلائی مرکز سے اس سیّارے کی مدد سے رابندرناتھ ٹیگور کا ڈرامہ چنڈالیکا ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ جسے بنگلور میں، خلائی تحقیق کے ادارے اسرو کے ہیڈکوارٹر میں بالکل صاف دیکھا گیا۔

خلائی تحقیقاتی ادارے کے ترجمان کے بیان کے مطابق ایپل پر ایک برس تک تجربہ کیا جائے گا۔ یہ عمل معمول کے مطابق روزانہ بارہ گھنٹوں تک جاری رہے گا۔

اس برس یومِ آزادی کے مبارک موقع پر منعقد ہونے والی تقریبات اور صدرِ جمہوریہ شری نیلم سنجیوا ریڈی کی تقریر ایپل کے ذریعے ملک میں ٹیلی کاسٹ اور نشر کی جائیں گی۔

حسرت نمبر

حسرت موہانی کی ۱۰۰ ویں سالگرہ کی تقریبات کے سلسلے میں اگست، ستمبر کا یہ مشترکہ شمارہ حسرت موہانی نمبر کی شکل میں پیشِ خدمت ہے۔ یہ خصوصی شمارہ نئے مضامین کے ساتھ ساتھ بعض پرانے مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہے۔

اہلِ علم حضرات نے جہدِ آزادی کے نڈر مجاہد۔ حسرت موہانی کی "مشقِ سخن" پر بیش اور "چکی کی مشقّت" پر نسبتاً کم توجّہ کی ہے۔ امید ہے، اس نمبر میں شامل مضامین سے حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا نقش زیادہ نمایاں

(بقیہ صہ ۸۵ پر)

عتیق صدیقی

حسرت موہانی

سیاسی زندگی کا آغاز

انجمن اردوئے معلیٰ سے رسالہ اردوئے معلیٰ تک

بیسویں صدی کے آخری سال، علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج دونوں) کی تاریخ میں شاید نہایت نامسعود و نامبارک سال تھے۔ اسی سال، تحریک اور کالج دونوں کے بانی سر سید احمد خاں نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔ دوسرا سال ابھی ختم ہونے بھی نہ پایا تھا کہ کالج کے پرنسپل تھیوڈر بیک بھی موت کا شکار ہوئے جو تحریک اور کالج دونوں کے باب میں سر سید کے ذہن شناس ہی نہیں تھے، بلکہ ان کے دست راست بھی رہے تھے۔ پھر ان دونوں سانحوں کی درمیانی مدت میں، کالج کے سربراہوں نے ایک نوجوان طالب علم سید فضل الحسن حسرت موہانی کو کالج میں داخلہ لینے کے لیے علی گڑھ آنے کی دعوت دی، جس نے اسی سال بڑے امتیاز کے ساتھ انٹرنس پاس کیا تھا اور پورے صوبے میں اول آیا تھا۔ اس نوجوان اور ذہین طالب علم کی سیدھی سادی قصباتی وضع قطع سے کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ چند ہی سالوں کے بعد سر سید کی تحریک کے مقاصد اور کالج کے نصب العین سے بغاوت کی حد تک انحراف کرے گا، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پر برطانوی حکومت کے خلاف، جسے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی دنیا میں اولوالامر کا درجہ حاصل تھا، بغاوت کرنے کے جرم میں ماخوذ و سزایاب ہوگا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی دنیا میں داخل ہونے والے اس نووارد طالب علم کے بارے میں ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ:

> "جس دن یہ حضرت یکے سے اتر کر بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئے، تو ڈھیلا پائجامہ پہنے تھے۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی، ہاتھ میں پاندان۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یاروں نے 'خالہ جان' کی پھبتی کہی[1]..."

ایک دوسرے عینی شاہد نے اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ اس طالب علم کے ورود کے وقت

> "جو لوگ علی گڑھ میں تھے ان کو یاد ہوگا کہ ان ایام کے نوواردوں میں کوئی بھی بلحاظ شکل و شباہت، وضع قطع اور چال ڈھال کے اس قدر دلچسپ نہ تھا جس قدر نواح لکھنؤ کا یہ طالب علم، جسے محبت اور مذاق نے 'خالہ جان' کا نام دے دیا تھا۔ چھوٹا قد، لاغر بدن، گندمی رنگ پر چیچک کے مٹے ہوئے داغ، عمر کا لحاظ کرتے ہوئے داڑھی کسی قدر گھنی۔ فراخ پیشانی اور چہرے کی مسکراہٹ قیافے کو ناگوار نہ ہونے دیتی تھی۔ اس پر کلابتونی ٹوپی، پرانی وضع کا چار خانے کا انگرکھا، شروع کا تنگ پائجامہ، جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے۔ عینک اور چھتری کا اضافہ کیجیے، تو 'خالہ جان' یا دوسرے الفاظ میں سید فضل الحسن حسرت موہانی کی صورت چشم تصور میں پھرنے لگے گی۔"[2]

---

* زیر تالیف کتاب کا ایک باب

[1] مشتاق احمد زاہدی: بہ حوالہ قرۃ العین حیدر: کار جہاں دراز ہے (حصہ اول): ص ۱۱۸

[2] خانی خاں: حسرت ایک قدردان کی نظر سے: زمانہ (کانپور): جلد ۱۱ نمبر ۶: ص ۲۹۷
یہ مضمون سجاد حیدر یلدرم کا تھا۔ اس دور کے حالات کے پیش نظر اصلی نام ظاہر نہ کرنے کے اسباب سمجھنا چنداں دشوار نہیں ہے۔ قرۃ العین کے بیان کے مطابق یلدرم نے یہ مضمون ۱۹۰۸ء میں لکھا... قاضی عبدالغفار مرحوم نے عرشی زادہ اکبر علی خاں کو دیا، جو انھوں نے نگار (رام پور) میں ۱۹۶۵ء میں شائع کیا" (کار جہاں دراز ہے۔ حصہ اول: ص ۱۲۰) لیکن یہ وہی مضمون ہے جو خانی خاں کے نام سے دسمبر ۱۹۰۸ء کے رسالہ زمانہ میں شائع ہو چکا تھا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، جس کے سہ حرفی نام کے اجزائے ترکیبی میں 'اینگلو' کو عملاً شریک غالب کی حیثیت حاصل تھی، اس کے اینگلو طرز معاشرت کے دلدادہ نوجوانوں کو حسرت کی وضع قطع جتنی عجیب، بلکہ مضحکہ خیز، معلوم ہوئی ہوگی، محتاج بیان نہیں ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس زمانے میں لکھنؤ اور نواح لکھنؤ کے اعلا اور متوسط طبقوں سے تعلق رکھنے والوں کی یہی وضع ہوا کرتی تھی۔ چناں چہ حسرت جب علی گڑھ پہنچے تو وہ اس دور کے "شرفائے اودھ کے لباس میں تھے"[3]

یہ بات اگرچہ حیرت ناک معلوم ہوگی، لیکن ہے حقیقت پر مبنی کہ حسرت نے، اپنی وضع قطع کے باوجود، ام۔اے۔او کالج کے حلقوں میں جلد ہی اپنے لیے ایک ایسی جگہ بنالی جو بہتوں کے لیے قابل رشک رہی ہوگی۔ ان کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر جن طالب علموں نے 'خالہ جان' کی پھبتی کہی تھی، وہی ان کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ "اسے ان کے اوصاف کا نتیجہ سمجھو یا ان کی خوش نصیبی کا کہ پورا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ 'خالہ جان' نے عدم کی راہ لی اور اس کی بجائے 'مولانا' بچے سے بوڑھے تک کی زبان پر جاری ہوگیا"[4]

کالج کے ماحول نے جلد ہی حسرت کی بھی وضع قطع بدلی۔ کلابتونی ٹوپی سر سے جدا ہوئی، چارخانے کا انگرکھا جسم سے اترا، مشروع کے پائجامے سے ٹانگوں کو نجات ملی اور گتھیلی جوتیوں نے بھی پاؤں سے مفارقت اختیار کی۔ لیکن انگریزی وضع کا یونیفارم، جو اس وقت کالج کا مروجہ اور مقبول عام پہناوا تھا، شاید اسے کبھی بھی حسرت کے جسم کی زینت بننے کا فخر نہ حاصل ہوسکا۔ کالج کے ملحقہ اسکول کے ساتویں درجے کے ایک طالب علم نے حسرت کو ۱۹۰۳ء میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ 'سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے، اڈیٹر اردوئے معلیٰ' بن چکے تھے، کا بیان ہے کہ:

"حسرت صاحب معمولی وضع کی اچکن پہنے، سر پر ایک بالکل چپٹی سی ترکی ٹوپی بے حد گھنی داڑھی رکھے۔۔۔ بیٹھے تھے۔ علی گڑھ کی تاریخ میں اس زمانے کو یہ درجۂ اتم انگریزیت کا زمانہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ مذہبیت درکنار، یہ خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ کالج کا کوئی ایسا گریجویٹ ہوگا جو روزمرہ اپنے چہرے پر استرا نہ پھیرتا ہو[5]۔ مجھے یاد ہے کہ حسرت کو دیکھ کر میں کچھ مرعوب سا ہوگیا، اور سوچنے لگا کہ اس شخص میں کیا اوصاف ہوں گے کہ اس نے طالب علمی ہی کے زمانے میں اتنا نام پیدا کرلیا ہے"[6]

۱۹۰۳ء میں حسرت کے لباس کی جو وضع قطع تھی اس نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا۔ اردوئے معلیٰ کی اڈیٹری، بلکہ طالب علمی کے زمانے سے لے کر آزاد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبری تک "معمولی سی اچکن، بالکل چپٹی سی ترکی ٹوپی، بے حد گھنی داڑھی"، کم و بیش نصف صدی تک ان کی رفاقت کرتی رہی۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج اور زندگی کے جملہ معمولات کی طرح ان کی وضع قطع میں بھی ایک نوع کی ربودگی و وارفتگی پیدا ہوگئی تھی۔ چناں چہ ان کے آخری زمانے کا نقشہ یہ تھا: "گول چھدری داڑھی، چھوٹے تال کی عینک، بغیر پھندنے کی پرانی ترکی ٹوپی، گھسی پسی چپل، موزے سے کوئی سروکار نہیں، موٹے کھدر کی پیوندلگی کاواک سی شیروانی جس کے اکثر بٹن ٹوٹے یا غائب، ہاتھ میں بدرنگ سا جوٹ کا تھیلا، دری تکیہ اور موٹی ململی چادر کا مختصر سا بستر"[7]۔ "سفر کی حالت میں ایک مختصر سا ہینڈ بیگ بھی ہوتا تھا" جس کو ہمیشہ بکس کہا کرتے تھے۔ اس میں پانی پینے کے لیے ایک ٹونگا، ایک چھوٹے سے ڈبے میں قلم دوات، سرمہ دانی و سلائی، کنگھا، ایک چھوٹی سی تیل کی شیشی اور ایک آدھ جوڑا کپڑا"[8]۔ اس وضع قطع سے ہندوستان ہی کا نہیں، مغربی ایشیا اور یورپ کے ملکوں کے بھی انھوں نے ایک سے زیادہ بار دورے کیے۔

یہ تھے سید فضل الحسن، جو ام۔اے۔او کالج کی ابتدائی زندگی میں پہلے 'خالہ جان'، پھر 'مولانا' بنے اور آگے چل کر ہماری سیاسی و ادبی تاریخ میں اپنے

---

[3] سید سلیمان ندوی: حسرت کی سیاسی زندگی: نگار (حسرت نمبر): جنوری و فروری ۱۹۵۲ء ص ۲۴۔

[4] خافی خاں: منذکرہ: ص ۲۹۳

[5] چہرے پر استرہ پھیرنے کا جہاں تعلق ہے زندگی کے اور معمولات کی طرح اس باب میں بھی ابتداً حسرت کی روش کچھ عجیب سی رہی تھی۔ خود ان کا بیان ہے کہ جب تک داڑھی کی درازی تکلیف دہ نہ ہوتی تھی اس وقت تک اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ مگر تکلیف دہی کی حد تک پہنچنے پر اکثر تیسرے مہینے بالکل صاف کرادیا کرتا تھا، مگر ایک بار ان کے ایک شاعر دوست نے جب داڑھی نہ منڈانے کی لجاجت کے ساتھ ان سے درخواست کی، تو ان کے دل پر اس درخواست کا "ایسا گہرا اثر ہوا کہ اس دن کے بعد پھر کبھی داڑھی منڈانے کی نوبت نہ آئی"

اردوئے معلیٰ: جلد ۱۶ نمبر ۳: مارچ ۱۹۲۵ء: ص ۴ و ۵

[6] ہارون خاں شیروانی: حسرت موہانی کے سیاسی رجحانات: آج کل (دہلی)، جون ۱۹۵۳ء: ص ۵

[7] رشید احمد صدیقی: کچھ حسرت کے بارے میں: نگار (لکھنؤ): جنوری و فروری ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر): ص ۲۴

[8] رابعہ بیگم: حسرت کی خانگی زندگی: اردو ادب: اکتوبر ۱۹۵۱ء (حسرت نمبر): ص

تخلص اور مادری وطن[۹] کی نسبت سے صرف حسرت موہانی کے نام سے کچھ اس طرح مشہور ہوئے جیسے ان کا اصلی نام لوگ بھول ہی گئے ہوں۔ ایک شعر میں خود انھوں نے کہا تھا:

جب سے کہا عشق نے حسرت مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

حسرت جو اس شکوے کے باوصف خود بھی اپنے کو حسرت موہانی ہی کہتے اور لکھتے تھے، ۱۸۸۱ء میں اتر پردیش کے قصبہ موہان (ضلع اناؤ) میں پیدا ہوئے۔ ان ہی کی نسبت سے موہان نے بھی ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ زندگی کے ابتدائی ۱۸ سال حسرت نے موہان ہی میں بسر کیے۔ مکتب سے مڈل اسکول تک کی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ دل کی شعری زندگی کی داغ بیل بھی وہیں پڑی، اور عشق کی لذت سے بھی وہیں آشنا ہوئے۔ ان کی ۱۹۰۳ء کی ایک غزل کا مقطع ہے:

عشق نے ان کو سکھادی شاعری
اب تو اچھی فکرِ حسرت ہو گئی

اودھ کے اور قصبات کی طرح موہان بھی کم از کم حسرت کے عنفوانِ شباب میں جنوں خیز ہونے کی حد تک رومان انگیز بھی تھا۔ "حسرت کے قریبی عزیز ان کے اس زمانے کے متعلق گفتگو کرتے وقت زیرِ لب مسکراتے ہیں۔ کبھی کبھی اڑتا اڑتا کوئی نام بھی سنائی دیتا ہے۔ کبھی خوبصورت پہنچیوں کا ذکر ہوتا ہے جو خربوزوں کے بیجوں کو پیلا اور سرخ رنگ کر بنائی گئی تھیں اور ہدیۂ شوق کے طور پر پیش کی گئی تھیں[۱۰]۔" ان دنوں کی یاد حسرت کے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ باقی رہی، جسے چھپانے کی بھی انھوں نے کوشش نہیں کی، بلکہ مزے لے لے کر بیان بھی کیا:

موہان کے کوچے کیا رسوائی کا مسکن تھے
جو شخص نظر آیا، بدنام نظر آیا

یہ رسوائی و بدنامی حسرت کے حصے میں بھی آئی۔ اور انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ اس کا اظہار بھی کیا ہے:

طعنِ احباب سنے، سرزنشِ خلق سہی
ہم نے کیا کیا تری خاطر سے گوارا نہ کیا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

دیوانِ حسرت حصہ اوّل (۱۴-۱۹۱۲ء) میں ان کی ایک طویل غزل کے چند قطعہ بند اشعار ان کے جنونِ عشق کے ایک نئے تیور کی نشان دہی کرتے ہیں:

دل سے یادِ روزِ کارِ عاشقی دے کے نکال
آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جائیے
ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے
کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرت جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے

"مہمانِ قضا ہونا تو خیر حسرت کے اختیار سے باہر تھا ہی، لیکن آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جانا بھی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کے اشعار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ قدرت نے پرستش کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ایک ستم پرور کی یاد، تو انھوں نے دل سے نکال دی، لیکن اس کے جذبۂ پرستش نے اپنی آسودگی کے لیے ایک نیا صنم تراش لیا، جس کا کوئی مادی وجود نہ تھا، اور پھر سب کچھ تج کر اسی کے ہو رہے۔ اسی غیر مرئی پیکر کی پرستش کو زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ حسرت کے دیوان، اوّل ہی میں ایک شعر ملتا ہے، جس میں اپنے مستقبل کے عزم کی انھوں نے واضح طور پر نشان دہی کی تھی۔ شعر یہ ہے:

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

نجاتِ ہند کی آرزو کا یہ دیا حسرت کے صنم خانۂ دل میں کس طرح روشن ہوا؟ یا نجاتِ ہند کا سودا ان کے سر میں کب اور کیسے سمایا؟ ان سوالوں کے واضح جواب ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری ڈھائی سال اور بیسویں صدی کے ابتدائی ڈھائی سال جو حسرت نے علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں بسر کیے تھے وہ کسی بھی طالب علم کے دل میں آزادیِ ہند کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے قطعی ناسازگار تھے۔ سیاسی فکر سے قطع نظر، علمی و ادبی مذاق پیدا کرنے کی طرف بھی وہاں کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی۔ اسی دور کا ذکر کرتے ہوئے سر رضا علی نے اپنے تجربات قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میرے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والوں کی خاص قدر تھی۔ ادبی ذوق پیدا کرنے یا علمی ذوق بڑھانے یا ان کی ہمت بندھانے کا خیال نہ تو اساتذہ کو تھا، نہ ٹرسٹیوں کو۔ مسٹر بیک کھلم کھلا فرماتے تھے کہ رنجیت سنگھ جی (کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جو بعد میں نوانگر کے مہاراجا ہوئے) دادا بھائی نوروجی (پارلیمنٹ کے پہلے ہندوستانی ممبر) سے کہیں زیادہ قابل[۱۱] ہیں۔ مسٹر بیک کے چہیتے طلبا صرف کھلاڑی تھے... ادبی ذوق رکھنے والے طلبا کی موجودگی صرف روا رکھی جاتی تھی۔ وہ کسی تحسین و آفریں کے مستحق نہ سمجھے جاتے تھے[۱۲]۔" یہی بات ڈاکٹر سید عابد حسین

---

۹ حسرت کا آبائی وطن فتح پور ہسوہ کے مضافات میں تھا، جہاں ان کے والد سید اظہر حسین کو "اپنی دادی کی طرف سے تحصیل کھجوہ میں تین گاؤں وراثتاً ملے تھے۔"
نیاز فتح پوری: تذکرۂ حسرت: نگار حسرت نمبر ص ۷

۱۰ رابعہ بیگم: متذکرہ

۱۱ سر سید رضا علی: اعمال نامہ: ص ۷۶-۷۵

نے واضح تر الفاظ میں کہی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق کالج کی زندگی میں "زیادہ زور ایسے وضع ولباس، اخلاق وآداب، کھیل اور ورزشوں پر دیا جاتا تھا۔ جن کے ذریعے سے انگریز حاکموں کی خوشنودی اور قربت حاصل ہو سکے[۱۲]۔"

بامن مگو ایں اے پدر! فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

کالج کے ابتدائی دور میں۔ حسرت کے علی گڑھ پہنچنے سے دس بارہ سال قبل۔ جب برطانیہ پرستی نے وہاں عریاں شکل اختیار نہیں کی تھی، کالج کے فارغ التحصیل دو ایک ایسے طالب علموں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے سرسید کی وضع کردہ سیاسی ڈگر کو نظر انداز کر کے۔ ۱۸۸۶ء و ۱۸۸۷ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاسوں میں شرکت کی تھی۔ لیکن "یہ وہ لوگ تھے جو سب سے پہلے ولایت گئے اور ... آزادی کی فضا میں رہنے کی وجہ سے آزادی کی خو اپنے ساتھ لائے تھے اور اپنا میلان کانگرس کی طرف رکھتے تھے[۱۳]۔" لیکن ان اصحاب کی طرح حسرت کو "انگلستان جانے اور آزادی کی فضا میں رہنے" کی سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان میں اور حسرت میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ آزادی کی تڑپ نے ان کے اندر جنون کی وہ شکل اختیار نہ کی تھی، جو حسرت کے حصے میں آئی تھی۔

حسرت کی سیاسی زندگی کو موضوعِ قلم بنانے والوں نے، جن کی تعداد بہت کم ہے، حسرت کے جنونِ آزادی کے محرکات کا پتا لگانے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کے یہاں صرف مبہم سے اشارے ہی ملتے ہیں۔ سید سجاد حیدر یلدرم (خانی خاں) علی گڑھ میں حسرت کے ہم عصر ہی نہیں، ان کے گہرے دوست اور ان کے ذہنی ارتقا کے عینی شاہد بھی تھے۔ ان دونوں کے تعلقات کی گہرائی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جرمِ بغاوت میں حسرت کے ماخوذ اور سزایاب ہونے سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ حسرت پر ایک طویل مضمون لکھنے سے اپنے قلم کو وہ روک نہ سکے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ مضمون لکھ کر یلدرم نے حسرت کے ساتھ اپنی دوستی کا پورا پورا حق ادا کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے قلم کے چہرے پر "خانی خاں" کے نام کی نقاب ڈال لی تھی۔ اس کے اسباب کو سمجھنا بھی چنداں دشوار نہیں ہے۔ اول تو یلدرم نے اپنے لیے وہ راہ منتخب نہیں کی تھی، جو حسرت نے اختیار کی تھی۔ دوسرے اس وقت حکومت اور خداوندانِ کالج دونوں حسرت کو جس غضب آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے اس کے پیشِ نظر حسرت کے ساتھ علانیہ ہمدردی کا اظہار کرنا آسان نہیں تھا۔ حسرت کا جرم، سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں "علی گڑھ کی سلطنت میں بغاوت کا پہلا جرم تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج کی حرمت بچانے کے لیے کالج کے بڑے بڑے ذمہ داروں نے حسرت کے خلاف [illegible] ہی دی ... یہاں تک کہ نواب وقار الملک نے بھی دو ایک [illegible] میں ... مذمت ہی کی[۱۴]۔"

ان حالات میں حسرت کی سیاسی روش کو ان کے "وصف" سے تعبیر کرتے ہوئے صرف یہ لکھنے پر اکتفا کرنا حیرت ناک نہیں ہے کہ "علمی زندگی کے ساتھ ساتھ حسرت کی عادات میں ایک ایسا وصف بھی نشو و نما پا رہا تھا، جس کا آخری نتیجہ علی گڑھ کے سیشن جج کی عدالت میں نظر آیا، اور اس سے یہ معلوم ہوگا کہ وہ شخص جو مذہب اور ادب میں قدامت پرست تھا، پالٹکس میں کانگرس کے مقدمۃ الجیش میں کیوں کر شامل ہو گیا ... یہ وصف جسے ایک قسم کی فطری کمزوری کہنا چاہیے، لگا ہے "مولانا" کے زمانۂ طالب علمی میں بھی ظاہر ہوا کیا، اور ہر مرتبہ مولانا کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا ... اور فردِ سیاہ میں، جو پرنسپل کی میز کے داہنے خانے میں رہتی ہے، اس میں ان کا نام لکھ لیا گیا[۱۵]۔"

یلدرم نے اس اجمال کی تفصیل بیان نہیں کی ہے۔ طالب علموں کی شرارتوں اور ہڑبازیوں کے چند واقعات انھوں نے ضرور قلم بند کیے ہیں، جن میں حسرت صرف شریک ہی نہیں تھے بلکہ اپنی انتہا پسند فطرت کی وجہ سے شریکِ غالب بن گئے تھے اور ہر بار ان کا نام پرنسپل کی فردِ سیاہ میں "ٹانکا جاتا رہا تھا۔ لیکن ان میں صرف ایک ہی واقعہ ایسا تھا جس کا تجزیہ کرنے کے بعد اس کی تہ میں ان کے انگریز مخالف رجحان کا شائبہ یقیناً نظر آ سکتا ہے۔ واقعہ یہ تھا:

شملے میں علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب سے بازی لی۔ علی گڑھ کے بنی اسرائیل اس پر آپے سے باہر ہو گئے۔ ایک گروہ کثیر تمام آلاتِ موسیقی جو کالج میں دستیاب ہو سکتے تھے یعنی تھالیاں، لوٹے گلاس کھانے کی سینیاں بجا بجا کر رات کی تاریکی میں شورِ محشر برپا کرتا پھرتا تھا۔ فضل الحسن جنھوں نے اپنی عمر میں نہ کبھی بیٹ چھوا تھا، نہ گیند پھینکا تھا، یہ شور سنتے ہی ایک شکستہ حال کنستر لیے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور تبیل کو حوالۂ خاک کر کے سب سے آگے آگے اپنا کوس بجاتے ہوئے پروفیسروں حتیٰ کہ نواب محسن الملک مرحوم کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فردِ سیاہ میں، جو پرنسپل کے دفتر کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی ہے، ان کا نام لکھ لیا گیا۔

حسرت کے ایک نوعمر ہم عصر کا بیان ہے کہ "حسرت کی طبیعت میں بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اور اس کا شاخسانہ یہ نکلا کہ کالج کے پرنسپل مسٹر مارلین نے (جو بعد میں سر تھیوڈر مارلین اور وزیرِ ہند کی کونسل کے ممبر ہوئے)

---

۱۲ ڈاکٹر سید عابد حسین: سرسید کا خواب: مشمولہ علی گڑھ تحریک (مرتبہ نسیم قریشی)، ص ۱۳
۱۳ میر ولایت حسین: آپ بیتی یا ایم اے او کالج کی کہانی: ص ۶۳

حسرت کو اقامت خانے [بورڈنگ ہاؤس] سے نکال دیا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ حسرت کی قابلیت کا سکہ کالج کے سکریٹری نواب محسن الملک اور مقامی رئیسوں پر بیٹھا ہوتا اور وہ طلبہ میں اتنے مقبول نہ ہوتے تو شاید انھیں کالج سے بھی نکال دیا جاتا۔ مگر پرنسپل کی اتنی ہمت نہ ہوئی اور صرف اقامت خانے ہی سے نکل جانے پر اکتفا کی گئی۔[15]

مندرجہ بالا بیان کی تائید حسرت کی ایک عزیز خاتون کے مقالے سے بھی ہوتی ہے جو ان کی وفات کے فوراً بعد لکھا گیا تھا۔ اس سے ہماری معلومات میں اتنا اضافہ اور ہوتا ہے کہ "بی۔ اے پاس کرنے سے پہلے ہی وہ سیاستِ ہند سے دل چسپی لینے لگے تھے، اور تین مرتبہ نعرۂ حریت بلند کرنے پر ایم۔ اے۔ او کالج [ہوسٹل] سے نکالے گئے تھے۔"[16]

مذکورہ مقالے میں اگرچہ اس کی وضاحت نہیں ملتی کہ حسرت نے کن مواقع پر نعرۂ حریت بلند کیے، یا ان نعروں کی نوعیت کیا تھی؟ تاہم حقیقت ہے کہ حسرت کے دل کی گہرائیوں میں، محسوس یا غیر محسوس طور پر، 'نجاتِ ہند' کی جو آرزو پیدا ہوئی تھی کالج کے انگریز اساتذہ، خصوصاً پرنسپل مارلین، کو اس کا شاید اندازہ ہو گیا تھا اور ان کی دور رس نگاہوں نے غالباً دیکھ لیا تھا کہ حسرت کے دماغ میں' قومی سیاست کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ کالج کو خیرباد کہنے یا خیرباد کہنے پر مجبور ہونے سے ایک سال پہلے تک پرنسپل مارلین کے ساتھ حسرت کے تعلقات بظاہر اس حد تک شگفتہ تھے کہ اپنی اکثر نظموں میں انھوں نے مارلین کا مدحیہ انداز میں نام لیا تھا، اور وہ نظمیں یونین کے جلسوں میں سنائی بھی تھیں۔ حسرت جب علی گڑھ پہنچے تو کالج کے پرنسپل مسٹر بیک تھے۔ چند ہی مہینوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ مارلین نے لی۔ اس کے بعد ہی یونین کے جلسے میں حسرت نے ایک طویل نظم سنائی، جس کے ایک بند کا آخری شعر یہ ہے:

بیک کے مرجانے سے ویران جلسہ ہو گیا
خاک میں ارمان ملے، خونِ تمنا ہو گیا

اس کے آگے کے بند کے تین اشعار یہ ہیں:

ہم تو سمجھے تھے کہ جلسہ اپنا ویراں ہو گیا
خوبیِ قسمت سے لیکن لطفِ یزداں ہو گیا
افسرِ اعلا ہوئے مارلینِ ذی علم و شان
سن کے یہ جامے سے باہر ہر مسلماں ہو گیا
آپ کے اسلام پر احسان سارے دیکھ کر
ہر مسلماں خود بہ خود ممنونِ احساں ہو گیا[17]

پھر کالج چھوڑنے سے کچھ ہی قبل ۱۹۰۳ء میں حسرت نے ایک نظم یونین کے جلسے میں سنائی، جس کا ایک شعر یہ ہے:

پھیر لی پیرِ مغاں نے ہم سے گر چشمِ کرم
ہم کو ہے کافی نگاہِ فیض بخشِ مارلین[18]

لیکن نگاہِ فیض بخش مارلین' کو پھرتے دیر نہیں لگی۔ اگلے ہی سال ۱۹۰۳ء کے اوائل میں انجمن اردوئے معلی کے ایک مشاعرے نے اس کے موثر مظاہرے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس انجمن کے بانی تو حسرت کے ہم عصر دوست سجاد حیدر یلدرم تھے، اور وہی اس کے پہلے سکریٹری بھی تھے۔ یلدرم کے بعد ۱۹۰۲ء میں' یہ عہدہ حسرت کی طرف منتقل ہوا۔[19] ان کا "زمانۂ طالب علمی جب ختم ہونے کو آیا تو ایک عظیم الشان مشاعرے کی تجویز قرار پائی ... سپہرِ نظم کے آفتاب و مہتاب یعنی مجروح اور تسلیم کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ستاروں نے بھی اپنا کمال دکھلایا۔ مگر چھوٹے ستارے اپنی حرکت میں کہیں کہیں تہذیب یا مغربی تہذیب کے دائرے سے باہر ہو گئے۔"[20]

اس مشاعرے میں حصہ لینے والوں میں امیر مینائی کے ایک شاگرد گستاخ رام پوری بھی تھے" جن کی شوخ نگاری کافی شہرت پکڑ چکی تھی۔ علی گڑھ میں جیلر کے عہدے پر مامور تھے ... طرحی غزل میں گستاخ نے ایک مطلع سنایا:

یہ مرض گستاخ کیا تجھ کو پیدا ہو گیا
جس کی صورت اچھی دیکھی، شیدا ہو گیا

" پیٹھ پیچھے بُرائی کرنے والوں نے، جن کو حسرت کی آزاد اور مستغنی طبیعت سے روزِ اول ہی سے اختلاف تھا، مارلین سے جا کے کہہ دیا کہ مشاعرے میں تہذیب سے گرے ہوئے اور اخلاق کو بگاڑنے والے اشعار پڑھے گئے، اور مثال کے طور پر گستاخ رام پوری کا وہ شعر پیش کیا' جو اوپر حوالۂ قلم ہو چکا ہے۔ اس اعتراض کرنے والے فرقے کے امام محمد علی مرحوم تھے، جو اس وقت حال ہی میں ولایت سے واپس آئے تھے اور نہایت خالص 'مسٹر محمد علی' تھے۔ ان لوگوں نے مشاعرے کو نہ جانے کس روشنی میں پیش کیا اور گستاخ رام پوری بےچارے کے شعر کی خدا معلوم کیا تشریح کی کہ مارلین آگ بگولا ہو گیا۔"[21]

چناں چہ اگلے روز کلاس ختم ہونے کے بعد

---

[15] ہارون خاں شیروانی: مذکرہ: ص ۱۱۲

[16] رابعہ بیگم: مذکرہ: ص ۹۸

[17] محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین (علی گڑھ): فروری ۱۹۰۰ء۔ بحوالہ احمر لاری: حسرت موہانی۔ حیات و کارنامے: ص ۴۰۶

[18] ایضاً: جنوری ۱۹۰۲ء: بہ حوالہ احمر لاری ص ۴۰۱

[19] محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین: جون ۱۹۰۲ء: بہ حوالہ احمر لاری: ص ۳۷

[20] خانی خاں: مذکرہ: ص ۱۲-۲۹۱

[21] مجنوں گورکھپوری: حسرت موہانی: اردوادب۔ حسرت نمبر: ص ۸۰

مارلیسن "غریب فضل الحسن کو پکڑے رواں دواں دفتر کی طرف لے گئے۔ یہاں سب لوگ حیرت کے عالم میں دیکھا کیے کہ الٰہی ماجرا کیا ہے! اتنے میں سیتیر عزت آیا:

"کیا اخلاق کے دو معیار بھی ہوتے ہیں؟"

سہمی اور لڑکھڑائی آواز میں جواب ملا:

"جی ہاں! ہم لوگوں کا معیار آپ سے قطعی مختلف ہے۔"

مسٹر مارلیسن جھنجھلا کر بولے:

"یہ سب بکواس ہے۔"[11]

اس کے بعد ہی مارلیسن نے کالج کے معتمدین کا ایک خاص اجلاس طلب کیا اور اس میں یہ تجویز پیش کی کہ حسرت کو کالج سے نکال دیا جائے۔ اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مارلیسن کی رائے سے اختلاف کرتا۔ لیکن حسرت کی شخصیت کا رعب چوں کہ سب پر چھا چکا تھا، یہاں تک کہ خود محسن الملک ان کی قابلیت اور فضیلت کے معترف تھے، اس لیے اس تجویز میں اتنی ترمیم کر دی گئی کہ حسرت کو کالج سے تو نکال دیا جائے، لیکن امتحان میں شریک ہونے سے نہ روکا جائے۔[12] کالج کے مقامی ٹرسٹیوں کی ہمدردانہ مداخلت نے مارلیسن کی خواہش کے برعکس حسرت کو بالآخر سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے بنا دیا۔ لیکن ان کے نام کے ساتھ اس ڈگری کی صفت کا اضافہ نہ بھی ہوتا تو ان کی اس زندگی پر کوئی اثر نہ پڑتا جو وہ جلد ہی شروع کرنے والے تھے۔

۱۹۰۳ء میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو حسرت نے ایل۔ایل۔بی میں داخلہ لیا۔ ان کے اس اقدام سے یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اس وقت تک انھوں نے اپنے مستقبل کی قطعی راہ متعین نہیں کی تھی۔ لیکن حالات کی روش نے جلد ہی انھیں اس ڈگر پر ڈال دیا جس پر وہ زندگی بھر چلتے رہے۔ ایل۔ایل۔بی میں داخلہ لینے کے بعد "وظیفۂ قانون کے لیے مولانا نے درخواست دی، مسٹر مارلیسن نے نہ دیا۔ بورڈنگ ہاؤس میں بدستور رہنے کی اجازت چاہی، اجازت نہ ملی۔ مایوسی و افسردگی کا اس کے سوا کیا علاج تھا کہ شہر میں سکونت اختیار کرکے ... برائے نام قانون کے سبقوں میں حاضر ہو جایا کریں۔[13] لیکن مارلیسن کی معاندانہ روش کو دیکھ کر حسرت نے "برائے نام قانون کے سبقوں میں حاضری" کا سلسلہ بھی ختم کرکے اپنی کتابِ زندگی کے اس باب کو با حسرت و یاس بند کر دیا، جو ۱۸۹۸ء میں ایم۔اے۔او کالج میں داخلے کے ساتھ شروع ہوا تھا۔

اب حسرت کے سامنے عملی زندگی کا لق و دق میدان تھا۔ جسے خداوندانِ کالج سے ان کے تعلقات نے ان کے لیے بے برگ و گیاہ بنا دیا تھا۔ اس دور میں علی گڑھ کالج کے نوجوانوں کے جذبۂ وفاداری کی حکومت پر کچھ ایسی دھاک بیٹھی تھی کہ کالج کے ہر فارغ التحصیل طالب علم کو، پرنسپل کے اشارے پر، تعلیمی و سماجی حیثیت کے مطابق، پولیس، فوج اور سول محکموں میں بہ آسانی ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ حسرت کے لیے بھی ایسے مواقع پیدا ہو سکتے تھے مگر یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ اپنے مزاج اور اپنی روش میں وہ تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر لیتے۔ لیکن ایسا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ قدرت نے ان کے مزاج کا جو سانچہ بنایا تھا، اسے کالج کی زندگی کے تجربات کی گرمی نے تپا کر اس درجہ پختہ کر دیا تھا کہ اب اس کا بدلنا محال تھا۔ ان کے عزم کا کچھ اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے:

جان کو محوِ غم بنا، دل کو وفا شعار کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر
فرقتِ روزہ کو عشرتِ جاوداں شمار
فکرِ معاش سے گزر، حوصلۂ معاد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیِ ضمیر پا، عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت، یہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پہ نہ اعتماد کر
غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر، کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر، اعتماد کر
اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

مندرجہ بالا اشعار پکار پکار کر اعلان کر رہے ہیں کہ حسرت نے ہندوستانی سیاست کے دشتِ پُرخار میں قدم رکھنے کا، یا دوسرے الفاظ میں 'نجاتِ ہند' کے لیے برطانوی حکومت سے لوہا لینے کا مصمم عزم کر لیا تھا۔ اور اس کے حصول کی کوششوں کے لیے علی گڑھ ہی کو انھوں نے اپنا مرکز بنایا، جو اس دور میں برطانیہ پرستی کا بڑا مستحکم گڑھ بن گیا تھا۔ علی گڑھ کے انتخاب کی پشت پر جو اسباب بھی کارفرما رہے ہوں گے ان کا ہمیں علم نہیں ہے، لیکن اس بات کا ہمیں علم ہے کہ یہ تھا بڑی ہمت کا کام۔

حصولِ مقصد کے لیے حسرت نے صحافت کو وسیلہ بنایا۔ تعلیمی زندگی کی طرف سے یکسو ہوتے ہی انھوں نے ایک ماہنامے کا علی گڑھ ہی سے اجرا کر دیا۔ اس کا نام اردوئے معلیٰ تھا اور اس کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ رسالے کا نام اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہے کہ انجمن اردوئے معلیٰ کی سکریٹری شپ ہی سے حسرت کی تعلیمی زندگی کا خاتمہ ہوا تھا، اب اڈیٹر اردوئے معلیٰ کی حیثیت سے انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔

---

[11] خان خاناں: تذکرہ:
[12] مجنوں گورکھپوری: تذکرہ: ۱۰۱

حسرت موہانی

مشاہداتِ زنداں

اردوئے معلیٰ اپنی نوعیت کا پہلا ماہوار رسالہ تھا۔ اور یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ سنجیدہ اردو داں طبقہ کو اس نے جلد ہی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اخبارات و رسائل کے اغراض و مقاصد کی فہرست اس دور میں آج کے مقابلے میں طویل تر ہوا کرتی تھی۔ لیکن حسرت نے روشِ عام کی تقلید ضروری نہ سمجھی۔ انھوں نے اردوئے معلیٰ کے پہلے شمارے میں لکھا کہ "اس رسالے کے اجرا کا مقصد صرف ایک ہے — اصلاحِ مذاق"۔ اس واحد مقصد کی تشریح سے بھی حسرت نے غالباً ارادی طور پر، گریز کیا تھا۔ لیکن اس امر کے آشکارا ہونے میں بہت دیر نہیں لگی کہ اردوئے معلیٰ کا مقصد "اصلاحِ مذاقِ" سیاست۔ دوسرے، اور واضح تر الفاظ میں، اس رسالے کا نصب العین یہ تھا کہ مسلمانوں کے اس مذاقِ سیاست کو یکسر بدل دیا جائے، جسے انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں، سرسید مرحوم نے بڑی محنت و جانفشانی سے ہندستانی مسلمانوں کے بالائی اور بالائی متوسط طبقے کے سیاسی مزاج کا خاصّہ بنا دیا تھا۔ اردوئے معلیٰ کے اجرا کے دوسرے ہی سال حسرت نے لکھا:

> "ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید اپنے زمانے میں قوم کے مسلّم رہنما تھے۔ اور اس وقت مسلمانوں کے حق میں جو کچھ انھوں نے کیا بہتر کیا...... لیکن ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے، جو سرسید کے وقت میں تھی؟"

اردوئے معلیٰ کے قارئین کے ذہن میں اس سیدھے سادے سوال کا جو بھی جواب آیا ہو، لیکن خود حسرت کا جہاں تک تعلق ہے انھوں نے قلم سے زیادہ عمل سے اس کا جواب دیا۔ سرسید نے اپنے زمانے میں سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا تھا اور کانگرس میں شرکت سے انھیں باز رکھنے کی جدوجہد میں سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ حسرت نے سیاست ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اپنے ساتھ اردوئے معلیٰ کو بھی اس حد تک کانگرس کے رنگ میں رنگ لیا کہ وہ کبھی کانگرس کا آرگن معلوم ہونے لگا۔ اس کے اوراق میں کانگرس کی پالیسیوں کی حمایت میں مقالات اور ادارتی نوٹ ہی نہیں شائع ہوئے، اس کے سالانہ اجلاسوں کی کارروائیوں کے ترجمے بھی اردوئے معلیٰ کے ضخیم ضمیموں کی شکل میں چھاپے گئے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب برطانوی ڈپلومیسی نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی درمیانی خلیج کو وسیع تر کرنے کے لیے بنگال کے صوبے کو 'ہندو بنگال' اور 'مسلم بنگال' میں تقسیم کیا۔ (۱۹۰۵)۔ اسی نوزائیدہ مسلم صوبے کی راجدھانی ڈھاکہ میں اسی سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بڑے کروفر سے منعقد ہوا، اور اسی اجلاس کی کوکھ سے مسلم لیگ نے جنم لیا۔ میزبانی کے فرائض نواب سلیم اللہ نے انجام دیئے تھے۔ جنھوں نے تقسیم بنگالہ کو مسلمانوں کی بہت بڑی فتح قرار دیا تھا۔ کانفرنس کے اس اجلاس میں شریک ہونے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ نوابوں، تعلقہ داروں اور ان کے خطاب یافتہ متوسلین کے علاوہ بہت سے ان نوواردانِ سیاست کے نام بھی نظر آتے ہیں، جو جلد ہی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں، ممتاز مقام حاصل کرنے والے تھے۔ اس فہرست میں کچھ ایسے نام بھی ملتے ہیں جو جلد ہی مسلم لیگ سے بیزار ہوئے، اور کانگرس میں شمولیت اختیار کی۔ اور ملک کی قومی زندگی میں نمایاں ترین مقام حاصل کیا۔ ان میں کچھ تو انڈین نیشنل کانگرس کے صدر بھی بنے۔

ڈھاکہ کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کی فہرست میں جن مسلمانوں کے نام نظر نہیں آتے ان میں قابلِ ذکر دو ہی ہیں — حسرت موہانی اور محمد علی جناح۔ ملکی سیاست میں مسلمانوں کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے یہ دونوں خلاف تھے۔ اس لیے یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ اس وقت مسلم لیگ میں ان کو کوئی کشش محسوس نہ ہوئی اور وہ کانگرس ہی سے وابستہ رہے۔ یہ بھی دلچسپ اور قابلِ ذکر ہے کہ اس 'قرب' کے باوصف دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے دور ہی دور رہے۔ یہاں تک کہ آخری عمر میں جب ان دونوں نے مسلم لیگ کو اپنایا تو اس وقت بھی یہ دوری برقرار رہی۔

کانگرس میں حسرت اور جناح کے ورود سے پہلے ہی — بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں، کانگرس غیر محسوس طور پر انتہا پسند اور اعتدال پسند گروہوں میں بٹنے لگی تھی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا دونوں گروہوں میں امتیاز کے خطوط بھی واضح تر ہوتے گئے۔ انتہا پسندوں کے لیڈر تلک تھے، جنھیں حسرت نے طالب علمی ہی کے دور میں اپنا 'گرو' بنا لیا تھا۔ اعتدال پسندوں کی قیادت گوکھلے کے ہاتھ میں تھی، جن کو جناح نے اپنے لیے نمونہ بنایا تھا۔

تقسیم بنگالہ کے بعد ہندستانی سیاست ایک

عظیم طوفان سے دوچار ہوئی۔ اس تقسیم کے خلاف بنگالیوں نے، جن میں مسلمان بھی شامل تھے، ملک گیر جدوجہد شروع کی۔ اس سے ایک طرف سودیشی کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا، جو پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ دوسری طرف بنگالیوں کی جدوجہد نے پرتشدد شورش کی شکل اختیار کرلی۔ اور بموں نیز آتشیں اسلحوں کے استعمال تک کی نوبت آگئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کانگرس کے معتدل اور انتہا پسند گروہوں کے اختلافات نقطۂ عروج پر پہنچے۔ بالآخر ۱۹۰۷ء کی سورت کانگرس نے انتہا پسندوں کے حق میں فیصلہ کردیا اور وہ کانگرس پر چھاگئے۔

تقسیم بنگالہ کے جلو میں پیدا ہونے والے پرتشدد مظاہروں نے، نیز کانگرس پر انتہا پسندوں کے غلبے نے برطانوی حکومت کے اوسان اس حد تک خطا کردیئے کہ اس نے سخت گیری کی پالیسی اختیار کرکے دارو گیر کا سلسلہ شروع کیا، جس کی زد میں تلک بھی آئے اور حسرت بھی۔ دونوں کو باغیانہ مضامین لکھنے اور شائع کرنے کا مجرم قرار دے کر بغاوت کی دفعات میں ماخوذ کیا گیا۔ حسرت ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو علی گڑھ میں گرفتار ہوئے اور اس کے دوسرے دن ۲۴ جون کو تلک بمبئی میں گرفتار اور سزایاب ہوئے یہ بھی قابل ذکر ہے کہ تلک کو پیروی کے لیے محمد علی جناح جیسا نامور بیرسٹر اور دوسرے وکلا نصیب ہوئے حسرت نے خود اپنی وکالت کی۔ اس کے باوجود دونوں کی سزاؤں میں بہت فرق تھا۔ تلک کو چھ سال کے لیے کالے پانی کی سزا ملی اور حسرت کے حصے میں دو سال کی قید سخت کی سزا آئی اور پانچ سو روپے کا جرمانہ۔ اور پھر یہ سزا بھی سال ہی بھر کی رہ گئی لیکن یہ ایک سال کس قیامت کا تھا، اس کا اندازہ حسرت کے "مشاہدات زنداں" سے ہوتا ہے جو رسالہ اردوئے معلیٰ کے دوبارہ اجرا کے بعد اس میں دسمبر ۱۹۰۹ء سے جنوری ۱۹۱۱ء تک بالاقساط شائع ہوا تھا۔ حسرت کے مزاج کو خصوصاً سیاسی مزاج کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اسی کے پیش نظر اس طویل مقالے کے اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں: (ع ص)

جس شخص نے کبھی قیدخانے کی صورت نہ دیکھی ہو وہ وہاں کے حالات سے کسی طرح آگاہ ہو ہی نہیں سکتا لیکن ہمارا یہ دعوی ہے کہ جو لوگ جیل کی سیر بطور وزیٹر کیا کرتے ہیں وہ بھی کماحقہ وہاں کے اندرونی حالات سے واقف نہیں ہوسکتے کس لئے کہ ملازمان جیل کی سختیاں، گھڑکیاں اور گالیاں، غذائے زنداں کی حد سے زائد ابتر حالت، حاکمان جیل کے ظلم اور بے انصافیاں ان سب کی اصلی کیفیت قیدیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی۔

یادش بخیر لالا لال چند فلک نے آخر ۱۹۰۸ء میں بزمانۂ سورت کانگرس کچھ حالات زندان لاہور کے سنائے تھے۔ لیکن جیل کی حقیقت راقم کے ذہن نشین صرف اسی وقت ہوئی جب کہ ۲۳ جون ۸ء کو دفعتاً بہ علت سڈیشن (بغاوت) داخل حوالات ہونا پڑا۔

داخلہ جیل کو دنیا سے قطع تعلق کے برابر نہیں تو اس سے کچھ ہی کم سمجھنا چاہیے۔ ارباب ہوش کو اس سے موت کا سبق حاصل ہوسکتا ہے جس طرح سے کہ اجل انسان کو تمام دنیاوی جھگڑوں سے چھڑا کر آناً فاناً ایک ایسے عالم میں پہنچا دیتی ہے جس کا کسی کو علم نہیں، اسی طرح سے مقدمہ سڈیشن میں گرفتار ہونے والا اپنے تمام مشاغل اور کار و بار سے دفعتاً علاحدہ ہوکر ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں کی آب و ہوا، طریق بود و ماند، طرز رفتار و گفتار غرض کہ ہر چیز نرالی نظر آتی ہے۔ فرق صرف اس قدر سمجھ لیجئے کہ موت کے بعد اعزا و اقربا سے دائمی جدائی ہوجاتی ہے لیکن یہاں آئندہ کے لئے امید باقی رہنے کے علاوہ اختتام مقدمہ تک کبھی کبھی ان سے دور کی ملاقات بھی ہوجایا کرتی ہے۔

گرفتاری کے وقت راقم حروف کی شیرخوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدۂ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ لیکن ان کی ذات سے اس نازک وقت میں بربنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا خود پریشان ہونے یا مجھ کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کارپردازان زنداں متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہ امر حق کی پیروی کے باعث یوں ہی قوی تھا، لیکن ان کی یہ تحریر کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے اُسے مردانہ وار برداشت کرو، میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوالیا تھا، جن کے ہمراہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتے آیا کیں، اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ فالحمد للہ۔ ختم مقدمے تک اخبار دیکھنے کی اجازت مجسٹریٹ علی گڑھ سے مل گئی تھی، اس لئے جن اخباروں کی نسبت میری پسند کا انھیں علم تھا وہ روزانہ بھیج دیا کرتی تھیں۔

دو ہی روز کے بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہوگئیں۔ مسٹر تلک کے ڈیفنس ایڈریس کو پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوتی تھی اور مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایڈریس کی سماعت کے بعد اگر جج انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک ضرور بری ہوجائیں گے، لیکن جسٹس داور کے فیصلے نے ان ساری امیدوں کا خون کردیا۔ اسی کبیدگی خاطر کے دوران میں ایک رباعی ذہن میں آئی تھی، وہ نذر ناظرین ہے۔

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور
کیا خاک انھیں دادگری کا ہو شعور
انصاف کے دشمنوں کا داور ہے لقب
"برعکس نہند نام زنگی کافور"

(جلد ۱: نمبر ۱: جنوری ۱۹۱۰ء: ص ۹-۱۰)

تقریباً چالیس روز کی کشمکش اور بے کار طوالت کے بعد آخرکار مقدمے کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے یعنی ۴ اگست ۱۹۰۸ء سے فیصلہ

سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک کرتا ٹوپی پہننے کے لئے ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا ایک چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔

ان چند چیزوں کے سوا قیدیوں کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ابتدا میں سامان، بود و ماند کی اس تقلیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی لیکن بہت جلد طبیعت نے انھیں کے استعمال پر قانع ہوا۔ ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی کے ساتھ فراہم ہو سکتی ہیں کہ بظاہر ان کے لئے انسان کو جبر و ستم یا مکر و فریب کے وسایل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی و غلامی تک کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جانا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔ زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کے مناسب حال تھی۔ البتہ ابتدا میں بحالت نیم برہنگی فریضۂ نماز کے ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنا دیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت "چکی" سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا اور بمصداق "بر سرِ اولادِ آدم ہر چہ آید بگذرد" اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا۔ چنانچہ جب ۱۳ اگست کو دفعتاً تبادلۂ الٰہ آباد کی خبر معلوم ہوئی تو لوگوں کے اس گمان کو اس بنا پر اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اس جیل میں گورنمنٹ برانچ پریس اور جیل پریس کی موجودگی سے عام طور پر یہی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ قیدیوں کا وہاں بھیجا جانا اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان سے لکھنے پڑھنے ہی کی کوئی خدمت لی جائے گی۔ لیکن راقم کو اہلِ فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے کسی رعایت کی امید نہ تھی۔ چنانچہ بعد میں ثابت ہوا کہ میرا خیال بالکل صحیح تھا اور الٰہ آباد جیل میں صرف یہی نہیں ہوا کہ بجائے کارِ تحریر راقم کو چکی ہی کی خدمت سپرد ہوئی بلکہ قید کی تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا۔ حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔

(جلد ۱۱: نمبر ۳: مارچ ۱۹۱۰ء: ص ۸، ۹)

روانگی الٰہ آباد کے لئے علی گڑھ جیل سے اسٹیشن تک دو پولیس مینوں کے ہمراہ پابجولاں بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ روانگی ٹرین کا وقت قریب تھا لیکن سلاخ دار بیڑیوں کی سختی مانع رفتار تھی۔ علاوہ اس کے آسمان کو ہجوم ابر نے عنبریں اور زمین کو خفیف ترشح نے نم کر دیا تھا کچھ دور پاپیادہ چلنے کے بعد ہمراہی ملازمان پولیس نے حسب معمول از روئے قانون بیگار ایک اکا گرفتار کیا اور ہم سب اس پر سوار ہو کر اسٹیشن پہنچے۔ واضح ہو کہ گورنمنٹ نے ہمارے اخراجاتِ سفر کے لئے کرایۂ ریل کے سوا ایک پیسہ زائد نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں قیدیوں کی خوراک کے لئے ایک آنہ فی کس فی روز کے حساب سے جو رقم ملتی وہ بھی نہیں دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے چنوں کے سوا اور کچھ کھانے کو نہ ملا۔

اور کسی کو تو راقم حروف کی روانگی علی گڑھ سے اطلاع نہ تھی، البتہ ریلوے اسٹیشن کے ملازموں میں سے جو چند لوگ واقف حال تھے وہ گرد جمع ہو گئے اور افسوس کرتے رہے۔ تین بجے سہ پہر کو ٹرین علی گڑھ سے روانہ ہو کر قریب شام ٹونڈلے پہنچی، جہاں اتفاق سے انڈین ڈیلی ٹیلی گراف کا ایک پرچہ دستیاب ہو گیا دس بارہ روز سے چونکہ کوئی اخبار دیکھنے کو نہ ملا تھا اس لئے اس کا ایک ایک حرف بڑے شوق اور اضطراب کے ساتھ پڑھا۔ ٹرکی میں دستوری حکومت قائم ہونے کا حال معلوم کر کے مسرت بے اندازہ حاصل ہوئی۔ اس روز کے بعد سے پھر آخر مدت قید تک اور اخبار کی صورت تک نظر نہ آئی اور حق یہ ہے جیل میں یہی ایک تکلیف ایسی تھی جسے راقم نے سب سے زیادہ محسوس کیا۔

زمانۂ حوالات کے لئے ہوئے اخباروں، کتابوں اور کپڑوں کی ایک گٹھری بھی ہمراہ تھی۔ اثنائے راہ میں آخری بار دیوانِ حافظ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حافظ کی غزلیں اربابِ ذوق و محنت کے لئے ہر حالت میں سرمایۂ سرور ثابت ہوتی ہیں چنانچہ اس فقیر کے قلبِ مضطر نے بھی باوجود بے اطمینانی ان سے بہت کچھ تسکین حاصل کی، ایک غزل نے خصوصیت کے ساتھ دل پر اثر کیا۔ اس قدر کہ راقم حروف نے اسے زبانی یاد کر لیا اور دورانِ قید میں بہ حالت تنہائی بارہا اسے دہرایا اور ہر بار نیا لطف پایا۔

خیز تا از درِ مے خانہ کشادے طلبیم
بر درِ دوست نشینیم و مرادے طلبیم
لذتِ داغِ غمت بر دلِ ما باد حرام
اگر از جورِ غمِ عشق تو دادے طلبیم
زادِ راہِ حرمِ دوست نداریم مگر
بگدائی ز درِ مے کدہ زادے طلبیم
چوں غمت را نتواں یافت مگر در دلِ شاہ
ما بامیدِ غمت خاطرِ شادے طلبیم
بر درِ مدرسہ تا چند نشینی حافظ
خیز تا از درِ مے خانہ کشادے طلبیم

ٹونڈلے میں چند نوجوان لوگوں کو شاید راقم کا حال معلوم ہو گیا تھا کیوں کہ جب ٹرین وہاں سے چلی تو انھوں نے پلیٹ فارم کے آخری حصے کے قریب جمع ہو کر بڑے خلوص کے ساتھ باچشم نم سلام کیا۔

کانپور میں ایک صاحب نے آ کر دریافت کیا کہ غالباً آپ اردوئے معلی کے ایڈیٹر حسرت موہانی ہیں اور جواب اثبات میں پا کر کچھ دیر ہمدردانہ باتیں کرتے رہے انھیں بھی الٰہ آباد جانا تھا اس لئے راستے میں ان سے کئی بار ملنا ہوا۔

والد مرحوم کی نسبت مجھ کو معلوم تھا کہ وہ اپیل کی غرض سے الٰہ آباد ہی میں ہوں گے اس لئے میں نے انھیں صاحب کے ذریعے سے اپنے تبادلۂ الٰہ آباد کی اطلاع اور سنٹرل جیل میں مل جانے کی درخواست کر دی تھی والد مرحوم کے جائے قیام سے مجھ کو آگاہی نہ تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے انھیں یہ نوشتہ،

تلاش کر کے میرا پیام اسی روز پہنچا دیا۔ کیوں کہ دو ہی چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد مرحوم نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی تھی لیکن افسوس کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور نہیں کیا اور وہ ناکام واپس آئے۔ مجھ کو اس واقعہ کا کسی قدر افسوس ہوا خصوصاً اس لئے کہ اپیل کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو رہی تھی اس کا کچھ بھی حال معلوم نہ ہو سکا۔

والد مرحوم کو میرے اس طرح پر گرفتار مصیبت ہونے کا بے انتہا قلق تھا، چنانچہ جیل سے واپس آنے پر اکثر اعزا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد ان کی صحت کبھی صحیح نہیں رہی اور آخر کار میری عدم موجودگی ہی میں انھوں نے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون جیل میں مجھ کو اس واقعے کی خبر تک نہیں ہوئی۔

الٰہ آباد کا سنٹرل جیل نینی میں ہے جہاں جانے کے لیے الٰہ آباد سے آگے نینی جنکشن پر اُترنا ہوتا ہے ہم لوگ صبح کو وہاں پہنچ کر آٹھ بجے کے قریب سنٹرل جیل میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ جیل کے کپڑے اتار لئے گئے اور کہا گیا کہ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے اس وقت تک کالے کپڑے پہنو جن کی کیفیت یہ تھی کہ ان سے زیادہ کثیف غلیظ اور بدبو دار کپڑوں کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آسکتا۔ لیکن قہر درویش وہی کپڑے پہننا پڑے۔

راقم حروف کی نگاہ دوربین نہیں ہے اس لئے پڑھنے لکھنے کے اوقات کو چھوڑ کر باقی ہر وقت عینک کی ضرورت رہتی ہے چنانچہ علی گڑھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بعد معائنہ عینک لگاتے رہنے کی اجازت دے دی تھی لیکن الٰہ آباد والوں نے اس کو کسی طرح گوارا نہ کیا اور عینک کو داخل دفتر کر کے راقم کی بے دست و پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں اور کاغذوں کو باستثنائے دیوان حافظ اپنے سامنے جلوا کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیجے جاؤ گے اور وہاں مار کر خاک کر دیئے جاؤ گے۔ اس خطاب پُر عتاب کا خاموشی کے سوا اور جواب ہی کیا تھا۔ جیلر صاحب نے غالباً یہ تقریر محض دھمکانے کی نیت سے کی ہوگی۔ کیوں کہ بعد میں ان سے مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیدیوں کی نسبت جیل خانے کی یہ مشہور مثل بالکل صحیح ہے کہ "مر جائیں تو مکھی اور نکل جائیں تو شیر" جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی قیدی جیل میں مر جائے تو وہاں اس واقعے کی اہمیت ایک مکھی کے مر جانے سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی لیکن اگر کوئی قیدی وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ واقعہ اسی قدر اہم شمار کیا جائے گا جتنا ایک شیر کا کٹہرے سے نکل جانا۔

حاضری دفتر کی زحمت سے نجات حاصل ہونے پر سفری بیڑیاں کٹوانے اور وزن درج رجسٹر کرانے کی غرض سے روز گزشتہ سے اس وقت تک کے آئے ہوئے نئے قیدیوں کی قطار میں بیٹھنا پڑا۔ سوامی شوانند سے اوّل اوّل اسی مقام پر ملاقات ہوئی کیوں کہ وہ بھی ایک جدید قیدی کی حیثیت سے کالے کپڑوں میں وہاں موجود تھے۔

پرانی تکلیف میں ہماری اور سوامی جی کی بارک کے سب برقنداز نیک پڑھے لکھے اور ہم لوگوں پر خاص کر مہربان تھے۔ ضلع فرخ آباد کے منشی جھمن لال قیدیوں کے کپڑے اور طوقِ گلو کی تختیوں پر نمبر ڈلانے کی خدمت پر متعین تھے، ضلع فیض آباد کے منشی نول بہاری لال غلہ گودام میں منشی تھے اور ضلع بریلی کے داروغہ نرائن داس "پرانی تکلیف" کے محرر تھے۔ برقندازوں کو پوشاک عام قیدیوں سے بہتر ملتی ہے۔ خوراک میں قاعدے کی رو سے تو کچھ فرق ہوتا نہیں، لیکن نسبتاً صاحب اختیار ہونے کے سبب سے وہ لوگ بطور خود بہتر خوراک کا انتظام کر سکتے ہیں۔ انہیں کاغذ پنسل رکھنے کی بھی اجازت ہے اور وہ بہ ضرورت احاطہ جیل کے اندر جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ سوامی جی کو داروغہ صاحب روز صبح گیہوں کا دلیا منگا دیتے تھے اور شام کو ہم دونوں کے لئے صاف روٹیاں اور ترکاری بہم پہنچاتے تھے۔ بلکہ سوامی جی اور داروغہ صاحب کی خاطر سے دوسری بارکوں کے برقنداز بھی جب کبھی خفیہ طور پر کوئی غیر معمولی چیز پکواتے تھے ہم لوگوں کا بھی حصہ لگایا جاتا تھا۔ سوامی جی کے ذمے بان بٹنے کا کام تھا اس لئے انھیں کہیں جانا نہ پڑتا تھا لیکن راقم حروف کو چکی پیسنے کی غرض سے پُرانے یا نئے احاطے میں جانا ضروری تھا۔ نئے احاطے میں دو بار قیدی چکی پیستے ہیں اس لئے وہاں عموماً آٹا موٹا پیسا جاتا ہے اور اُن سے کوئی تعرض بھی نہیں کرتا کیوں کہ وہ لوگ بیباک اور مار دھاڑ سے بالکل بے خوف ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف پُرانے احاطے میں یک بارہ قیدی معاملاتِ جیل سے ناواقف اور ملازموں کی زد و کوب و سب و شتم سے ہر وقت خائف رہتے ہیں اسی لئے ان سے آٹا بہت باریک پسوایا جاتا ہے۔

داروغہ صاحب نے پہلے روز راقم کو نئے احاطے کو بھجوایا۔ نئے احاطے کا وارڈ نیک تھا اس لئے چکی خانے برقنداز اور دفعدار نے راقم پر کوئی خاص سختی نہ کی بلکہ داروغہ کی سفارش سے رعایت ہی کا مستحق سمجھا لیکن دوسرے ہی روز نائب جیلر کا حکم آگیا کہ علی گڑھ والے قیدی کو پُرانے احاطے میں بھیج دو، اور وہ چکی پیسنے نئے احاطے میں نہ جانے پائے، قریب شام جب ہم نئے احاطے سے کام کر کے پُرانی تکلیف حسب معمول اپنی اپنی بارک میں بند ہونے کے لئے آئے تو داروغہ صاحب اور سوامی جی کو خاموش اور رنجیدہ پایا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی وقت مجھ کو پرانے احاطے میں جانا اور سوامی جی سے جدا ہونا ہوگا۔ داروغہ صاحب نے سوامی جی کی فرمائش سے راقم حروف کی آخری دعوت کے لئے کچھ پوریاں اور کچھ حلوا تیار کر رکھا تھا۔ سوامی جی نے مجھے علاحدہ لے جا کر خود کھلایا کھانے کے بعد ہم دونوں بغل گیر ہو کر بغایت افسوس و افسردگی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ ابتدائے مقدمہ اُردوئے معلیٰ سے اس وقت تک بہت سے افسوسناک مناظر پیش نظر ہوئے تھے لیکن مجھ کو خوب

یاد ہے کہ کسی موقع پر میرے آنسو نہیں نکلے۔ لیکن اس وقت سوامی جی کو مضطرو آب دیدہ دیکھ کر مجھے بھی ضبط نہ ہو سکا اور دیر تک باوجود ضبط آنکھیں پُرنم رہیں۔ پرانی تکلیف سے رخصت ہو کر پرانے احاطہ میں اس وقت پہنچا ہوا کہ بارکیں بند ہو رہی تھیں۔ نائب جیلر کے تحت میں وہ احاطہ تھا اس وقت پانچ نمبر کو بند کرا رہے تھے۔ دفعدار نے مجھے لے جا کر وہیں پیش کیا۔ لیکن کچھ مشورہ کرنے کے بعد یہ حکم ہوا کہ اس کو پانچ نمبر میں نہیں بلکہ سات نمبر کے پچھلے حصے میں بند کر دو پانچ نمبر کے برقنداز ضلع مظفر پور کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان تھے ان سے بعد میں مشورت کی حقیقت دریافت ہوئی کہ سات نمبر کا برقنداز چوں کہ تمام احاطے میں بدزبان اور سخت گیر مشہور تھا۔ اسی لئے میرا اسی نمبر میں رکھا جانا مناسب سمجھا گیا۔ سات نمبر کے قیدیوں کو پہلے ہی سے یہ حکم سنا دیا گیا تھا نہ نئے آنے ہوئے قیدی سے نہ کوئی ملے اور نہ بات کرے اور برقنداز کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس شخص کے دماغ کی گرمی نکال دو

پُرانا احاطہ تمام جیل میں تشدد اور سختی کے لئے بدنام تھا۔ پھر اس احاطہ میں سات نمبر کے برقنداز کی سختی و بدزبانی بھی مشہور عام تھی۔ ان سب پر طرہ مزید سختی اور نگرانی کے خفیہ احکام تھے۔ جن کو سُن سُن کر میرے لئے لوگ بہت متفکر تھے۔ لیکن بہ مصداق "دشمن اگر قوی است نگہباں قوی ترست" جن لوگوں سے بدی کی توقع تھی انھیں نے راقم حروف کے ساتھ نیکی اور مروت کا برتاؤ کیا۔

(جلد ۱۱: نمبر ۵: مئی ۱۹۱۰ء: ص ۱۲، ۱۴)

بارک نمبر ۲ کے تمام قیدیوں اور برقندازوں کو راقم کے متعلق پہلے ہی سے خفیہ احکام پہنچ چکے تھے کہ نئے قیدی سے نہ کوئی ملے نہ بات کرے۔ ذاکر برقنداز بارک نے جو اپنی سختی اور بدزبانی کے لئے تمام جیل میں بدنام تھا مزید احتیاط کی غرض سے راقم کا بستر عین اپنی نشست کے سامنے لگوایا تاکہ ہر وقت کافی نگرانی آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ لیکن بہ مصداق "اَلانسانُ حریصٌ علیٰ ما مُنِعَ"[1] اس روک ٹوک سے قیدیوں کے دل میں مجھ سے ملنے اور بات چیت کر کے دریافت حال کرنے کا اور بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ چناں چہ دن کو تو ذاکر کے خوف سے کوئی بول نہ سکتا تھا۔ لیکن رات کو جب سب سو جاتے تھے تو ضلع شاہجہان پور کے پنڈت تلک رام پہرے والے اپنے ہر گشت میں کچھ دیر میرے قریب ٹھہر کر ضرور معروف گفتگو ہوتے تھے۔ یہ اس درجہ ذہین تھے کہ تھوڑی دیر کی گفتگو میں انھوں نے کل معاملات کو بخوبی سمجھ لیا کہ اخبار کسے کہتے ہیں اور سڈیشن کس شے کا نام ہے۔ سدیشی اور بائیکاٹ سے وہ پہلے ہی واقف تھے۔ قومی تعلیم اور پنچایت کے اصول کو بھی انھوں نے بلا تکلیف انھوں نے معلوم کر لیا۔ اور دوسرے ہی تیسرے روز انھیں تلک مہاراج کے ذریعے سے تمام بارک والوں کو میرے معاملے کی خبر ہو گئی اور پھر بارک سے نکل کر بہت جلد تمام احاطے میں مشہور ہو گئی کیوں کہ ہماری بارک کے قیدی قریب قریب تمام کارخانوں میں کام کرنے کے لئے جاتے تھے۔ حسن اتفاق کا یہ بھی کرشمہ قابل التفات ہے کہ مسٹر تلک کے ایک پیرو کو جیل میں بھی ہر جگہ پہلے پہل تلک ہی کے ہم نام لوگوں سے سابقہ پڑا۔ پرانی تکلیف میں میرٹھ کے مشہور شورہ پشت قیدی تلک سنگھ نے اس کا خیر مقدم کیا اور پرانے احاطے میں ابتدائے کلام تلک رام سے ہوئی۔

سلسلہ بیان کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اصل میں برقنداز ذاکر کا مذکور تھا کہ انھیں راقم حروف کی سخت نگرانی کا حکم تھا اور عجب نہیں کہ در پردہ غیر معمولی سختی کرنے کا بھی اشارہ کیا گیا ہو۔ راقم ان تمام معاملات سے آگاہ تھا لیکن ان سے یک قلم بے پروا اکثر فکر و تصور کے دوسرے ہی عالم میں رہا کرتا تھا۔ چناں چہ ایک ہفتہ کے قریب اسی عنوان سے گزر گیا کہ نہ میں کسی سے بولا نہ ذاکر کو مجھ سے بات کرنے کی نوبت آئی۔ باندے کے کریم پہلوان کا بستر میرے بستر سے بالکل متصل ہوتا تھا وہ البتہ کبھی کبھی شب کو اپنی سرگزشت سنایا کرتے تھے کہ پولس نے انہیں بے قصور ڈاکو ثابت کر کے پانچ سال کے لئے قید کروا دیا۔ واللہ اعلم۔

غازی آباد کے ایک نوجوان عبد اللہ نے بھی ابتدا ہی سے میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور شرافت کا برتاؤ کیا کہ جب کبھی موقع ملتا تھا وہ میری دل دہی کی کوشش کرتے تھے حسن اتفاق دیکھئے کہ تھوڑے ہی دنوں میں رمضان المبارک کی آمد آمد سے مسلمان قیدیوں میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی ہے۔ اسلامی اخوت کا جیسا زبردست اثر میں نے اس موقع پر زندانِ فرنگ میں محسوس کیا اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ ہمارے بارک میں جتنے مسلمان قیدی تھے تقریباً ان سب نے روزہ رکھے اور سحر و افطار کے وقت یک جا ہو کر کھانا کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔ جس سے بے سرو سامانی کی حالت میں بھی اسلام کی شان مساوات و اخوت و سادگی کے ایک عجیب و غریب عالم میں نمودار ہوتی تھی جس کا اثر ہم سب کے حتیٰ کہ ذاکر کے دل نے بھی قبول کیا۔ چناں چہ ایک روز وہ مجھ سے بلا تقریب مخاطب ہو کر بولے کہ "بھائی صاحب۔ میری جانب سے سختی کا خوف آپ اپنے دل سے نکال دیجئے مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ میں کچھ نہ کروں گا بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو یا جو تکلیف ہو مجھ سے بے تکلف کہہ دیجئے گا۔"

ذاکر کے اس غیر معمولی برتاؤ نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو اس کو محض بناوٹ سمجھتے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا سچے دل سے کہا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بعد جب تک وہ بارک میں رہے روزانہ شام کو اپنے کارخانے سے افطار و سحر کے لئے مختلف قسم کی چیزیں نکلا تے تھے اور سب کے ساتھ کھاتے تھے لیکن آٹھ ہی دس دن کے بعد وہ دفعتاً بیمار ہو کر اسپتال چلے گئے اور پھر وہیں سے ہندوستان میں حکومت برطانیہ کے پنجاہ سالہ جبلی کی خوشی کے موقع پر رہا ہو گئے۔ جن لوگوں کی مشقت چکی خانہ میں تھی ان کو رمضان میں سب سے زیادہ دشواری پیش آئی کیوں کہ جلد جلد پانی پینا چکی پیسنے کے لوازمات میں داخل ہے۔ علاوہ بریں ہے کھائے پیئے ایک من گیہوں پیسنا یوں بھی کچھ آسان کام نہیں ہے لیکن اکثر مسلمان بہادروں نے باوجود ان تمام سختیوں کے روزہ ترک نہ کیا۔ رحمت الٰہی نے بھی ہم لوگوں کو فراموش نہیں کیا کیوں لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے کہ دن میں دس دس بیس بیس بار پانی پینے والے ایک بار بھی پانی پئے بغیر اتنی سخت محنت کس طرح سے کر لیتے تھے۔

[1] جس چیز سے انسان کو منع کیا جاتا ہے اسی کی اس کو خواہش ہوتی ہے۔ (ع ص)

الغرض ایک ایک دن کر کے ماہ رمضان[1] بھی ختم ہونے کو آیا اور آخری جمعہ کو ضلع بجنور کے میر مظفر حسین صاحب ذوق کی تحریک پر نماز ادا کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ راقم حروف نے زبانی خطبہ اور اسی وقت کے لکھے ہوئے چند الوداعی اشعار پڑھ کر نماز پڑھائی دو ہی چار روز کے بعد عید الفطر کی تقریب پیش آئی لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ الٰہ آباد سنٹرل جیل میں عید کی تعطیل کا دستور تھا لیکن اتفاق سے کنگ ایڈورڈ آنجہانی کا اعلان بابت معافی قید مجرمان بہ تقریب جشن پنجاہ سالہ حکومت برطانیہ اسی روز حکام جیل کو ملا جس نے عید کی خوشی کو دوبالا کرنے کے علاوہ تعطیل کو بھی لازمی کر دیا۔ جذبۂ امید کی خوشگواری اور فوری تاثیر کا جیسا دلچسپ سماں جیل خانوں میں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال غالباً کہیں اور نہ مل سکے گی جیل یا بہ زبانِ عوام جیل کی خفیہ سے خفیہ خبر یا افواہ طرفۃ العین میں تمام جیل میں مشہور ہو کر قیدیوں کے چہروں کو سرورِ امید سے منور کر دیتی ہے اور ہر شخص اپنی رہائی کے خیال سے کم از کم تھوڑی دیر کے لئے اپنے مصائب کو فراموش کر دیتا ہے۔

غازی آباد ضلع میرٹھ کے عبد اللہ کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس نیک دل نوجوان نے بہ خلوص کامل میرے انکار اور ممانعت کی مطلق پروا نہ کر کے بہ اصرار میری ایسی خدمت کی جس کا میں مدت العمر ممنون احسان رہوں گا۔ بلا ناغہ میرے کھانے پینے کے برتنوں کی صفائی، میرے بستر کا بارک سے باہر نکالنا اور پھر اندر لے جانا، چکی بنانے میں اپنا کام ختم کر کے میری مدد کو آنا اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ عید کے روز بھی معلوم نہیں کہاں سے چند لکڑیاں فراہم کر کے ایک گوشے میں چھپا کر میرے غسل کے لئے پانی گرم کیا اور کپڑے دھو کر صاف کر دیئے۔

عید کے روز تھوڑی دیر کے لئے تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت ملتی ہے کہ وہ جیل اسپتال میں جمع ہو کر نماز پڑھیں۔ چنانچہ اس روز بھی پرانی تکلیف اور نئے احاطے سے سب لوگ آئے تھے۔ لیکن ہمارے احاطے کے وارڈر نے اپنی معمولی سختی سے کام لے کر ہم لوگوں کو احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً ہم ۲۰-۳۰ لوگوں کو علاحدہ نماز پڑھنا پڑی۔ نماز کے بعد لوگوں کے اصرار سے راقم حروف نے مختصر سا وعظ بھی کہا، جس میں تمام فرائض اسلام کی عموماً اور فریضۂ صوم کی خوبیاں خصوصاً حاضرین کے گوش گزار کی گئی تھیں۔

نماز عید کے بعد سارا دن جیلی کے تذکروں میں صرف ہوا شاہ اڈورڈ ہفتم کا فرمان یہ تھا کہ "تمام قیدیوں کی قید یا معاف کی جائے یا اس میں تخفیف ہو" لیکن غالباً درمیانی لوگوں کی دراندازی کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ معاف تو کسی کی بھی قید نہ ہوئی، البتہ فی سال ایک ماہ کے حساب سے رہائی کل قیدیوں کے ٹکٹوں پر چڑھا دی گئی۔ گر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ تین ماہ کے بعد روزانہ دس بیس لوگوں کی جُبلیاں خارج ہونا شروع ہوئیں، جس سے شاہی اعلان کی صد درجہ سبکی ہوئی۔ حقیقت حال سے ناواقف قیدی بے گناہ بادشاہ کو علانیہ بُرا بھلا کہتے تھے کہ دے کر کسی چیز کا واپس لینا کم ظرف لوگوں کا شیوہ ہے، بادشاہوں کا طریقہ نہیں ہے۔

اس رعایت سے پولیٹیکل قیدیوں کی محرومی کا قصہ ہم پہلے ہی درج کر چکے ہیں مجھ کو بھی ایک روز مع ٹکٹ اپنے روبرو طلب کر کے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ "تم کو جبلی نہیں ملے گا" اور ۱۲ ماہ کی رہائی میرے ٹکٹ سے خارج کر دی۔ میں نے "عطائے تو بہ لقائے تو" کہہ کر خاموشی اختیار کی۔ یہ پینتالیس دن تو گویا چشم زدن میں گزر گئے لیکن اہل فرنگ کی اس تنگ دلی کا افسانہ ہمیشہ کے لئے یاد رہ گیا۔ ع

"برگردنِ او بماند و برما گزشت"

(جلد ۱۱: نمبر ۲: جون ۱۹۱۰: ص ۱۴-۱۸)

الٰہ آباد سنٹرل جیل میں چکی کی مشقت سب سے زیادہ سخت ہے کیوں کہ وہاں رام بانس یا ہاتھی چنگار کوٹنے کی مشقت موجود ہی نہیں ہے جو چکی سے بھی بدتر سمجھی جاتی ہے اور جس کی نسبت ہر جیل میں یہ شعر قیدیوں کی زبان زد ہے کہ:

جیل خانے کا گزارہ یہ کوئی کسی کا یار نہیں
رام بانس کی کڑی مشقت چکی سے انکار نہیں

راقم حروف کے حال پر حکام جیل کی یہ خاص عنایت تھی کہ تقریباً تمام مدت قید اسی مشقت میں بسر ہوئی۔ قاعدے کی رو سے فی قیدی ۱۵ سیر کے حساب سے دو قیدیوں کو ۳۰ سیر غلہ پیس کر لانا چاہیئے۔ الٰہ آباد میں ۳۰ سیر کے بجائے ۴۰ سیر پسواتے ہیں، جس کے عوض میں ہر سہ ماہی پر دو یا تین دن رہائی کے دیے جاتے ہیں بہ شرطے کہ اس عرصہ میں کوئی قصور ایسا نہ سرزد ہو جائے جس سے پیشی کی نوبت آ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ قیدی جب کوئی جیل کا جرم کرتا ہے تو اسے وارڈر سزا کے لئے سپرنٹنڈنٹ کے روبرو پیش کرتا ہے اسی کا اصطلاحی نام پیشی ہے جس کی عجیب و غریب وارداتیں تقریباً ہر روز چکی خانے میں پیش آتی رہتی تھیں۔ اگر چالیس سیر غلہ کا آٹا ٹھیک چالیس سیر سے چھٹانک آدھ پاؤ بھی کم ہو جائے تو پیشی۔ اگر آٹا ذرا بھی موٹا رہ جائے تو پیشی۔ اگر آٹے میں ذرا بھی مٹی یا پانی ملائے جانے کا شبہ ہو تو پیشی، مٹی یا پانی ملائے جانے کا معاملہ اس طور پر ہے کہ بعض قیدی کافی خوراک نہ پانے کے سبب سے مجبوراً کچا غلہ چبا جانے پر مجبور ہوتے ہیں اور بعد میں آٹا پورا کرنے کے لئے گیہوں میں مٹی اور جوار یا چاولوں میں پانی ملا دیتے ہیں۔ جو لوگ نہیں کھاتے انھیں بھی کچھ نہ کچھ ملانا ضرور پڑتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ آٹا پیسنے کے دوران میں کچھ تو چکی میں رہ جاتا ہے اور کچھ اڑ کر ہوا میں مل جاتا ہے کچھ پیسنے والوں کے بدن پر پسینے کے ساتھ جم جاتا ہے۔ داروغہ صاحب علانیہ فرماتے تھے کہ جو چاہو کرو ہم کو آٹا پورا دو ورنہ ہم پیشی کر دیں گے۔ چنانچہ چکی خانے کا برقنداز بھی ڈر کے مارے خود ہی قیدیوں کو مٹی چھپا کر لے آنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ ایک روز ایک قیدی کی برقنداز سے اس بنا پر حجت ہو گئی تھی کہ برقنداز نے اسے غلہ چرا کر نہ لے جانے دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیدی نے دفعدار کو بلایا

---

[1] یہ مسلسل غزل دیوانِ حسرت (حصہ اول) میں موجود ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں:-

الوداع اے ماہِ رمضاں الوداع
الوداع اے مونس جاں الوداع
اے نشانِ شانِ صبر و فقر و عشق
شاہدِ عشاقِ حیراں الوداع
تھی راحت تجھ سے تھی تکلیف قید
اے انیس اہلِ زنداں الوداع

(ع۔ ص)

ور کہا کہ برقنداز پانی لوتا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ سب سے پہلی چکی میری ہی تھی جس کے پاس ہی میرا ساتھی بقدر ضرورت یعنی قریب آدھ یا پون پاؤ کے پانی ملا رہا تھا۔ مجھ کو اس واقعہ کی خبر نہ تھی کیوں کہ عام طور پر میں روزانہ غلہ پیسنے کے بعد چکیوں کی جانب پشت ... جاکر زمین پر لیٹ رہا کرتا تھا اور آٹے کا جھاڑنا اور تھیلی میں بھرنا وغیرہ اپنے ساتھی ہی پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ ہنگامہ برپا ہونے پر میں نے بھی دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرا ساتھی گرفتار ہے۔ اس کے پاس یا میرے پاس کچھ پیسے دفعدار کو دینے کے لئے ہوتے تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔ لیکن چوں کہ ہم دونوں نادار تھے اس لئے پیشی ہوئی اور کچا غلہ کھا جانے کے الزام میں تین دن رہائی ضبط ہوگئی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مسکراہٹ سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں میری نسبت غلہ کھانے کا گمان نہیں ہے لیکن اصول جیل کے مطابق کسی ماتحت کے پیش کرنے پر سزا کا دینا لازمی تھا، ورنہ اس کی سبکی ہوتی۔ میرے متعلق پیشی کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ پہلا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ چکیاں عموماً اس قدر وزنی ہوتی ہیں کہ ایک شخص کو ان کے اوپر کا پاٹ اٹھانا بھی مشکل ہوتا ہے اس لئے دو شخص ایک چکی پر آمنے سامنے کھڑے ہو کر پیستے ہیں اور اگر برابر پیسے جائیں تو صبح چھ بجے سے لے کر سہ پہر تین بجے تک غلہ پس جاتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دونوں پیسنے والے برابر زور لگائیں میری نسبت وارڈر کو یہ گمان تھا کہ اس سے چکی نہ پس سکے گی۔ جب دوسرے دن برقنداز سے دریافت کرنے پر اس نے معلوم کیا کہ ہیں نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا تو اسے یقین نہ آیا اور برقنداز سے ایسی باتیں کیں جن سے اس نے اپنی سمجھ کے مطابق یہ نتیجہ نکالا کہ میری نسبت وارڈر کا منشا یہ ہے کہ اس کی پیشی ہو جائے۔ چناں چہ تیسرے دن اس نے مجھے سب سے خراب چکی دی اور میرے جوڑی دار کو سمجھا دیا کہ تم ڈھیل دے دینا انہیں ہم پیشی پر نہ بھیجیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دس سیر غلہ باقی رہ گیا، قاعدے کے مطابق ہم دونوں کی پیشی ہونا چاہئے تھی لیکن حسب قرار داد سابق صرف میری پیشی ہوئی اور دو دن کے لئے رات کو ہتھکڑیاں ڈالنے کی سزا تجویز ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ سے سب حال کہہ دوں، لیکن برقنداز کو بیٹی اتار کر زد و کوب پر آمادہ پاکر میں نے خاموشی اختیار کی اور معاملے کو خدا کے سپرد کیا۔

(جلد ۱۱: نمبر۷: جولائی ۱۹۱۰ء: ص ۱۶-۱۷)

صبح سے شام تک چکی پیسنا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لئے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لے کر آخر تک کوئی کتاب رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز میں جس شخص کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ہو، اسے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یک قلم عرصہ دراز کے لئے علاحدہ کردینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو خاص تاکید کردی تھی کہ کاغذ پنسل کتاب یا اخبار تک اس شخص کی کسی طرح دسترس نہ ہوسکے۔ اس خاص سختی کے سبب سے چکی پیسنے کے دوران میں جتنے شعر خیال میں آتے تھے انھیں اکثر کئی دن تک بہ کوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ چکی پیسنے والوں کی نگرانی میں ایک قیدی نمبردار کے سپرد ہوتی ہے راقم حروف چوں کہ سال بھر کے قریب چکی خانہ میں رہا اس لیے سیکڑوں قیدیوں اور متعدد نمبرداروں کے وہاں آنے اور تبدیل ہونے کا عجیب وغریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ متعدد نئے قیدیوں کو عموماً پہلے چکی ہی دی جاتی ہے اس لئے نئے آنے والوں سے سب سے پہلے ملاقات کا موقع چکی خانے والوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ نومبر ۱۹۰۸ء میں من جملہ دیگر نو وارد قیدیوں کے ایک اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ کے منیجر مسٹر ریفیل کے بیٹے بھی تھے، جنہوں نے اپنے مقدمے کا فیصلہ بہ ذریعہ جوری کرانے سے انکار کرکے ناوانستہ طور پر یوریشین ہونے کا حق کھو دیا تھا اور دیسی عیسائیوں کے زمرے میں بہ جبر شامل کر دیئے گئے تھے ایک عرصہ کے بعد ایک انگریزی داں شخص سے مل کر نہایت خوشی ہوئی، زیادہ تر مسرت کا باعث یہ تھا کہ مسٹر ریفیل کچھ کچھ اخباری دنیا کے حالات سے بھی آگاہی رکھتے تھے زمانہ حوالات میں بھی ان کو پائنیر وغیرہ پڑھنے کو مل جایا کرتا تھا کیوں کہ اس وقت تک ان کے ساتھ یوریشینوں ہی کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اور تو سب خبریں انھوں نے صحیح بتائیں، لیکن مسٹر تلک کی نسبت جو امید انھوں نے ظاہر کی تھی کہ وہ غالباً پریوی کونسل میں اپیل سے رہا ہو گئے ہوں گے، بعد میں غلط ثابت ہوئی۔ مسٹر تلک کی فرضی رہائی کا مژدہ سن کر راقم نے اپنے دلی مسرت کا اظہار ایک فی البدیہہ غزل کے ذریعے سے کیا تھا جس کا مطلع اس وقت تک یاد ہے۔

نسیم صبح گاہی یہ پیام جاں فزا لائی
تلک کو بیگناہی ان کی لندن سے چھڑا لائی

سوامی نند نے بھی ایک ہندی چیز اس موقع پر تصنیف کی تھی جس کا ایک ایک لفظ رنگ تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ خیر مسٹر ریفیل کو دو ہی چار روز چکی پیسنے کے بعد اس بلا سے نجات مل گئی اور وہ جیل پریس میں پروف ریڈری پر بھیج دیئے گئے۔ ایک مسٹر ریفیل ہی پر کیا موقوف ہے جتنے لوگ چکی خانے میں تھے، سب اپنے اپنے وقت پر یعنی کوئی ایک ہفتہ پندرہ روز کوئی ایک مہینہ اور کوئی حد درجہ تین مہینے رہ رہ کر دوسری آسان مشقتوں پر چلے گئے، حکام جیل کی خاص عنایت سے یہ فخر اس خاکسار ہی کو حاصل ہوا کہ تقریباً سارا زمانہ قید اسی ایک شغل میں گزارنا پڑا۔ جیل میں ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چکی پیسنے والوں کا معائنہ خاص اسی غرض سے ہوا کرتا ہے کہ جو قیدی وزن میں کم ہو گئے ہوں یا جن کو چکی پیستے کئی مہینے گزر چکے ہوں وہ کسی دوسرے آسان کام پر بھیج دیئے جائیں۔ راقم حروف کے زمانے میں تین چار بار ایسے معائنے ہوئے جن میں تقریباً تمام پرانے ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کر دی گئیں لیکن یہ کمترین جہاں تھا وہیں رہا۔ ایک بار جیلر نے خاص کر میرے لئے تبدیلی مشقت کی سفارش بھی کی اور سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کی غیر معمولی کمی سے بھی آگاہ کیا لیکن سپرنٹنڈنٹ کی قساوت قلب نے اس کی جانب بھی کچھ توجہ نہ کی اور میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔

جب کبھی گودام میں ضرورت سے زیادہ آٹا جمع ہو جاتا ہے تو دو ایک روز کے لئے چکی والے قیدی کسی دوسرے کام پر بھیج دیئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر انھیں کٹنگ سین پر کربی کاٹنے یا نبولے صاف کرنے کی خدمت ملتی ہے لوگ اس تبدیلی کو بہت پسند کرتے ہیں کیوں کہ اسی بہانے سے

کم از کم اپنے احاطے سے باہر نکلنے اور دن بھر کھلے میدان میں رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن راقم حروف اس عارضی لطف سے بھی محروم رہا۔ کیوں کہ جب کبھی ایسا موقع ہوتا تھا تو داروغہ مجھ کو باہر جانے والے گروہ سے الگ کر کے چکی خانے ہی میں بند کر دیتا تھا اور قہر درویش بجان درویش، اس روز اکیلے ہی چکی پیسنا پڑتی تھی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ داروغہ کی عدم موجودگی میں میں بھی اور لوگوں کے ساتھ احاطے سے باہر گیا۔ بنولے صاف کرنے کی مشین ہمارے احاطے سے کسی قدر فاصلے پر ایک ایسی جگہ نصب تھی جہاں چاروں جانب درختوں اور جھاڑیوں کی موجودگی سے نواح دیہات کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ قیدیوں نے اس موقع کی پوری قدر کی۔ یہاں تک کہ قیدی نمبردار نے بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی سختی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ قیدیوں کے دو گروہ کر دیئے گئے تھے جو باری باری سے بیلوں کی طرح مشین کو گھماتے تھے۔ ہر گروہ اپنے وقت فرصت کو کشتی لڑنے ہنسی مذاق یا راگ راگنی میں صرف کرتا تھا۔ ہمارے گروہ میں ضلع جھانسی کا ایک میراثی غوثو نام تھا۔ لوگوں کے اصرار سے اس نے اردو ہندی کی کئی چیزیں خوب گائیں۔ راقم حروف کی طبیعت کو چوں کہ موسیقی سے ایک فطری اُنس ہے اس لئے غوثو کی نغمہ سنجی نے دل پر قیامت کا اثر کیا۔ اس گانے کی تاثیر اس حسن اتفاق سے اور بھی زیادہ ہو گئی کہ ہندی غوث پاک محبوب سبحانی حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی شان میں تھی، جن کی غلامی پر اس فقیر کو ہزاروں ناز ہیں۔ طرفہ تر یہ کہ اس ٹھمری کے آخر میں تخلص راقم کے عزیز بزرگ مولوی سید فخر الحسن فطرت موہانی کا تھا۔ وہ ٹھمری یہ ہے:

سنسار تھارو نام جپے بگداد کے مورد کا تیا
(تیرا — بغداد)

نیہ کی آگ لگی تن ماں دن رین کہت دیا دیا
(محبت — دن رات)

کت جائے پیا پیری تیری سگری ہو بپت کی ین گھری
(کہاں — مصیبت)

گریب نواج اب تو موے سر سے دکھ کی گاگریا
(غریب نواز)

مہراج دیا کی ایک نجر فطرت کا سر توری چوکھٹ پہ
(نظر)

حسنین کا صدقا پار کرو منجدھار سے موری نا دریا
(صدقہ)

چکی خانے میں پسائی کا کام عموماً وقت مقررہ سے کچھ نہ کچھ پہلے ہی ختم ہو جایا کرتا تھا۔ اسی لئے داروغہ کے گنے تک کا وقت باہم قیدیوں کی بات چیت یا کبھی آلہا اودل کی رزمیہ نظم کے سننے میں صرف ہوتا تھا۔ راقم نے چوں کہ کبھی اس لاجواب ہندی ایپک کو غور سے نہ سُنا تھا اس لئے اس کی خوبیوں سے نا آشنائے محض تھا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ہندی زبان میں اس سے بہتر کوئی رزمیہ نظم اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس نظم کی خوبی اور عوام کی نظروں میں اس کی پسندیدگی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو گا کہ اس وقت ہمارے صوبے میں ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جنھیں یہ افسانہ از بر یاد ہے۔ ایک نینی ہی کے سنٹرل جیل میں دس بارہ قیدی جن میں دو مسلمان بھی تھے، اس داستان کے حافظ موجود تھے۔ ضلع کانپور کے ٹھاکر باسدیو سنگھ اور ضلع لکھنؤ کے پنڈت تلسی رام کی آلہا کو ہم لوگ روزانہ بڑے شوق اور انتہا درجے کی توجہ سے سُنا کرتے تھے۔

(جلد ۱۱ : نمبر ۸ : اگست ۱۹۱۰ء : ص ۸ - ۱۱)

راقم حروف کے چکی خانے میں داخل ہونے کے وقت دو برقنداز نگراں کار مقرر تھے۔ ایک میر مظفر حسین صاحب فوق بجنوری اور دوسرا ضلع باندا کا بندا اہیر۔ جن میں سے میر صاحب کو تو دو ہی تین روز میں صرف میری وجہ سے جیل پریس کی نگرانی سپرد ہو گئی، بندا سے البتہ بہت روز تک سابقہ رہا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے نائب جیلر کا اشارہ پا کر بلا وجہ میری پیشی کرا دی تھی، لیکن بعد میں اپنی غلطی پر نادم ہوئے۔ فی چکی دو قیدیوں کے حساب سے چکی خانے میں جتنے قیدیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ برقنداز اس تعداد سے ہمیشہ دو ایک آدمی زاید ضرور رکھتا ہے تاکہ اگر کوئی دفعتاً بیمار ہو جائے یا اور کوئی وجہ پیش آ جائے تو کام بند نہ رہے۔ ان زاید آدمیوں کی نسبت برقنداز کو اختیار حاصل رہتا ہے کہ ان سے کوئی کام نہ لے یا لے بھی تو محض برائے نام۔ مثلاً کسی کمزور قیدی کی مدد کر دینا یا کسی دیر میں کام ختم کرنے والے کا آٹا چھنوا دینا وغیرہ۔ اگر مخبری کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے زاید لوگوں کے زمرے میں داخل کر لینے سے غالباً بندا کو انکار نہ ہوتا۔ لیکن نائب جیلر کے خوف سے اس غریب کو کبھی میرے ساتھ رعایت کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور رمضان شریف کا پورا مہینہ مجھ کو چکی ہی پیستے گزرا۔ بندا اس مصیبت میں میرے ساتھ ہمدردی ضرور کرتا تھا، لیکن مخبروں کی مخبری اور نائب جیلر کی بے رحمی کے خیال سے بے چارہ بالکل مجبور تھا۔ بندا کے بعد امروہے کے منشی ایزد بخش برقنداز ہوئے۔ انہوں نے کچھ دنوں تک تو بندا ہی کی پیروی کی لیکن آخر کار اتنی رعایت کرنے لگے کہ جب کبھی موقع ہوتا تھا تو وہ مجھ سے کام نہ لیتے تھے۔ دسمبر کے آخری اور جنوری کے ابتدائی ہفتوں میں ان کی یہ رعایت مجھ کو بہت غنیمت معلوم ہوئی، کیوں کہ ایسی سخت سردی میں بالکل برہنہ تن ہو کر چکی پیسنے کے لئے دن بھر کھڑے رہنا کارے دارد کا مضمون تھا۔ ایزد بخش کے بعد رکسول (ضلع مظفر پور) کے منشی عبدالحق آئے۔ یہ صاحب حضرت فوق کی طرح شاعر تو نہ تھے تاہم کچھ نہ کچھ شوق شعر و شاعری سے ضرور رکھتے تھے ایک روز وہ اپنے ہمراہ متفرق اشعار و غزلیات کا ایک مجموعہ بھی لائے، جسے جیل پریس کے کسی خوش مذاق قیدی نے اپنے دل بہلانے کے لئے مرتب کیا تھا اپنا کام ختم کر چکنے کے بعد جب میں ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے وہ بیاض مجھے بھی دکھلائی، ایک عرصہ دراز کے بعد کتاب کی شکل دیکھ کر جتنی مسرت مجھے حاصل ہوئی اس کا اندازہ کوئی آزاد شخص ہرگز نہیں لگا سکتا، لیکن افسوس کہ اس واقعے کی اطلاع کسی نامعقول نے نائب جیلر کو بھی کر دی، چنانچہ اس نے دفعتاً کئی برقندازوں کے ہمراہ آ کر چکی خانے کا محاصرہ کر لیا اور فرداً فرداً ہر قیدی کو بالکل برہنہ کرا کر ان کی تلاشی لی مطلب تو اس کا مجھ پر الزام لگانا تھا مگر جب میرے پاس کچھ نہ نکلا تو سارا وبال غریب عبدالحق کے سر پر پڑا، انھوں نے بہت کچھ معذرت کی لیکن نائب جیلر کی فطری بے رحمی پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور اس نے دوسرے ہی دن سپرنٹنڈنٹ سے کہہ سُن کر ان کی برقندازی توڑ وا دی اور معمولی قیدی بنا کر آگرہ

کو چالان کر دیا۔

(جلد ۱۱: نمبر ۹: ستمبر ۱۹۱۰ء: ص ۹۔)

مجسٹریٹ علی گڑھ نے میرے مقدمے میں سزادہی کے سارے اختیار ختم کر دیئے تھے۔ یعنی دو سال قید سخت اور پانچسو روپے جرمانہ۔ زیادہ کا اگر انھیں اختیار ہوتا تو شاید اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ہائی کورٹ سے قید کی میعاد گھٹ کر دو سال سے ایک ہی سال رہ گئی لیکن جرمانہ بدستور قائم رہا۔ جس کے عوض میں چھ مہینے کی قید سخت ملا کر فی الجملہ ڈیڑھ برس کی سزا باقی رہی۔ حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے۔ جتنی سختی اس کے ساتھ چاہیں کریں۔ چنانچہ ابتدائے قید سے لے کر دس ماہ تک چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بنا پر تھا۔ اگر یہ میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ سال برابر مجھ کو چکی پیسنا پڑتی۔ لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے بھائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت سے زر جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو قلیل جائداد وراثتاً مجھ کو پہنچی تھی وہ بھی مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کر دی جاتی۔ اور سرکاری نیلام جس بے دردی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں لوگوں کے پیش نظر ہو چکا تھا کہ زر جرمانہ کے عوض میں اردوئے معلی کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپیوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ صرف ساٹھ روپے میں برباد کر دیا گیا۔

اہل حرفہ کے متعلق یہ قانون ہے کہ نیلام سے ان کے پیشے کے اوزار مستثنا سمجھے جاتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اخبار نویسوں، ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اس درجہ سختی کیوں روا رکھی جاتی ہے کہ ان کی نایاب اور قیمتی کتابیں ناقدردانوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کر دی جاتی ہیں۔ جرمانہ اسی قدر ہونا چاہئے جس قدر ملزم سے ادا ہو سکے۔ علی گڑھ میں ہر شخص آگاہ تھا اور اسی لئے غالباً مجسٹریٹ علی گڑھ بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ اڈیٹر اردوئے معلی ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس پر ۵۰۰ روپے جرمانہ کرنا اصول انصاف اور انسانیت کے کہاں تک موافق یا مخالف ہے؟ اس کا فیصلہ ہم ناظرین کے ذمے چھوڑتے ہیں۔

اس جرمانے کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلی کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا۔ جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے دواوین شعرا وغیرہ کے تھے۔ جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ ان سب کو پولس کے جاہل جوان تھیلوں میں بھر بھر کے اس طرح سے لے گئے جیسے کہ لوگ لکڑی کیا بھُس لے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو بہت دور تھا، کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری اس کا ذکر کرتے ہمارا دل دکھتا ہے اس لئے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ اس جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے۔

سلسلہ کلام کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اصل ذکر اس بات کا تھا کہ زر جرمانہ کے دفعتاً ادا ہو جانے سے قید کی میعاد ایک سال رہ گئی اور پوری مشقت کرنے والے قیدیوں کو فی ماہ تین روز کے حساب سے حکومت کی جانب سے جو رہائی ملتی ہے اسے بھی شامل کرنے کے بعد میری رہائی میں صرف ایک ماہ بلکہ کچھ اس سے بھی کم باقی رہ گیا۔ اب تو منتظمین جیل کے کان کھڑے ہوئے اور انھیں میرے ساتھ اپنے برتاؤ کی سختی کا بھی کچھ احساس ہونے لگا۔ چنانچہ ایک روز خلاف معمول شام کے وقت بارک بند کرنے کے موقع پر نائب جیلر نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کو کوئی دوسری مشقت دی جائے تو اسے پسند کرو گے یا نہیں؟ لوگوں کو جناب موصوف کے اس غیر معمولی اظہار لطف و کرم پر کمال تعجب تھا لیکن راقم حروف کو ان کی نیت کا حال معلوم ہو گیا تھا کہ چند روز کے لئے کسی کارخانے میں بھیجنے سے اس کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہے کہ مجھ سے تمام میعاد چکی پسوانے کے الزام سے بچنے کی صورت اور قسم کھانے کی گنجائش نکل آئے پس میں نے تبدیلی مشقت کے اس عجیب تحفے کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔

تجربے سے ثابت ہوا کہ میرا قیاس بالکل صحیح تھا کیوں کہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں انسپکٹر جنرل خانجات میرے متعلق آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کے ایک سوال کا جواب ایسے مبہم اور پُرفریب الفاظ میں دیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ممبران کونسل کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر میرے اس انکار کو بھی اپنے مفید مطلب چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "ایک موقع پر ملزم نے خود کسی دوسری مشقت کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔" انسپکٹر جنرل کا یہ مبہم جملہ اپنے پُرفریب مفہوم کے ذریعہ لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا کرانا چاہتا ہے کہ گویا اڈیٹر اردوئے معلی نے چکی کی مشقت کو از خود دوسری مشقتوں پر ترجیح دی ورنہ حکام جیل اسے دوسرا کام دینے پر آمادہ تھے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اصل واقعہ اور انکار کا صحیح موقع وہ تھا جس کا ذکر اس مضمون میں کر دیا گیا ہے۔

(جلد ۱۱: نمبر ۱۰: اکتوبر ۱۹۱۰ء: ص ۹۔۱۶)

زمانۂ قید کے ابتدائی ایام کی سختی ضرب المثل ہے کہ قیدیوں کے ان چند دنوں کی بے چینی سالہا سال کے کرب و اضطراب سے بھی بڑھ جایا کرتی ہے۔ ابتدا میں جیل کی تکلیفوں سے نیا سابقہ پڑتا ہے اس لئے نوگرفتاران مصیبت کو کچھ روز تک مشاہدات زنداں میں عذاب دوزخ کا نمونہ نظر آتا ہے۔ بہ مصداق "بر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگذرد" طبیعت ان سب ذلتوں کی خوگر ہو جاتی ہے۔ اور مایوسی قیدیوں کے دل میں ایک ایسا سکون پیدا کر دیتی ہے جس کی مدد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اگر ابتدائی بے قراری کا عالم بدستور قائم رہے تو ان غریبوں کی زندگی دشوار ہو جائے۔ دو سال، پانچ سال، سات سال، بلکہ چودہ چودہ سال تک کی دراز میعادیں لوگ بہ آسانی کاٹ دیتے ہیں۔ لیکن آخر میں جب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری قید کا صرف ایک مہینہ باقی ہے صرف پندرہ دن باقی ہیں۔ صرف تین دن باقی ہیں۔ صرف ایک ہی دن باقی ہے اس وقت کسی کا صبر و سکون برقرار نہیں رہتا۔ قواعد جیل کی رو سے قیدیوں کے ٹکٹوں

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

ہارون خاں شروانی

حسرت موہانی کے سیاسی رجحانات

مندرجہ بالا عنوان کے تحت پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم کا ایک طویل مضمون جون وجولائی ۱۹۵۳ء کے 'آج کل' میں شائع ہوا تھا۔ ذیل میں اس کی تلخیص پیش کی جارہی ہے ــــــ •

۱۹۰۳ کا ذکر ہے۔ میری عمر کوئی بارہ برس کی ہوگی۔ علی گڑھ کالج کے ملحقہ اسکول میں ساتویں درجے میں پڑھتا تھا۔ مدرسے سے آیا تو معلوم ہوا کہ ملاقات کے کمرے میں ایک صاحب بیٹھے والد مرحوم سے کچھ گفت گو کر رہے ہیں۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی ــ ملازم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں۔ وہ حاجی [محمد موسیٰ خاں] صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ حسرت موہانی اس زمانے ہی میں علی گڑھ کے حلقوں میں مشہور ہو چکے تھے۔ گستاخی سہی۔ مگر دل نے نہیں مانا۔ ایک طرف کی چلمن کی تیلیوں میں سے دیکھا کہ حسرت صاحب معمولی وضع کی اچکن پہنے، سر پر ایک بالکل چپٹی قسم کی ترکی ٹوپی، بیحد گھنی سیاہ داڑھی رکھے والد صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ علی گڑھ کی تاریخ میں اس زمانے کو بدرجۂ اتم انگریزیت کا زمانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مذہبیت تو درکنار یہ خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کالج کا کوئی ایسا گریجویٹ بھی ہوگا جو روزمرہ اپنے چہرے پر اُسترا نہ پھیرتا ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں حسرت کو دیکھ کر کچھ مرعوب سا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اس شخص میں کیا اوصاف ہوں گے کہ اس نے طالب علمی ہی کے زمانے میں اتنا نام پیدا کر لیا ہے۔

حسرت کی طبیعت میں بغاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کا شاخسانہ یہ نکلا کہ کالج کے پرنسپل مسٹر موریسن نے (جو بعد میں سر تھیوڈر موریسن اور وزیر ہند کی کونسل کے ممبر ہوئے) حسرت کو اقامت خانے [ہاسٹل] سے نکال دیا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ حسرت کی قابلیت کا سکہ کالج کے سکریٹری نواب محسن الملک مرحوم اور مقامی ٹرسٹیوں پر بیٹھا نہ ہوتا اور وہ طلبا میں اتنے مقبول اور ہر دل عزیز نہ ہوتے تو شاید انھیں اقامت خانے ہی سے نہیں بلکہ کالج سے بھی نکال دیا جاتا۔ مگر پرنسپل کی اتنی ہمت نہیں ہوئی اور انھیں صرف اقامت خانے ہی سے نکل جانے کے حکم پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔

حسرت نے ۱۹۰۳ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ موجودہ صدی کی ابتدا سے پہلی سنساری جنگ [۱۹۱۴ - ۱۸] تک علی گڑھ کالج کا گریجویٹ ہونا حکومتی خدمت کے لیے ایک طرح کا پاسپورٹ تھا، اور مشکل سے کوئی بی اے ہوگا جسے نائب تحصیلداری اور تحصیلداری کیا اس زمانے کی معراج کمال یعنی ڈپٹی کلکٹری بھی نہ مل جاتی ہو۔ حسرت کی طالب علمی کا زمانہ تمام تر کامیاب رہا تھا اور اگر وہ ذرا بھی اس کی خواہش کرتے تو انھیں سرکاری ملازمت ملنے میں کسی طرح کی دقت نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے ایک طرف شعر وسخن اور دوسری جانب ملک کی خدمت کو اپنا مسلک قرار دیا اور سرکاری ملازمت کے خیال تک کو ٹھکرا دیا۔

جب حسرت علی گڑھ میں طالب علم تھے تو انھوں نے اردو کی ایک انجمن اردوئے معلیٰ قائم کی۔ جو الحمدللہ اب تک موجود ہے۔ اقامت خانے سے اخراج تک وہ برابر اس کے سکریٹری رہے۔ انھیں انجمن کا نام ایسا پسند تھا کہ آخر کار جب انھوں نے کالج کی تعلیم کو خیرباد کہا تو اسی نام کا ایک رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس رسالے کا ادبی معیار نہایت بلند تھا تو سیاسی اعتبار سے اس میں حسرت کی "گرم" یعنی انتہا پسند پالیسی کی جھلک نظر آتی تھی اور اس میں ان کے یا دوسرے اہل قلم کے جو مضامین چھپتے تھے وہ بھی ادبی اعتبار سے اونچے درجے کے اور سیاسی اعتبار سے

بایاں پہلو لیے ہوتے تھے۔ سیاسی مضامین کی حد تک اردوئے معلیٰ کے ابتدائی دور میں مولوی برکت اللہ بھوپالی کے فارسی مضمون "ہندو و مسلمان و ہندوستان" ملا عبدالقیوم حیدرآبادی کے سلسلے وار مضمون "ازالۃ الاوہام" اور والد ماجد حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب مرحوم کے مضامین نے کافی ممتاز جگہ پائی تھی۔ حسرت کی معاشی حیثیت ہمیشہ نہایت پست ہونے اور ان کے بار بار جیل میں جانے کی وجہ سے ایک تو یہ رسالہ اکثر بے ترتیب نکلتا۔ اور دوسرے جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ویسے ویسے اس کا کاغذ کتابت۔ طباعت اچھی سے معمولی اور معمولی سے ادنا درجے کی ہوتی گئی۔ مگر گدڑی کے لعل کی طرح اس کے مضامین، اس کی نظمیں، اس کے خیالات اور اس کے تذکروں کا معیار برابر اونچا رہا۔ اتنا اونچا کہ مشکل سے کسی ہم عصر ادبی یا سیاسی رسالے کا معیار ایسا ہوگا۔

حسرت علی گڈھ کی پیداوار تھے۔ لیکن رائج الوقت علی گڈھی پالیسی کے سخت مخالف تھے اور علاوہ چند حریت پسندوں کے جن میں والد مرحوم کا نام شامل ہے اس زمانے کے علی گڑھ میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو برطانوی حکومت کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی ہمت کرتے ہوں۔ حسرت ۱۹۰۳ء ہی سے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے اور اس تنظیم کے بڑے دلدادہ تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون میں کانگریس کی بابت لکھتے ہیں:

"مسلمانان ہندوستان کا پولیٹکل مستقبل اگرچہ بظاہر دیگر اقوام ہند کے مستقبل اور حال سے بالکل غیر مشابہ نظر آتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے اور ہمارے خیال میں بہت ممکن ہے کہ آج سے بیس سال کے بعد ملکی معاملات میں مسلمانوں کی وہی پالیسی ہوجائے جو اس وقت کانگریس کی ہے اور بیس چالیس سال کے بعد مسلمان بھی وہی روش اختیار کریں جو کانگریس کے گرم فریق نے اختیار کی ہے۔"

علی گڑھ کی تحریک کے متعلق ان کی ایک مستقل رائے تھی۔ عام طور سے سید احمد خاں غفرلہٗ کو فرقہ پرست اور انگریزی حکومت کا مداح سمجھا جاتا تھا۔ اور ان کے پیرو انگریزوں کی مداحی اور ان کی ثنا خوانی کو اپنی زندگی کا ایک بڑا مقصد بنائے ہوئے تھے۔ ایسی فضا میں سرسید کے انتقال کے صرف نو برس بعد حسرت اپنے نئے رسالے میں یہ لکھنے کی ہمت کرتے ہیں۔

"ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید اپنے زمانے میں قوم کے مسلّم رہنما تھے اور اس وقت مسلمانوں کے حق میں جو کچھ انھوں نے کیا بہتر کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ ہونے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکار انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی تو بہت خوب کیا۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کی توجہ کو تمام ملکی معاملات سے علاحدہ کرکے صرف اعلا تعلیم کی طرف مائل کردیا تو اور بھی خوب کیا....

لیکن ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب بھی وہی حالت ہے جو سرسید کے وقت میں تھی؟ کیا سرکار انگریزی کو اب بھی کسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر ننگ و عار کا موجب کون امر ہوسکتا ہے۔ کہ ہم اپنی فلاح و بہبود کے لیے خود کوشش نہ کریں بلکہ دوسروں کی حمایت پر بھروسہ رکھیں اور اپنے جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی نفع کی امید کی وجہ سے باز رہیں۔"

(اردوئے معلّیٰ ستمبر ۱۹۰۴ء)

اردوئے معلیٰ کو جاری ہوئے چار ہی سال ہوئے تھے کہ حسرت اور ان کے رسالے کو ایک مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۹۰۷ء برطانوی ہند کی تاریخ کا نہایت اہم سال تصور کیا جاتا ہے اس لیے کہ اسی سال ہندوستان کے پہلے انقلاب کی جسے غدر کا نام دیا جاتا ہے پچاسویں سالگرہ تھی۔ اور حکومت معمول سے معمولی تحریک کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی کہ کہیں دوسرا غدر نہ برپا ہو جائے۔ اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون مصری وطن دوست مصطفیٰ پاشا کامل اور برطانیہ کی پالیسی پر نکلا۔ جو غالباً حسرت کے ایک دوست اور علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم فضل الحق کے قلم سے تھا۔ مضمون کا لہجہ کچھ ایسا سخت نہ تھا لیکن صوبے کے لفٹننٹ گورنر سر جان ہیویٹ اس پر تلے بیٹھے تھے کہ برطانوی حکومت کے ذرا سے اختلاف کو بھی سختی کے ساتھ دبادیں۔ الغرض حسرت موہانی پر تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴ (الف) کے بموجب مقدمہ قائم ہوا۔ اس مقدمے میں حسرت نے اپنے اعلیٰ کردار کا ثبوت دیا اور اصل لکھنے والے کا نام بتلانے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ مضمون کی پوری ذمہ داری خود اپنے سر لے لی۔ اس زمانے کے سیاسی جمود کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ حسرت کو اپنے بچاؤ کے لیے نہ کوئی وکیل مل سکا نہ بیرسٹر۔ چنانچہ دو تین ہی پیشیوں کے بعد انھیں دو سال کی قید با مشقت اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ چونکہ انھوں نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کردیا اس لیے ان کا انمول کتب خانہ محض ساٹھ روپے میں نیلام کردیا گیا۔ اور یہ ساٹھ روپے ان کے جرمانے میں جمع کرلیے گئے۔ حسرت اپنی پہلی قید فرنگ کے متعلق لکھتے ہیں:

۲۳ جون ۱۹۰۹ء کو اردوئے معلّیٰ پر مقدمہ

سڈیشن قائم ہوا اور ۴ اگست ۱۹۰۸ء کو دو سال قید سخت اور پانچ سو روپیہ جرمانے کا حکم سنا دیا گیا .... ہمیں مجسٹریٹ علی گڑھ کے ان احکام کی شکایت اب ہے نہ کبھی ہوگی .... جب تک ہندوستان میں مجسٹریٹ خود ایک شخص پر الزام لگائیں گے اور وارنٹ جاری کریں گے پھر خود ہی اس پر انصاف کرنے بیٹھیں گے اس وقت تک فوجداری مقدمات میں خصوصاً انصاف یابی کی امید رکھنا اول درجے کی حماقت ہے .... پولٹیکل مقدمات میں یوروپین مجسٹریٹ کے دل میں بغض و کدورت کا پیدا ہونا ایسا قدرتی امر ہے جس کی نسبت ہم الزام نہیں دے سکتے۔ ایڈیٹر اردوئے معلی کو الہ آباد جیل میں معمول سے زیادہ سختی برداشت کرنا پڑی اور تقریباً سال بھر تک ایک من آٹا پیسنے کی سخت مشقت سے سابقہ رہا جو عام طور پر دیگر صوبوں میں ایک ماہ سے زیادہ نہیں لی جاتی .... ہم پولٹیکل قیدیوں کی خوش قسمتی دیکھیے کہ جیل کے اندر ایک اور جیل میں رہنا پڑتا ہے یعنی ایک خاص وارڈ یا بعض اوقات ایک خاص کوٹھری کے علاوہ جیل میں ہی نہ کسی دوسری جگہ جا سکتے ہیں نہ کسی سے بات کر سکتے ہیں ..... مزید نگرانی کے علاوہ بالکل برہنہ کر کے تلاشی لینے کا اندیشہ رہتا ہے۔ فقیر نے بمصداق

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
اس اک عشق میں ہیں نے کیا کیا نہ دیکھا

ان تمام باتوں کو برداشت کیا اور بے تکلف برداشت کیا۔ فقیر کے دل پر بھی ان واقعات و حالات کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ تمام مذکورہ بالا موانعات کے باوجود غزلیں دن بھر چکی پیسنے کے اثنا میں کہی جاتی تھیں اور بوقت شام ایک قیدی دوست کو لکھوا دی جاتی تھیں، جو بحیثیت برقنداز نسبتاً زیادہ آزاد تھے اور مخصوص طور پر نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے کاغذ پنسل اپنے پاس چھپا کر رکھ لیتے تھے۔

مایۂ عشرت بےحد ہے غمِ قیدِ وفا
میں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا
جورِ بیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا
دیکھو بدنام نہ ہو نام ستم گاری کا
کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

حقیقت یہ ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا، ایسا جس کے آزادی کے راسخ عقیدے میں ذرا سا بھی تزلزل ہوتا تو کسی حالت میں اس صعوبت کے دوران میں وہ شعر و سخن سے آشنا نہ ہوتا، رومانی قسم کی نظمیں اور تغزل تو اطمینان قلبی کی باتیں تھیں اور یہ اطمینان ایک ایک من اناج پیسنے والے کو کہاں میسر ہوتا ہے۔ مگر حسرت تو ایک طرف فدائے آزادی اور دوسری جانب فدائے مذہب تھے اور قربانی کا جذبہ ان کے رگ و ریشہ میں بھرا ہوا تھا۔ کسی کے کلام میں اس سے زیادہ عقیدت نہ ہوگی جتنی حسرت کے ان اشعار میں۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہے سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی
ہر چند ہے دل شیدا حریتِ کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۷ اور ۱۹۰۸ کا زمانہ ایک بحرانی زمانہ تھا جس میں ہندوستانیوں اور انگریزوں دونوں کو بار بار ایسے عہد کی یاد تازہ ہوتی تھی جب ملک انگریزوں کا جوا اتار پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس احساس کا اثر ملک کی سیاست پر پڑنا لازمی تھا۔ اور بال گنگا دھر تلک، بپن چندر پال اور اروبند و گھوش کی قیادت میں ایک ایسی پارٹی بن گئی جو محض "دستوری جد و جہد" کی بجائے "راست عمل" یعنی انقلاب ہی کو مکمل آزادی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں سب سے پیش پیش تلک تھے۔ جن کا مشہور قول "آزادی میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے لے کر رہوں گا" ہر شخص کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ تلک نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ "اگر ہمارے گھر میں چور گھس آئیں اور ہم انھیں پکڑ نہ سکیں تو ہمیں چاہئے کہ انھیں بند کر کے آگ دے دیں تاکہ اس آگ میں وہ بھسم ہو جائیں" اس کے برعکس کانگرس کے ایسے لیڈر جیسے فیروز شاہ مہتہ، ڈین شا واچا، سریندر ناتھ بنرجی تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہمیں آہستہ آہستہ چلنا چاہئے۔ اور آئین و قانون کو انھیں توڑنا چاہئے۔ ۱۹۰۷ میں کانگرس کے آدرش پر تقریر کرتے ہوئے بنگال کے بڑے ایڈوکیٹ اور سیاسی لیڈر راش بہاری گھوش نے کہا تھا کہ "جس مقصد کے حصول کے لیے ہم جد و جہد کر رہے ہیں وہ سلطنت برطانیہ کے اندر سوراج ہے، اور ہم کبھی اس ملک کی مکمل آزادی کا خیال بھی نہیں لا سکتے۔" اسی طرح جب شاہ جارج نے ۱۹۱۱ کے دلی کے دربار میں پہلی تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا اعلان کیا تو کانگرس نے اپنا اظہار شکر گذاری ان الفاظ میں کیا تھا۔ "یہ کانگرس اپنے گہرے تشکر و امتنان کا اظہار کرتی ہے کہ بادشاہ سلامت نے اپنی مہربانی اور عنایت سے بنگال کی تقسیم کے اصول میں ترمیم فرما دی ہے۔" نیز یہ تو ہر سال کا معمول تھا کہ کانگرس کا پہلا ریزولیوشن "ہز مجسٹی شہنشاہِ ہند کی خدمت میں اپنی عمیق وفاداری اور خیر سگالی" کے اظہار پر مشتمل ہو۔ حسرت موہانی کو اس "نرم" قسم کی پالیسی پر مطلق اعتماد نہ تھا۔ بلکہ وہ تلک، پال اور گھوش ہی کو بے دھڑک اپنا رہنما تسلیم کرتے تھے۔ ۱۹۰۸ میں جب تلک پر ایک مضمون کے سلسلے میں جو انھوں نے اپنے مرہٹی اخبار کیسری میں لکھا تھا سڈیشن کا مقدمہ قائم ہوا۔ اور انھیں چھ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تو حسرت پر اس کا بڑا اثر پڑا اور تلک کی مدح میں دو مشہور نظمیں لکھیں:

آزادیٔ ہند کی خواہش کو مقبول خواص و عوام کیا
دل اہل ستم کے بیٹھ گئے وہ بال تلک نے کام کیا

سب ہند کے گرم اخباروں میں مضمون لکھے کیسے کیسے
جس سے کہ فرنگی ڈرتے تھے اس کام کو سر انجام دیا
ہو جور و جفا یا ظلم و ستم ہٹنے کو نہیں پیچھے کو قدم
جس نے یہ کہا دب جائیں گے ہم واللہ خیال خام کیا
بلونت تلک اے فخر وطن نے بجرم اسیر دام محن
یاد آئی تری جس دم فوراً حسرت نے جھک کے سلام کیا

اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقیں و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادی بیباک کی
تجھ سے روشن اہل اخلاص و صفا کی انجمن
تجھ سے لوگوں نے لیا خود اعتمادی کا سبق
ہو گئے مستغنی اعدائے محبان وطن
سب سے پہلے تجھ نے کی برداشت اے فرزند ہند
ذات تیری رہنمائے راہ آزادی ہوئی
تھے گرفتار غلامی ورنہ یاران وطن
تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسم کہن
قید آزادی سے واقف ہو گئے پیر و جواں
مٹ گئی لوگوں کے دل سے ہیبت دار و رسن
ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تادیر رب ذو المنن

عقیدت کا یہ پہلا جذبہ تلک کی موت تک برابر جاری رہا اور جب ۱۹۱۵ء کی ابتدا میں ان کا انتقال ہوا تو حسرت نے ان کے سوگ میں ایک نوحہ کہا جس کے مطلع ہی سے ان کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں بپا، دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک

ممکن ہے کہ بعض پڑھنے والے اگلے دو اشعار پر ناک بھوں چڑھائیں مگر ان سے اس زبردست تعلق خاطر کا اظہار ہوتا ہے، جو حسرت کو آنجہانی تلک کے خیالات سے تھا۔

جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں پر زور ان کا
اب رہ کے بہشت میں نزد خدا حوروں پہ کریں گے راج تلک
ہر ہندی کا مضبوط ہے جی، گیتا کی بات ہے دل پہ لکھی
آخر میں جو خود بھی کہا ہے یہی پھر آئیں گے مہراج تلک

ظاہر ہے کہ حسرت کے دوست یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مستقل طور پر جیل خانہ میں وہ اپنا گھر بنا لیں۔ حسرت جیل سے نکلے تو انھوں نے ان کو یہ صلاح دی کہ مناسب ہے کہ اردوئے معلیٰ کی پالیسی کو بدل دیا جائے اور اسے ایک خالص ادبی ماہنامہ بنا دیا جائے لیکن اگر حسرت حکومت کی علانیہ مخالفت کو نہیں چھوڑ سکتے تو انھیں چاہیے کہ "انتہائیوں" کے بجائے "اعتدالیوں" کے ساتھ ہو جائیں۔ اس پر حسرت نے اکتوبر ۱۹۰۹ء کے اردوئے معلیٰ میں "اردوئے معلیٰ کی پالیسی" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا اور اس میں اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

"اردوئے معلیٰ کی دوبارہ اشاعت پر چند احباب نے یہ صلاح دی کہ ہمیں پالٹیکس سے بالکل دست کش ہو جانا چاہیئے۔ بعض کا مشورہ تھا کہ اگر سیاسی مضامین ہوں بھی تو مسلم لیگ کی پالیسی کے موافق ہوں۔ چند دوستوں نے جو نسبتاً زیادہ آزاد خیال ہیں یہاں تک اجازت دی کہ اگر جمہور ہند کی ہم خیالی منظور ہو تو کانگرس کے نرم فریق کی روش اختیار کی جائے ... مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں عقیدہ، قطع نظر اس کے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایسی چیز ہے جس کو محض خوف اور مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے .... ہم پالٹیکس میں مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو اروبندو گھوش کی پیروی اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔"

حسرت اس سلسلے میں ہندوستان کی زبوں حالی کی بابت اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی انتہائی رجائیت اور بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہیں۔

"دنیا کی رفتار اور اس دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے چنانچہ خوابیدہ براعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک اس وقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے پس عقل سلیم کسی طرح باور نہیں کر سکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی قسمت میں محکومی دوامی کی ذلت لکھ دی گئی ہو... غرض کہ ارباب دانش و بینش کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اپنی موجودہ صورت میں تو اس کا چند سال بھی قائم رہنا دشوار نظر آتا ہے ... گرم فریق کے رہنما... اپنی تمام پولٹیکل کوششوں میں مذکورہ بالا اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک وہ حق پر ہیں۔ برخلاف اس کے رہنمایان فریق نرم، پیروان مسلم لیگ اور بانیان ہندو کانفرنس اہل ہند اور دوامی محکومی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک ہمارے انتہائی عروج کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام اور محکوم سے خوش حال محکوم ہو جائیں۔"

ان خیالات کو لے کر حسرت زیادہ دن تک جیل سے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ جیل میں ان پر جو پابندیاں لگائی گئیں ان کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ان کے والد نے ان سے جیل میں ملنا چاہا تو اس کی انھیں اجازت نہیں ملی۔ جب وہ زیادہ علیل ہوئے اور بستر مرگ پر دراز ہوئے تو حسرت کو ان کی علالت کی اطلاع نہیں ہوئی یہاں تک کہ ان کے انتقال کی بھی اس وقت خبر ہوئی جب حسرت اپنی قید بھگت کر جیل سے باہر نکلے۔

حسرت شاید پہلے مسلمان تھے جنھوں نے پہلی تقسیم بنگالہ کے بعد ہی نہایت سختی کے ساتھ سودیشی تحریک کو اپنا لیا۔ اور باہر کی چیزوں کے مقاطعے کی ایسی ٹھانی کہ مرتے دم تک بدیشی چیزوں، خصوصاً ولایتی کپڑے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ ایک روز کڑاکے کے جاڑے میں وہ ان کی قیامگاہ پر آئے ان کے پاس لحاف توشک کافی نہیں تھی۔ مولانا نے اپنا گرم کمبل پیش کیا۔ حسرت کو معلوم ہوا کہ کمبل ولایتی ہے تو انھوں نے اسے اوڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور رات بھر ٹھٹھرنے کو ترجیح دی۔ جب ۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ نے ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کا ریزولیوشن پاس کیا تو حسرت پھولے نہیں سماتے تھے اور بڑے خوش تھے کہ اب مسلم لیگ کانگرس کے اتنے قریب آگئی ہے کہ دونوں کے مابین ہمیشہ کے لیے سمجھوتہ ہو جائے گا۔

"الحمدللہ کہ مسلم لیگ کی کونسل نے دسمبر ۱۹۱۲ء کے اجلاس میں خرابیٔ بسیار کے بعد آخرکار سیلف گورنمنٹ کو اپنا آخری مقصد تسلیم کر کے ہمارے اس قیاس کو ہمارے تخمینی وقت سے بہت قبل بالکل صحیح ثابت کر دیا۔ جس کا اظہار ہم نے شروع ۱۹۰۷ء میں کیا تھا:"

وہ اس کیفیت کو بالکل ایک فطری ارتقا سمجھتے ہیں اس لیے کہ:

"حریت ایک ایسی خواہش ہے جس کی
ابتدا ضرور ہوتی ہے لیکن انتہا نہیں ہوسکتی
یہ ایک بار دل میں پیدا ہو کر برابر بڑھتی
رہتی ہے گھٹنے کا نام نہیں لیتی۔"

(اردوئے معلیٰ جنوری ۱۹۱۳ء)

لیکن بہت جلد حسرت لیگ کے ممبروں سے نالاں ہو گئے اس لیے کہ ان کے نزدیک ان میں خدمت کا جذبہ مفقود ہو چلا تھا۔ وہ اس صورت حال سے بہت پریشان اور برافروختہ ہیں۔ اور کہتے ہیں:

ہے کسے خدمت اسلام کی حرص
لوگ رکھتے ہیں فقط نام کی حرص
دین کا غم ہو تو کیا چیز ہے غم
حرص دنیا ہو تو کس کام کی حرص
طلب جاہ نہاں تا کہ حسرت
چھوڑ اس آرزوئے خام کی حرص

ڈاکٹر انصاری نے دسمبر ۱۹۱۸ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں (جو کانگرس کے ساتھ دہلی میں ہو رہا تھا) اپنا بصیرت افروز خطبہ (استقبالیہ) پڑھا جو بالآخر حکومت نے ضبط کر لیا۔ اس خطبے میں ایک طرف تو ہندوؤں، مسلمانوں کی اتحاد و اتفاق کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا اور دوسری جانب انگریزوں اور ان کے حلیفوں سے صاف کہہ دیا گیا تھا کہ وہ جزیرۃ العرب کا تخلیہ کر دیں۔ حسرت اس خطبے سے متاثر ہوئے اور مارچ ۱۹۱۹ میں کہا:

خطبۂ لیگ ہے کفارۂ گنہگاری کا
اب ہمیں شکوہ نہیں ڈاکٹر انصاری کا
کاش سمجھیں اسے ارباب حکومت کہ نہیں
دخل اس پیروی صدق میں غداری کا
حسرت اس خطبے سے نالاں ہیں کیوں اہل فریب
راز مخفی نہ رہا ان کی ریاکاری کا

انھیں خیالات کو لے کر حسرت نے ۱۹۲۱ء کے اجلاس مسلم لیگ کی صدارت قبول فرمائی۔ یہ اجلاس اس اعتبار سے معرکۃ الآرا تھا کہ یہ کانگرس خلافت کانفرنس اور جمعیت العلما کے اجلاسوں کے ساتھ ساتھ احمد آباد میں منعقد ہو رہا تھا اور ترقی پسند جماعتوں کے نمائندے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اس وقت احمد آباد آئے ہوئے تھے۔ کانگرس کے صدر چترنجن داس چنے گئے تھے۔ مگر ان کے قید فرنگ میں ہونے کی وجہ سے صدارت حکیم اجمل خاں کو تفویض ہوئی تھی۔ خلافت کانفرنس کی صدارت کے فرائض بھی حکیم اجمل خاں ہی انجام دے رہے تھے۔ اور مولانا آزاد جمعیت العلما کے صدر تھے۔ حسرت کا جو رویہ کانگرس میں ہوا اس کا ذکر تو آگے کیا جائے گا۔ مسلم لیگ کے صدارتی خطبے میں انھوں نے انگریزوں کو صاف صاف الفاظ میں دھمکی دی کہ اگر انھوں نے مسلمانان عالم کے ساتھ عموماً اور ہندوستان کے ساتھ خصوصاً اپنی روش میں تبدیلی نہ کی تو کم سے کم مسلمانوں کو قرآن مجید کا حکم فاقتلوھم حیث ثقفتموھم کی تعمیل کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز انگریزوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ان کا خطبہ ضبط ہو گیا۔ ان پر مقدمہ قائم ہوا اور انھیں عدالت نے بیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ مگر اپیل میں یہ صرف دو سال کی قید رہ گئی اور حسرت اس مدت کے لئے یروداجیل میں بند کر دئے گئے۔ یہ قید ایک اعتبار سے اس لیے ممتاز ہے کہ اس مرتبہ ان کا اور مہاتما گاندھی کا جیل میں ساتھ ہوا۔

کہتے ہیں کہ مرد نورت کا رشتہ آسمان پر جڑتا ہے حسرت کو اللہ تعالیٰ نے بی بی بھی ایسی ہی دی تھیں جنھیں حق کی خاطر اذیت میں لطف آتا تھا۔ اور جو بڑے بڑے تاریخی سورماؤں اور دلیش بھگتوں کی طرح ہمیشہ اپنے شوہر کا دل بڑھایا کرتی تھیں۔ حسرت کو ۱۹۱۶ء میں نام نہاد قواعد تحفظ ہند کے تحت نظر بند کیا گیا تو انھوں نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں ان قواعد ہی کو سرے سے ظالمانہ سمجھتا ہوں ان پر مقدمہ قائم ہوا اور ایک ہی پیشی میں انھیں دو سال کی قید کا حکم سنا کر فیض آباد جیل میں بند کر دیا گیا۔ فیض آباد کی آب و ہوا اور اس پر سخت مشقت کی وجہ سے ان کی تندرستی خراب ہو گئی اور حکومت کو انھیں وہاں سے منتقل کرنا پڑا۔ بیگم حسرت نے ہزار کوشش کی کہ ان کے شوہر کو علی گڑھ جیل میں رکھا جائے تاکہ وہ ان کی تھوڑی بہت خدمت کر سکیں لیکن حکومت نے اس درخواست کو رد کر دیا۔ رہائی کے بعد علی گڑھ کے رسل گنج میں ایک چھوٹی سی دکان میں حسرت نے ایک سودیشی اسٹور کھول لیا تھا جس میں اپنی بساط کے اعتبار سے موٹا کپڑا وغیرہ رکھ لیا تھا اور اسی پر میاں بیوی کی بسر ہوتی تھی۔ یہاں کام نہ چلا

تو کان پور جاکر رہ پڑے اور وہیں دوکان کھول لی۔
جب ۱۹۱۶ء میں حسرت کو جیل ہوئی اور انھیں دور افتادہ للت پور بھیجا گیا تو بیگم حسرت کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی سے بسر ہونے لگی۔ لیکن اس ایماندار خاتون نے اُف تک نہیں کی۔ اور حسرت کے بعض محبوں نے انھیں مالی امداد دینی چاہی تو اس خوددار بی بی نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

حسرت اپنے سلسلہ وار مضمون "مشاہدات زنداں" میں بیگم حسرت کا ذکر کرتے ہیں کہ جب ۱۹۰۸ء میں یعنی شادی سے صرف پانچ برس بعد انہیں قید ہوئی تو بیگم صاحبہ نے انھیں لکھا کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی طرح کی کمزوری کا اظہار نہ ہو"

(اردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۱۳ء)

۱۹۱۵ء میں پہلی مرتبہ کانگریس اور لیگ کے اجلاس ایک ہی مقام پر یعنی بمبئی میں ہوئے اور دونوں میں سمجھوتہ ہونے کی سبیل نکل آئی تو حسرت بھی لیگ کے ممبر ہو گئے۔ مگر وہ زیادہ دن تک آزاد نہیں رہ سکتے تھے۔ انھیں نظربندی کا حکم ملا۔ جس کی انھوں نے تعمیل نہیں کی۔ ان پر عدم تعمیل کا مقدمہ دائر ہوا۔ اور دو برس کے لیے پھر جیل جانا پڑا۔ چھوٹے تو تھوڑے دن آرام لے کر سیدھے ۱۹۱۹ء والی امرتسر کانگریس میں شریک ہوئے۔ جیسا تاریخ بین کو معلوم ہوگا۔ کانگریس کی تاریخ میں اس اجلاس کی بڑی اہمیت ہے۔ پنڈال اسی جلیانوالہ باغ میں بنایا گیا تھا جس میں چند مہینے پہلے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کا قتل عام ہوا تھا۔ اسی اجلاس میں انگریزی حکومت ترک موالات اور عدم تعاون کی ابتدا ہوئی اور وہ بھی وہ سیشن تھا جس میں پہلی مرتبہ "مہاتما گاندھی کی جے" اور "ہندو مسلمان کی جے" کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھا تھا۔ آہستہ آہستہ مہاتما گاندھی پورے ہندوستان کی سیاسیات پر حاوی ہوتے جا رہے تھے اور محمد علی اور شوکت علی نے اور ان کے ساتھ تمام ترقی پسند مسلمانوں نے اپنے آپ کو کانگریس کی تحریک سے وابستہ کر لیا تھا۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنا ہے جس سے حسرت موہانی کے کردار کی مثال ملتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کے اظہار میں کبھی پس و پیش نہ کرتے تھے۔ تحریک خلافت کے باضابطہ آغاز کرنے سے پہلے اکابر اہل اسلام کا ایک وفد وائسرائے سے ملنے دہلی گیا۔ اس وفد میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا سید سلیمان ندوی، حسرت موہانی اور بعض دوسرے رہنما شریک تھے۔ جب ایڈریس پیش ہو چکا اور وائسرائے اس کا جواب دے چکے تو وہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ وفد کے ممبروں سے ہاتھ ملانے لگے۔ لیکن حسرت کی باری آئی تو انھوں نے مصافحہ نہیں کیا۔ اور ویسے ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

حسرت کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا کہ جس بزم میں جس قومی مجلس میں شریک ہوتے اس کا کوئی بھی رنگ ہوتا وہ اپنی سی کہتے تھے۔ خواہ کوئی دوسرا ان کی تائید کرے یا نہ کرے۔ کانپور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے کہ حکومت نے شہر کی آرائش کے سلسلے میں اس کے صحن کا ایک حصہ شہید کر دیا۔ اس بظاہر غیر اہم واقعہ سے اس زمانے کے ہندی مسلمانوں میں جو ہیجان برپا ہوا اس سے اس زمانے کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے اس سے برطانوی ہند کی گویا بنیادیں ہل گئیں اور جب مسلمانوں نے ایک وفد جس کے ممبر مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن تھے انگلستان بھیجا تو گو اس کی رسائی انگلستان کے وزیروں تک نہ ہو سکی۔ لیکن وہاں کی پبلک نے اس کا کھلے دل سے سواگت کیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ اس بات کو بھانپ گئے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگی ہے اور انھیں چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے کمال دوراندیشی سے مسجد کے منہدم شدہ حصہ کو از سر نو تعمیر کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ اس پر مسلم لیگ میں وائسرائے کے شکریہ کا ریزولیوشن پیش ہوا۔ اور اس کی تائید پرانے خیال کے لیگیوں اور احراریوں دونوں نے کی۔ لیکن حسرت جنھیں قوم نے رئیس الاحرار کا خطاب دیا تھا، لیگ کے ان گنے چنے ممبروں میں سے تھے جنھوں نے اس ریزولیوشن کے خلاف رائے دی۔

۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس اور خلافت کانفرنس کا اجلاس ہو رہا ہے اور حسرت دونوں کے رکن رکین ہو چکے ہیں۔ احمد آباد کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں حسرت ہندوستان کے لیے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پیش کرتے ہیں۔ اتفاقاً مہاتما گاندھی اس وقت مسلمانوں کے کیمپ میں کچھ مشورے کے لیے آئے ہوتے ہیں۔ پنڈال کی طرف سے دو رضاکار دوڑے ہوئے آتے ہیں اور گاندھی جی سے کہتے ہیں کہ مہاتما جی غضب ہو گیا۔ مولانا حسرت موہانی اپنی ضد پر اڑے ہیں اور مکمل آزادی کی تحریک پیش کرنے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ مہاتما جی لنگڑے پاؤں کانگریس پنڈال واپس ہوتے ہیں۔ رائے لی جاتی ہے تو حسرت کی رائے ایک طرف اور اکثریت کی رائے دوسری طرف جاتی ہے

اب خلافت کانفرنس کا رخ کیجیے۔ آج کل بہت سوں کا خیال ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم ہمیشہ انگریزوں کے ہمنوا رہے ہیں۔ لیکن احمد آباد کی فضا ہمیں بالکل دوسرا سبق سکھاتی ہے۔ کانگریس میں تو مکمل آزادی کے ریزولیوشن کو ایک مؤید نہیں ملتے لیکن خلافت کانفرنس کی سبجکٹ کمیٹی کی اکثریت حسرت کے موافق ہو جاتی ہے اور یہ ریزولیوشن اس کمیٹی میں منظور ہو جاتا ہے۔ خلافت کانفرنس کے صدر حکیم اجمل خاں کو خیال ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ریزولیوشن کی وجہ سے کانگریس اور خلافت کانفرنس میں بگاڑ ہو جائے اور اس بگاڑ کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی طرح کا افتراق پیدا ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے صدارتی اختیار کو کام میں لا کر ریزولیوشن کو خلافت کانفرنس کے

کھلے اجلاس میں پیش کرنے کی ممانعت کر دیتے ہیں۔ لیکن بقول حسرت۔ حب وطن کی آگ جب لگادی جاتی ہے تو اسے کوئی بجھا نہیں سکتا۔ اور حسرت کے جس ریزولیوشن کو ۱۹۲۱ میں کانگریس میں نامنظور اور خلافت کانفرنس میں ممنوع قرار دیا گیا تھا اسی کو ادھر ادھر سے کاٹ چھانٹ کر آٹھ برس بعد اسی کانگریس نے دریائے راوی کے کنارے ۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں بڑے جوش و خروش سے پاس کیا۔ اور اب یہ تاریخ ہندستان کے عہد حاضر کی اہم ترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔

حسرت اپنی دھن کے پکے تھے اور جہاں کہیں وہ جاتے، جہاں کہیں بیٹھتے ان کے سامنے ایک ہی مطمع نظر ہوتا وہ یہ کہ ضمیر کی جو بھی آواز ہو اس کے مطابق اپنے خیال کا اظہار کریں۔ ان کا مسلک ان کا اپنا ہوتا تھا۔ ان کا ضمیر ساتھ نہ دیتا تو کسی کے اتباع کو، یہاں تک کہ عوام کی اتباع کو بھی، اپنے اصول کے خلاف سمجھتے تھے۔ ستمبر ۱۹۱۰ء میں فیض آباد جیل سے لکھتے ہیں :

ہر چند کہ میں خلاف جمہور نہیں
تقلید عوام دل کو منظور نہیں

وہ کانگریس کی اعتدالی پالیسی سے تنگ آتے ہیں تو اس کا ساتھ چھوڑ کر انتہا پسندوں سے جا ملتے ہیں۔ مسلم لیگ حکومت خود اختیاری کا ریزولیوشن پاس کرتی ہے تو اس میں بڑے شوق سے شریک ہو جاتے ہیں مگر بہت جلد اسے بھی بیکار سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں خلافت کانفرنس ان کا ساتھ نہیں دیتی تو اسے بھی خیرباد کہتے ہیں۔

پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں جو آل پارٹیز کانفرنس ہوتی ہے اور جو دستور اس میں تجویز ہوتا ہے اس کی اس بنا پر مخالفت کرتے ہیں کہ اس میں ہندستان کی مکمل آزادی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ آخر وہ پہلے سوشلسٹ اور پھر کمیونسٹ اور سوویت طرز حکومت کے مؤید بن جاتے ہیں۔ اور ۱۹۲۵ء میں پہلی کمیونسٹ کانفرنس کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے فرماتے ہیں :

"کمیونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خوں ریزی اور فساد لازم و ملزوم ہیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف ضرورت اور مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازمی قرار نہیں دیتے۔"

پھر فرماتے ہیں :

ہدایت کا زمانہ منتظر تھا۔ اہل سوویت نے
دکھائی سب کو راہ حریت بے خوف دیں ہو کر

اور پھر :

لازم ہے یہاں غلبۂ آئین سوویت
دو چار برس میں ہو کہ دس پانچ برس میں

ان کے خیال میں سوویت نظام اسلام کے عین مطابق تھا اور اس میں مطلق کوئی مضائقہ نہ تھا کہ انسان کمیونسٹ ہو اور ساتھ ہی دل سے اور عمل سے اسلام کا پیرو بھی۔

تکمیل علائق دنیوی کو حسرت
ہے خواہش حسن عاقبت بھی لازم
درویشی و انقلاب مسلک میرا
صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم
زاں رو کہ بہ ہیچ ہیبت اسلام
فی الجملہ ہے آئین سوویت قائم

یہی وجہ ہے کہ جب ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو دو برس کی چھان بین کے بعد ہندوستان کی دستور ساز جماعت میں نئے دستور پر رائے شماری ہوئی تو ممبروں میں صرف سید فضل الحسن حسرت موہانی ہی تھے جو ہندستان میں سوویت راج چاہتے تھے۔ اور انہی کی اکیلی آواز تھی جو نئے دستور کے خلاف اٹھی۔ یہ روش ان کے عمر بھر کے وطیرے کے عین مطابق تھی۔ اس لیے کہ ان کا اصول یہ رہا تھا کہ :

لگادو آگ عذر مصلحت کو
کہ ہے بیزار اس شے سے میرا دل
غلط ہے قول اہل مصلحت کوش
نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل
توانائے صداقت ہے تو ہرگز
نہ ہوگا پیرو باطل مرا دل

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے حسرت پر دو جذبے غالب تھے۔ ایک تو خدا کا خوف اور دوسرے آزادی سے عشق۔ انھیں جذبۂ آزادی کی وجہ سے ابتدا ہی سے طرح طرح کی جسمانی کلفتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس لیے وہ گویا اس کی نذر ہو گئے اور یہ جذبہ ان کے دم واپسیں تک کارفرما رہا۔ انتہا پسند ہوں یا مسلم لیگی۔ خلافتی ہوں یا سوشلسٹ کمیونسٹ ہوں یا کوئی دوسرا گروہ، اگر یہ پارٹی یا یہ گروہ حسرت کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوتا تو حسرت اس میں مضائقہ نہ سمجھتے تھے کہ انھیں اس پارٹی یا اس گروہ کے ساتھ وابستہ سمجھا جائے۔ لیکن اگر پارٹی یا گروہ مکمل آزادی کے آدرش سے ذرا بھی ڈگمگاتا تو پھر یہ کہہ کر کہ :

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

حسرت اس سے ہٹ جاتے اور اپنی پرانی روش چلنے لگتے۔ ان سے زیادہ کون اپنی مدد آپ کرنے کے اصول کا پکا تھا۔ ان کا کہنا تو یہ تھا کہ

حق سے بعذر مصلحت وقت یہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر

یہ حسرت کے راسخ عقیدے کا ایک عجیب مظاہرہ تھا کہ ایک طرف تو دنیا کی کوئی مشکل کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو ان پر نہ پڑی ہو تو دوسری طرف ان کی رجائیت کا یہ عالم تھا کہ بقول شخصے کال کوٹھری میں وہ باغوں اور نہروں کے خواب دیکھتے تھے۔ ایک

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
اس اک عشق میں میں نے کیا کیا نہ دیکھا

(بقیہ صفحہ ۸۵)

کشن پرشاد کول

حسرت موہانی کی شخصیت

نہ اس مضمون میں تو مولانا کی شاعری پر تبصرہ کرنا یا اس کا جائزہ لینا منظور ہے نہ ان کی سیاسی زندگی کے معرکوں پر بحث کرنا مقصود، مولانا کی شاعری پر بحث کی نہ یہاں گنجایش ہے نہ وہ میرے خراجِ تحسین کی محتاج۔ مانی ہوئی بات ہے کہ حسرت موہانی اپنے دورِ شاعری کے بادشاہ تھے اور سب سے بڑے غزل گو، بقول 'معارف' 'آخری دور کے بگڑے ہوئے مذاق شاعری کی اصلاح انہی نے کی اور بے لطف رسمی تغزل کو صحیح معنوں میں دل کی واردات بنا دیا۔ جس میں حقیقی تغزل کی ساری لطافتیں اور رعنائیاں موجود تھیں' ان کی سیاسی زندگی طوفان انقلاب کا پیش خیمہ تھی اور اس کا تذکرہ کسی مجاہد انقلاب ہی کے قلم سے بھلا معلوم ہوگا۔ یہاں تو صرف حسرت موہانی کی اولوالعزم ہستی اور غیر معمولی شخصیت کی یادگار تازہ کرنا مقصود ہے کہ جس کا میں اول روز سے دل سے قدر دان رہا۔ اس طرح سے پرانے ذاتی مراسم کی یاد تازہ ہو جائے گی اور رہی سہی حسرتیں بھی پوری ہو جائیں گی۔

تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزرا[1] میں کالج میں پڑھتا تھا۔ مجھے اردو ادب و صحافت سے شوق تھا اس وقت کے اردو رسالوں میں مخزن، زمانہ دکن کے ریویو اور کشمیر کے درپن ممتاز سمجھے جاتے تھے کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڑھ سے اردوئے معلیٰ نکالنا شروع کیا۔ ادبی رنگ تو اس کا جو کچھ ہوتا تھا اس کے ماسوا سیاسی چاشنی کی لذت بھی ہوتی تھی اور مضامین سنجیدہ اسلوب کا نمونہ تھے۔ میں اس کا خریدار ہوا اور دو ایک مضمون بھی اس میں لکھے۔ اس طرح سے حسرت موہانی سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میری ان کی پہلی ملاقات اچھی طرح یاد نہیں یا تو سورت کانگرس کے ہنگامہ کے موقع پر ۱۹۰۷ء میں سورت میں ہوئی یا ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ میں اور اس دوستانہ مراسم کا سلسلہ تقریباً بیس برس قائم رہا۔ مجھے ان کی ذات سے ایک قسم کا انس تھا کیونکہ میں ان کے خلوص اور سچائی، کسرِ نفس اور ایثار، دلیری اور جاں بازی، آزادی و بیباکی اور ان کی اولوالعزمی اور وطن پرستی کا دل سے قدر دان تھا۔ میرے دل میں ان کی شخصیت کے لیے جگہ تھی اور طرفہ مضمون یہ کہ میرے ان کے سیاسی خیالات اور مسلک میں زمین آسمان کا فرق تھا، شروع سے ہی وہ تلک کے پیرو تھے اور میں گوکھلے کا معتقد۔ خود کہہ گئے ہیں ؎

مغموم نہ ہو خاطرِ حسرت کہ تلک تک
پیغامِ وفا بادِ سحر لے کے گئی ہے

ایک جگہ اور کہا ہے :

تا زیست رہے دلی پر حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِ ذوالمنن

تلک کی موت کے ماتم میں بھی دو شعر ان کے کلام سے یادگار رہیں گے :

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہاراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک
جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں میں زور ان کا
اب رہ کے بہشت میں نزدِ خدا حوروں پہ کریں گے راج تلک

آج جبکہ زبانوں کے قفل ٹوٹ گئے ہیں، حکومت کا باغی بے جا بدنام و مطعون کرنا بلکہ اس کے خلاف زہر اگلنا بھی بچوں کا کھیل ہو گیا ہے۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے گلی کوچوں میں ہر کہہ و مہ کی زبان پر ہیں، سیاسی مظاہرے، ہنگامے، ہڑتالیں اور مرن برت بھی زندگی کا روزمرہ ہو رہا ہے، جیل جانا

---

[1] یہ مضمون حسرت کی وفات (۱۳ مئی ۱۹۵۱ء) کے فوراً بعد لکھا گیا تھا (ادارہ)

تو معمولی سی بات ہے۔ جس پر یہ چھپا نہیں لگا اس کے لیے تو پبلک لائف میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ جن لوگوں نے اس ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں اور اس فضا میں پرورش پائی ہے ان کے لیے اس کیفیت کا اندازہ کرنا جو اب سے تقریباً پچاس برس پہلے تک پر چھائی ہوئی تھی اور ان لوگوں کی اولوالعزمی اور جاں بازی کا اندازہ لگانا جنھوں نے سوتی ہوئی قوم کو جگایا آسان بات نہ ہوگی۔ میں اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب کانگرس کچھوے کی چال سے سوراج کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ نرم دل والے کانگرس میں برسراقتدار تھے۔ گرم دل کا شیرازہ اس وقت تک بندھا نہیں تھا۔ تقسیم بنگالہ نے بنگال میں البتہ شورش و ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور وہاں قوم بدحواس ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے جانبازی کے کرشمے دیکھنے میں آئے۔ مہاراشٹر میں تلک کی ذات سے گرم پارٹی کا بول بالا ہو رہا تھا اور لالہ لاجپت رائے کی شخصیت نے پنجاب میں کچھ ایسی ہل چل مچائی کہ انگریزی سرکار بدحواس ہونے لگی۔ مگر یوپی کے صوبہ میں امن وامان اور سکون تھا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، گنگا پرشاد ورما، بشن نرائن در، اور آخر میں موتی لال نہرو کانگرس کے لیڈر تھے۔ اور کانگرس اپنی پرانی چال سے خفتہ بیدار چلی جا رہی تھی، بالخصوص مسلمانوں میں کانگرس کے نام لیوا خال خال تھے جن کے نام انگلیوں پر گنائے جا سکتے تھے۔ لکھنؤ میں حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم مرزا سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ، نواب صادق علی خاں تعلقہ دار شیش محل اور بعد میں خواجہ عبدالمجید بیرسٹر علی گڈھ اور مرزا سمیع اللہ بیگ ایڈوکیٹ لکھنؤ کانگرس کے سربرآوردہ حامی تھے۔ ہاں ایک نام اور رہ گیا۔ یعنی حافظ عبدالرحیم وکیل علی گڑھ کا، جو بڑے پرانے کانگرس میں تھے اور آخر دم تک انھوں نے اپنی وضع کو نبھایا۔ یہ معدودے چند مسلمان تھے جو کانگرس کے نام لیوا تھے ورنہ تمام ملت علی گڑھ کی تحریک کی شریک تھی اور کانگرس کی مخالفت اس کا سیاسی عقیدہ وایمان، اس گدلی فضا میں حسرت موہانی نے آزادی کا چرچا دلیری وبیباکی سے شروع کیا اور کس طرح ؟

رسم جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے
دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ شرم و حجاب دیکھیے کب تک رہے
تابہ کجا ہو دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے
پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب سے
خلق خدا پر عذاب دیکھیے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بزیر نقاب دیکھیے کب تک رہے
دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے
ہے تو کچھ اکھڑا ہوا زور حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب دیکھیے کب تک رہے
حسرت آزاد پر جور غلامان وقت
از رہ بغض و عتاب دیکھیے کب تک رہے

اور یہ آواز اس صوبے میں اٹھی علی گڑھ سے لازم تھا کہ سرسید کی امت سراسیمہ اور پریشان ہو۔ اور ٹھیک بھی تھا۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی !

انگریزی سرکار نے موقع کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کیا اور حسرت کو جیل بھیج دیا۔ پبلک کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ مجھ پر اس حادثے کا پائیدار اثر ہوا اور میں حسرت موہانی کے دین اور عقیدۂ اولوالعزمی اور وطن پرستی کا قائل ہو گیا۔ اس وقت جیل میں جانا اور وہاں رہنا کوئی کھیل نہ تھا۔ خود کہہ گئے ہیں ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

دوسری بات جس نے حسرت کے کیرکٹر اور شخصیت کا قدرداں بنایا۔ ان کی آزادی نسواں کی حمایت تھی۔ وہ پردے کی رسم کے مخالف اور اس کے توڑنے کے حامی تھے۔ آج اس ترقی و آزادی کے زمانے میں بھی ہم میں سے سینکڑوں ایسے ہیں کہ جب مجمع عام میں آزادی نسواں کا ذکر آتا ہے تو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں اور جب کوئی ریزولیوشن پاس ہوتا ہے تو اونچے اونچے ہاتھ اٹھاتے ہیں لیکن ؎

چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

زبان سے کہنے اور عمل کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوا کرتا ہے۔ میں اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں جب نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی پردے کی رسم شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے یہاں بیویوں، بہوؤں اور بیٹیوں کو بالاخانوں پر جب ہی ہوا اور دھوپ دکھائی جاتی تھی جب پڑوس کے مرد پردے میں ہو جاتے تھے۔ پردے کی رسم کو توڑنا اور آزادی نسواں کی علانیہ حمایت کرنا تو دور رہا اس وقت تک تعلیم نسواں کا چرچا بھی اس صوبے میں اسی حد تک پھیلا تھا کہ مسلمانوں میں شیخ عبداللہ نے علی گڑھ سے رسالہ خاتون نکالنا شروع کیا تھا اور زنانے مدرسے کی بنیاد ڈالی تھی یا جسٹس سید کرامت حسین مرحوم نے نئی تعلیم کی حمایت میں کراس ویٹ کالج الٰہ آباد کو بنایا اور سنوارا تھا۔ میں نے آگرہ میں متوسط شریف مسلمان خاندان کے صرف ایک ہی شخص کو شام کے اندھیرے میں کھلی فٹن پر اپنے یہاں کی خاتونوں کو لے کر سیر و تفریح کی غرض سے کھلے پارکوں اور باغوں میں نکلتے دیکھا تھا اور ان کے چہرے بھی زیر نقاب ہوتے تھے۔ یعنی صاحبزادہ ڈاکٹر سید الظفر خاں۔ ممکن ہے کہ اس وقت اور بھی ایسے دو چار ہوں جو میری واقفیت میں نہیں۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان لوگوں کے لیے بھی جو بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے تھے اور جن کو فٹن اور موٹر میسر تھی پردہ توڑنا نسبتاً آسان نہیں تھا۔ لیکن گنجان شہر کے رہنے والے کے لیے جس کی زندگی عسرت سے گزرتی ہو

ایسا قدم آگے بڑھانا بڑے دل گردے کا کام تھا
حسرت پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ قدم آگے
بڑھایا تھا۔ انہیں کا ایک شعر ان کے اندازِ طبیعت
وخصلت کا پتہ دیتا ہے، کہہ گئے ہیں :

ہر چند کہ ہیں خلافِ جمہور نہیں
تقلیدِ عوام دل کو منظور نہیں

ان کی سلامتیِ عقیدہ و ایمان کا یہ بہت بڑا ثبوت تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو بیگم حسرت کی سی رفیقِ زندگی میسر آئی۔ جو حقیقی معنوں میں ان کی دمساز اور ساتھی تھیں۔ ان کی قید و مجبوری، مصیبت و عسرت میں انھوں نے نہایت حوصلہ اور خود داری سے زندگی بھر خندہ پیشانی سے ان کا ساتھ دیا۔

غالباً ۱۶ء یا ۱۷ء کی بات ہے کہ حسرت جیل میں بند تھے۔ کانگرس کے کام سے مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا وہاں اپنے احباب سے میں نے سنا کہ حسرت کے گھر والوں کی زندگی بڑی مصیبت اور عسرت سے گزر رہی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ میں بیگم حسرت موہانی سے ملوں۔ وہ میرے نام اور حسرت سے میرے مراسم سے یقیناً واقف تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کچے مکانوں کے ایک احاطے میں نیم کے درخت تلے ایک کچا پکا چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا نام بتایا۔ بیگم حسرت نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں جس میں ایک پرانی دری بچھی ہوئی تھی لے جاکر بٹھایا۔ اس زمانے میں بیگم حسرت اپنی بوڑھی اور بیمار ماں اور اپنی بچی کو ساتھ لے کر اس مکان میں رہتی تھیں۔ حسرت کے متعلق بات چیت ہوئی وہ جیل میں حسرت کا حال اور کیفیت مجھے بتاتی رہیں۔ حسرت تو جیل میں تھے لیکن ان کے گھر کے در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے دبی زبان میں کہا کہ اگر آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا انتظام کیا جائے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے لیے پبلک سے چندہ کیا جائے۔ میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں۔ آپ اس کی زحمت نہ گوارا کریں۔ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں کہ حسرت نے شعرا کے کئی دیوان چھپوائے تھے ان کا یہ ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اردوئے معلی بند ہو چکا یہ کاروبار بھی ابتر ہو گیا۔ اب یہ ڈھیر یہاں پڑا بیکار جگہ گھیر رہا ہے۔ اگر آپ ان دواوین کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کر سکیں تو البتہ کچھ سہولت ہو جائے گی۔ میں یہ کہہ کر کہ کوشش کروں گا، ان سے رخصت ہوا۔ لکھنؤ واپس آکر میں نے اپنے دوست بابو شیو پرشاد گپتا کو جو راجہ موتی چند مرحوم کے بھتیجے اور بنارس کے نامی رئیس تھے اس سب حال کی اطلاع کی۔ بابو شیو پرشاد گپتا علاوہ رئیس ہونے کے بڑے مخیر تھے۔ کئی لاکھ روپیہ انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے قائم ہونے میں صرف کیا تھا۔ کانگرس کے بڑے حامی تھے۔ اس کے لیے صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ حسرت کے مزاج اور طبیعت سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے مجھے پانچ سو روپے کا ایک فوراً بھیج دیا جو میں نے بیگم حسرت کو روانہ کر دیا۔ انھوں نے کتابوں کا پارسل مجھے بھیج دیا۔ یہ دواوین اور کتابیں عرصہ تک "ہندستانی" اخبار کے دفتر میں پڑی رہیں۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوئیں۔

ایک اور مرتبہ جب حسرت موہانی اپنے وطن موہان میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ میں ان سے وہاں ملنے گیا۔ تجویز یہ تھی کہ ایک میموریل گورنمنٹ کو بھیجا جائے جس پر صوبے کے تمام سربرآوردہ ہندو و مسلمان لیڈروں کے دستخط ہوں اس غرض سے کہ حسرت موہانی کو نظر بندی سے رہا کر دیا جائے دستخط تو ہو گئے اور میموریل تیار ہو گیا۔ لیکن یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں حسرت اس طرزِ عمل کو پسند نہ کریں تو یہ سب کوشش رائیگاں جائے۔ چنانچہ میں لکھنؤ سے موہان ان سے ملنے گیا اور گفتگو کی۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ جب تک میموریل میری طرف سے نہیں جاتا اور گورنمنٹ میری رہائی کے لیے کوئی شرطیں نہیں لگاتی مجھے آزاد ہونے میں انکار نہیں۔

اس موقع پر دوبارہ بیگم حسرت سے ملنے کا موقع ملا۔ مجھے بیگم حسرت سے ملنے کے یہی دو موقعے ہوئے کہ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے ذاتی اوصاف ان کے برتاؤ سے عیاں ہوتے تھے۔ میں نے جو ان کے اوصاف و فضائل اور کیرکٹر کا اندازہ لگایا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ صحیح تھا، اور وہ وطن پرستی ان میں بھی تھی کہ جیسے حسرت میں؛ ان کے خلقی رجحان کے علاوہ غالباً حسرت کی صحبت نے ان میں چار چاند لگائے تھے لیکن میرے خیال میں ان کو ایک بات میں حسرت پر فوقیت حاصل تھی۔ وہ دماغ والی عورت تھی اور ان کا دماغ حسرت کے مقابلے میں زیادہ سلجھا ہوا تھا۔ اور میرا اندازہ یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں حسرت پر کچھ نہ کچھ اثر ان کے اس وصف کا ضرور پڑتا رہا۔

تقریباً بیس برس حسرت کے اور میرے مراسم قائم رہے۔ کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا ہوگا کہ وہ لکھنؤ آئے ہوں اور بغیر مجھ سے ملے چلے گئے ہوں لیکن ۱۹۲۵ء کے بعد سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سیاسی فضا جب مکدر ہوئی اور فرقہ وارانہ جوش نے زور پکڑا تو حسرت نے بھی پولٹیکل کروٹ بدلی اور مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔ غالباً اسی زمانے سے ان میں مذہبیت کا جوش بھی بڑھنے لگا تھا۔ میں یقیناً تو نہیں کہہ سکتا مگر شاید یہی زمانہ تھا کہ بیگم حسرت علیل ہو کر قضا کر گئیں؛ میرے اور حسرت کے تعلقات کبھی ناگوار نہ ہوئے۔ لیکن وہ ملنے جلنے میں پہلو تہی کرنے لگے تھے۔ بس راہ چلتے میں صاحب سلامت ہو جاتی تھی۔ پانچ سات برس ہوئے کہ گنگا پرشاد میموریل ہال میں کسی جلسے کی شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ برآمدے میں کھڑے مل گئے۔ میں انھیں اپنے دفتر میں لے آیا اور بات چیت ہونے لگی۔ وہ مجھے یہ سمجھانے لگے کہ مسلم لیگ اور سوشلزم دونوں میں موافقت ہے اور فرقہ وارانہ سیاسیات کو کمیونزم کے ساتھ نباہا جاسکتا ہے۔ یہ میرے کسی طرح سمجھ میں نہ آیا۔

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

عبدالمجید سالک

مولانا حسرت موہانی

میں نے مولانا حسرت موہانی کا نام اور ان کے حالات پہلے پہل اس وقت سنے جب میری عمر چودہ سال کی تھی۔ یہ ۱۹۰۹ء کا ذکر ہے۔ مولانا نے علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کرنے کے بعد ایک ایسے پُرخطر راستے پر قدم رکھا جس کا تصور بھی اس زمانے کے کسی تعلیم یافتہ نوجوان کے متعلق نہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ نہایت آسانی سے ڈپٹی کلکٹر بن سکتے تھے۔ کوئی اچھا بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ کسی ریاست کے وزیر مقرر ہو سکتے تھے، لیکن حریت کیش حسرت نے آزادیٔ ہند کا سپاہی بننا پسند کیا۔

میاں بیوی ایک سانچے میں

مولانا سے بالمشافہ نیاز دسمبر ۱۹۱۹ء میں حاصل ہوا جب وہ امرتسر کے سیاسی اجتماعات کے سلسلے میں اسلامیہ ہائی اسکول امرتسر کی دوسری منزل پر دوسرے سیاسی کارکنوں کی معیت میں مقیم تھے۔ اور محترمہ نشاط النساء بیگم حسرت بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ مولانا کی غزلیں پڑھ پڑھ کر ان کی شکل صورت کے متعلق جو دلکش تصور قائم تھا وہ انھیں دیکھ کر بالکل کافور ہو گیا۔ سر پر ترکی ٹوپی جس کے کناروں پر ایک ایک انچ چیکٹ جما ہوا۔ گندمی رنگ، چہرے پر چیچک کے داغ، بکھری ہوئی بے ترتیب سی داڑھی کھدر کی شیروانی میلا پاجامہ، جوتے نے کبھی پالش کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ آواز کچھ باریک، کچھ بھرائی ہوئی۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں سادگی اور غربت کے مجسم نمونہ۔ یہی حالت بیگم کی تھی۔ وہ بھی ایک فقیر شوہر کی فقیر بیوی تھیں اور ایک نہایت خوش حال خاندان کی بیٹی ہونے کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کر رہی تھیں۔

لاہور میں عام طور پر شیخ مبارک علی تاجر کتب کے ہاں قیام فرماتے۔ یوں کہ وہاں انہیں سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے پورا آرام ملتا تھا۔ اور آرام نہ بھی ملتا تو وہ محسوس نہ کرتے، کیوں کہ جفاکشی اور قلتِ ضروریات ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ مولانا ٹرین سے اتر کر صبح سویرے شیخ مبارک علی کی دکان پر پہنچ گئے۔ دکان ابھی بند تھی اور نو بجے کھلنے والی تھی۔ مولانا نے اپنی بقچی بغل سے نکال کر دکان کی سیڑھیوں پر رکھی اور خود بھی وہیں بیٹھ گئے۔ گھنٹہ بھر کے بعد شیخ صاحب آئے۔ علیک سلیک کے بعد بغل گیر ہوئے اور کہا۔ مولانا آپ نے کمال کر دیا۔ پاس ہی تو گھر تھا وہاں آ جاتے۔ کہنے لگے اجی نہیں۔ میں نے کہا مبارک علی آخر یہیں آئے گا۔ سو یہیں بیٹھ گیا۔ گھر پر آ کر کیا کرتا۔

سفرِ انگلستان کے مصارف

انہی دنوں "زمیندار" کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ مولانا انگلستان سے واپس آئے تھے، اور عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہوئے وہاں کے حالات سنا رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ مولانا آپ کو غالباً اللہ نے چھپر پھاڑ کر بہت سی دولت دے دی ہے کیوں کہ آپ دو دفعہ انگلستان ہو آئے ہیں۔ کہنے لگے انگلستان جانے پر کون سی دولت خرچ ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔ آخر چند ہزار روپے تو صرف ہو ہی جاتے ہیں۔ کہنے لگے۔ میں تو چار سو روپے میں انگلستان چلا بھی جاتا ہوں، اور واپس بھی آ جاتا ہوں۔ عرض کیا۔ حضرت وہ ترکیب ہمیں بھی بتا دیجئے۔

کہنے لگے حساب لگائیے۔ لاہور سے کراچی تک تھرڈ کلاس کا کرایہ دس روپے (اس زمانے میں کرایہ یہی تھا) کراچی سے ساحلی جہاز کے عرشے پر خلیج فارس میں بصرہ پہنچ گئے۔ سینتیس روپے لگتے ہیں۔ وہاں سے لاری میں خانقین تک چند روپے خانقین سے "نیرن اوور لینڈ" کی بس میں بیٹھے یہ لوگ ایک پاؤنڈ فی مسافر کرایہ لیتے ہیں اور حیفا پہنچا دیتے ہیں، جو خانقین سے کوئی پانسو میل دور ہے اور بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہے۔ وہاں "خدیو میل" کے جہاز بحیرۂ روم میں آتے جاتے ہیں۔ چنانچہ کوئی پچاس روپے میں مارسیلز پہنچا دیتے ہیں۔ وہاں سے کیلے پہنچنے کے لئے ٹرین میں سوار ہوئے رودبار انگلستان پر جا پہنچے یہاں البتہ کچھ پیسے زیادہ خرچ ہو جاتے ہیں۔ لیکن لندن تک پہنچنے میں دو سو روپے سے زیادہ صرفہ نہیں ہوتا۔

حسرت لندن میں

فرمایا لندن میں اپنے بہت سے دوست بھی رہتے ہیں اور ہندوستان و پاکستان کے طلبا تو بے شمار ہی ہیں۔ میرے ورود کی اطلاع رائٹر نے اخباروں میں شائع کرائی۔ ریلوے اسٹیشن پر اپنے بے شمار اہلِ وطن موجود تھے۔ اخباروں کے نامہ نگاروں اور فوٹوگرافروں نے گھیر لیا اور دوسرے دن لندن کے ہر اخبار میں میرے حالات بالتصویر چھپ گئے۔ اس دن سے واپسی کے دن تک حرام ہے جو لڑکوں نے میرا ایک پیسہ بھی خرچ

ہونے دیا ہو۔ اور یہیں کھانا بھی کیا تھا۔ روٹی کے دو چار توس اور شوربا۔ باقی خرافات، خرافات جو انگریزی کھانے میں ہوتی ہے وہ مجھے پسند ہی نہیں۔ دو تین، مہینے لندن اور مضافات میں گھومے پھرے۔ سیاسی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں اور واپس آگئے۔

مولانا نے فرمایا کہ جن لوگوں کے پاس دولت وافر ہے وہ جو چاہیں کریں لیکن کم پیسے والوں کو چاہئے کہ آمد و رفت پر ڈیڑھ ڈھائی ہزار صرف کر کے لندن میں صرف ایک مہینہ قیام کرنے کے بجائے تیسرے طریقے سے کم خرچ سفر کریں اور لندن میں چھ مہینے رہیں۔ ٹامس کک کی تجوریاں بھرنے سے اپنا پیٹ بھرنا بہر حال بہتر ہے۔ مولانا کے سفر حج کی کیفیت بھی یہی تھی۔ وہ شروع سے آخر تک درجہ سوم میں سفر کرتے اور حجاز میں بھی موٹر لاری پرائیوٹ ہی کو ترجیح دیتے۔ یوں کوئی دوست اپنے صرف پر انہیں موٹر کار میں لے جائے وہ اور بات ہے۔

معجونِ مرکب

مولانا عقائد سیاسی و مذہبی کے اعتبار سے عجب معجونِ مرکب تھے۔ ان کا خلوص، ان کی صداقت ان کی جرأتِ اظہار، ان کی بلندی کردار کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ کانگرس میں تھے تو گاندھی جی سے چار قدم آگے ہی تھے۔ لیگ میں آئے تو حقوق مسلمین اور پاکستان اور آزادیٔ وطن کے مسائل پر جناح صاحب سے بھی لڑ پڑتے اور قائد اعظم اپنی ضد، اپنے قائدانہ ٹھاٹھ اور اپنی آمریت کے باوجود حسرت سے خم کھا جاتے۔ اور ان کے خلوص اور ان کی بزرگی کا بے حد احترام کرتے۔ حسرت ہمیشہ ہندوستان کی کامل آزادی کے علم بردار رہے۔ مسلمانوں کے حقوق کی حمایت میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھے اور پاکستان کے حصول کی کوششوں میں بھی برابر شریک رہے۔ دینی اعتبار سے نہایت پکے اور پابند شریعت مسلمان، طریقت کے شعبے میں پیکرِ صدق و صفا اور صاحبِ نسبت بزرگ اقتصادی لحاظ سے کیونزم کے ہمنوا۔ جذبات عاشقی کے اعتبار سے نہایت رنگین مزاج۔ غرض ان کے ذہن میں کئی خانے بنے ہوئے تھے، ہر چیز اپنے خانے میں پڑی رہتی تھی۔ اور دوسرے خانوں میں مداخلت نہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے ان سے ہنسی ہنسی میں کہا۔ مولانا۔ آپ کانگریسی، لیگی، صوفی، مولوی، عاشق مزاج کیونسٹ ہیں۔" بہت ہنسے اور کہنے لگے ایک دفعہ پھر تو کہنا کہ میں کیا کیا ہوں۔

کانپور کے براتی لاہور میں

پاکستان قائم ہونے کے بعد ۱۹۴۸ء کے موسم گرما کا ذکر ہے۔ ایک دن مولانا تین چار احباب کے ساتھ دفعتاً مسلم ٹاؤن میں میرے غریب خانے پر پہنچ گئے۔ بڑے تپاک سے ملاقات ہوئی۔ مولانا آپ یہاں کہاں، کیا پاکستان میں ہجرت کر آئے ہیں؟" اجی کہاں کی ہجرت ہندوستان میں اپنے کروڑوں بھائیوں کو چھوڑ کر محض اپنی جان بچانے کے لئے پاکستان بھاگ آنا پرلے درجے کی نامردی اور بزدلی ہے۔ میں تو وہیں ڈٹا ہوا ہوں اور وہیں رہوں اور وہیں مروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مجھے کوئی سر پھرا ہندو مار ڈالے گا پھر کیا ہے۔ آخر مرنا ہی ہے۔ شہادت کا رتبہ حاصل ہو تو اور کیا چاہئے۔ میں نے پوچھا آپ کیسے تشریف لائے۔ فرمایا۔ اجی وہ کانپور کے تاجر ہیں نا۔ حاجی محمد صدیق، ان کے لڑکے کی شادی یہاں ماڈل ٹاؤن کے ایک خاندان میں ہوئی ہے۔ برات کانپور سے ہوائی جہازوں پر آئی ہے۔ اور میں براتی ہوں۔ میں نے کہا سبحان اللہ۔ براتِ عاشقاں برشاخِ آہو۔

روس میں ہماری اکثریت

اس وقت مولانا ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں نظام دکن کی حمایت کر رہے تھے۔ میں نے کہا مولانا کسی کیونسٹ کو کسی ریاست کے والی کی حمایت کرتے نہیں دیکھا۔ یہ بھی آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ اس پر مولانا نے کہا۔ وہ جو آپ کہا کرتے ہیں کہ میں مسلمان اور کانگریسی اور لیگی اور صوفی اور عاشق مزاج، اور کیونسٹ ہوں۔ اس میں ایک چیز کا اور اضافہ کر لیجئے ہر مسئلہ اپنی جگہ ہے۔ کیونزم اپنی جگہ ہے اور مسلمانوں کی حمایت اپنی جگہ ہے۔ اس صحبت میں ایک بڑے مزے کی بات مولانا نے فرمائی کہ اگر پاکستان، افغانستان اور ایران بھی سوویت یونین میں شامل ہو جائیں اور تینوں ملکوں میں جمہوریہ شورائیہ اشتراکیہ کا نظام قائم ہو جائے تو روس میں ہماری اکثریت ہو جائے۔ میں نے کہا۔ ہماری سے کیا مراد ہے۔ کہنے لگے مسلمانوں کی۔ میں نے اس پر قہقہہ لگایا۔ کہنے لگے۔ آپ ہنستے کیوں ہیں۔ میں نے کہا اکثریت تو جمہوریت میں مؤثر ہوتی ہے ڈکٹیٹری میں کیسی اکثریت۔

میاں افتخار کی کوٹھی پر

پاکستان میں مولانا کی آخری تشریف آوری اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ جب وہ اپنے بارہویں حج سے واپس آئے تھے۔ چند روز کراچی میں رہے۔ افسوس ہے کہ خداوندان حکومت اور اکابر شہر نے ان کی شایانِ شان پذیرائی میں غفلت کی۔ مولانا کو تو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن ان کے عقیدت مندوں کو صدمہ ہوا۔ جب مولانا نے کراچی سے لاہور کا عزم کیا تو میاں افتخار الدین نے وہیں سے لاہور اپنے کارکنانِ اخبارات کو ٹیلیفون کر کے ہدایت کی کہ مولانا کو ریلوے اسٹیشن سے سیدھے میری کوٹھی لے جاؤ اور ان کے قیام اور آسائش کا بندوبست کرو۔ دوسرے دن مسٹر احمد بشیر اور دوسرے نوجوان ریلوے اسٹیشن پر پہنچے انہوں نے مولانا کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ انہیں اول و دوم درجوں میں تلاش کر رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے بتایا کہ وہ مولانا جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تیسرے درجے سے اترے ہیں اور حسبِ معمول بقچی اور ڈبا بغل میں دبائے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے مولانا کو جا لیا اور موٹر میں بٹھا کر میاں صاحب کی کوٹھی پر لے گئے

تھوڑی دیر میں مجھے میاں صاحب کی کوٹھی سے ٹیلیفون آیا کہ مولانا حسرت آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ٹیلیفون ان کو دیجئے۔ مولانا سے بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا آپ یہاں چلے آئیے۔ کہنے لگے کیا کروں۔ یہ لڑکے گھسیٹ لائے ہیں۔ آپ آئیے تو باتیں ہوں گی۔ میں اور مہر صاحب اسی وقت

خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ ایک پُرتکلف بیڈ روم میں قالین اور صوفے بچھے ہوئے ہیں۔ اور مولانا اپنے مخصوص انداز و لباس میں بستر کی پٹی پر یوں بیٹھے ہیں جیسے اڑنے پر کبوتر بیٹھا ہو۔ خیر باتیں ہوئیں۔ اور مجھے یہ دیکھ کر بہت تشویش ہوئی کہ مولانا نہایت لاغر ہو رہے ہیں۔ میں نے ... صاحب سے کہا کہ مولانا تو دوہرے بدن کے آدمی تھے۔ ان کو کیا ہو گیا۔ انہوں نے کہا عمر کا تقاضا ہے۔ میں نے کہا۔ مجھے تو اب یہ زیادہ زندہ رہتے نظر نہیں آتے۔ خدا خیر کرے۔

ہم ملاقات کر کے واپس آ گئے۔ دوپہر کو جب میں شہر گیا تو کسی کام کے لئے امروز میں مولانا چراغ حسن حسرت سے ملنے کے لئے اتر گیا۔ وہاں مولانا حسرت موہانی اپنے ہم تخلص کے ساتھ گپ زنی میں مصروف تھے۔ میں پہنچا تو کہنے لگے آپ خوب آئے۔ چلیئے اب مجھے شیخ مبارک علی کے ہاں پہنچا دیجئے۔ میں تو میاں افتخار کی کوٹھی کے شاہی ساز و سامان سے گھبرا گیا۔ اپنی بقچی اٹھا کے بھاگ آیا ہوں۔ میں نے مولانا کو شیخ صاحب کے ہاں پہنچا دیا جہاں وہ نہایت مسرور اور منحلیٰ بالطبع ہو کر دوستوں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

یونیورسٹی ہال میں ایک جلسہ ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مولانا کا کلام سنا جائے لیکن وہاں مولانا نے شاعری کی مختلف قسموں (عاشقانہ۔ فاسقانہ، عارفانہ، مضحکانہ اور خدا جانے کیا کیا) پر تقریر شروع کر دی۔ جس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ لیکن ان کی بزرگی کے لحاظ سے حاضرین نے نہایت احترام سے ان کی باتیں سنیں اور جلسہ ختم ہوا۔

۱۲ر مئی ۱۹۵۲ء کو یہ خبر اہل ذوق پر بجلی کی طرح گری کہ شہنشاہِ تغزل سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ۷۷ سال عمر پائی۔ اللہ مغفرت کرے۔

(مقتبس از یاران کہن)

بقیہ

مشاہداتِ زنداں

پر رہائی کی تاریخ کچھ روز پہلے متعین کر کے درج کر دی جاتی ہے جس کے لئے قیدی خاص کر سپرنٹنڈنٹ کے روبرو طلب کیا جاتا ہے اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ صاحب ازراہِ کرم کبھی کبھی قیدیوں کو دو چار دن کی رہائی اپنی طرف سے مرحمت فرمایا کرتے ہیں۔ راقم حروف کو یوں کہ شروع ہی سے کسی قسم کی رعایت نہ ملی تھی اس موقع پر بھی دوسرے معمولی قیدیوں کی طرح سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لطف و کرم کی بدولت تاریخ مقررہ سے قبل رہا ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے خلاف معمول مجھے طلب کئے بغیر حساب کر کے ۳ر جولائی ۱۹ء تاریخ رہائی مقرر کر دی جس سے ... خیال کی پوری پوری تصدیق ہو گئی۔

راقم حروف کو بزرگانِ دین کی عقیدت کے ساتھ جو فطری اُنس ہے اس کی بدولت زندانِ فرنگ میں جیسی کچھ قلبی قوت اور روحانی آزادی اور اطمینان میسر رہا اور ضمناً جو باطنی فیض حاصل ہوئے الفاظ کے ذریعہ سے ان کی حقیقت صحیح طور پر نہ بیان ہو سکتی ہے نہ ان کے ذکر کا یہ محل ہے اس لئے ان سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ البتہ آخر زمانۂ قید کا ایک ایسا واقعہ جس کے اظہار میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے ... کا عرس شریف ماہ جمادی الثانی کی درمیانی تاریخوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹ء میں یہ تاریخیں ماہ جولائی کی ابتدائی تاریخوں سے مطابق واقع ہوئی تھیں، اتفاق سے میں نے ایک روز سوتے وقت حساب کیا تو معلوم ہوا کہ میری رہائی کا دن ٹھیک اسی تاریخ کو مقرر ہوا ہے جو عرس شریف کا آخری روز ہو گا۔ مجھ کو چونکہ حاضری عرس حضرت شیخ العالم سے سعادت اندوز اور فیض پذیر ہونے کا اکثر اتفاق ہو چکا۔ اس لئے بے اختیار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر رہائی کی تاریخ دو یا ایک روز بھی قریب ہوتی تو شرکت عرس کا موقع مل سکتا تھا لیکن تاریخ کے ٹکٹ پر درج ہو جانے کے بعد دوبارہ تبدیل ہو سکنے کا اس وقت میرے دل میں وہم و گمان بھی نہ تھا۔

پھر بھی صبح اٹھنے پر سب سے پہلی بات جو مجھ کو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے غیر معمولی طور پر دفتر کے بجائے ... تکلیف میں طلب کیا ہے۔ ... تکلیف میں پہنچ کر منشی صاحب سے معلوم ہوا۔ صاحب بہادر میرے استقلال اور نیک چلنی سے بہت خوش ہیں اور ... اپنے اختیارات خاص ... مقررہ سے کچھ قبل ہی مجھے رہا کر دیں گے۔ اس مژدۂ جاں فزا کے سننے سے مجھ کو بھی بہت مسرت ہوئی اور یقین ہو گیا کہ شب گذشتہ کی آرزو اب ضرور پوری ہو گی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی حکم دیا کہ ہم ان کو پندرہ دن کی رہائی اپنی جانب سے دیتے ہیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور میں تاریخ مقررہ سے پندرہ روز قبل رہا ہو کر شام تک الٰہ آباد میں ... مکان روانہ ہوا اور وہاں دو ... دن قیام کرنے کے بعد باطمینان تمام ردولی روانہ ہوا۔ ممکن ہے لوگ اس واقعہ کو حسن اتفاق پر محمول کریں۔ لیکن راقم کے نزدیک یہ سب کچھ شیخ العالم حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی تصرف اور توجہ کا نتیجہ تھا۔

بقیہ

حسرت کی خصوصیاتِ شاعری

یہاں ضرور پائے جاتے ہیں لیکن یہ ان کا اصل رنگ نہیں ہے۔

حسرت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جو شعر میں بحوں اختیار کی ہیں وہ بہت مترنم ہیں اور فنی کمال کے اظہار کے لئے شکستہ یا زحافات والی زمینیں اختیار نہیں کیں لیکن ان تمام خصوصیات میں ان کے لہجہ کا حد درجہ نرم و شیریں ہونا وہ خصوصی عنصر ہے جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کی بنا پر ان کو رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے۔

پھر اسی لطفِ ستم کوش کا مشتاق ہے دل
ہم نے جس لطف کو ہم سنگِ جفا دیکھا تھا

کرشن بلدیو شرما

مولانا حسرت موہانی

۱۹۴۸ء کی بات ہے، ہندوستان کے آئین کے مسودے پر غور کیا جا رہا تھا۔ سردیوں کے دن تھے اور دسمبر کی دوسری تاریخ۔ جونہی چودھری رنبیر سنگھ نے تقریر ختم کی آئین ساز اسمبلی کے نائب صدر ڈاکٹر ایچ، سی، مکھرجی نے اپنی فہرست دیکھ کر اگلے مقرر کو اظہارِ رائے کی دعوت دیتے ہوئے نام پکارا، "مولانا حسرت موہانی"۔

نام سنتے ہی ممبروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے تالیاں بجا کر مولانا کا خیر مقدم کیا۔

یہ دیکھ کر ڈاکٹر مکھرجی نے فرمایا:

"مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ یہ ایوان اس ملک کے تئیں مولانا حسرت موہانی کی عظیم الشان خدمات کو بھولا نہیں ہے موصوف پہلے شخص تھے جنہوں نے مادرِ وطن کے لیے آزادیٔ کامل کا مطالبہ کیا تھا۔"

اور پھر ممبروں نے دیکھا کہ نہایت سادہ کپڑوں میں ملبوس اس منحنی سے باریش بزرگ نے بید سٹرک ہو کر عمدہ تقریر کی۔ مولانا حسرت موہانی کو ڈاکٹر امبیدکر کا پیش کردہ آئین کا مسوّدہ پسند نہیں آیا تھا اور وہ یہی مطالبہ کر رہے تھے کہ آزاد ہندوستان کا آئین تیار کرنے کے لیے مخلوط رائے دہندگی اور فرقہ پرست پارٹیوں کے بجائے سیاسی پارٹیوں کی بنا پر انتخابات کرائے جائیں۔ اُن دنوں کے حالات میں کسی کو مولانا کا یہ مطالبہ منظور نہ تھا اور حالات سے سمجھوتہ کر لینا یا کلمۂ حق کہنے سے گریز کرنا مولانا کی عادت میں شامل نہ تھا چنانچہ حسرت واحد ممبرِ اسمبلی تھے جنہوں نے وقت آنے پر منظور شدہ آئین پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یہ تھی اس مردِ قلندر کی شان جس نے موٹا جھوٹا پہن کر اور نانِ جویں پر گذارا کر کے ساری عمر بتا دی لیکن کسی کے آگے سر جھکایا نہ دستِ سوال دراز کیا۔

قلندر کی تعریف اقبال نے اپنے کلام میں جا بجا کی ہے۔ ادھر سر ونسٹن چرچل نے بھی اپنی ایک تحریر میں فقر و قلندری کی جو تعریف کی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ چرچل کہتے ہیں کہ قلندر زندگی کے آرام و آسائش اور مال و دولت سے بے نیاز ہوتا ہے۔ چنانچہ جو شخص گھر بار، روپے پیسے جاہ و حشم، طبل و علم اور ملک و مال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا ہو، قدرتی امر ہے کہ دنیا اس سے خوف کھائے اور جان لے کہ یہ ایک ایسا انسان ہے جو اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے اور اسے دنیوی لالچ دینا بیکارِ محض ہوگا۔" یہ نہیں سکتے کہ چرچل کو اپنی زندگی میں کسی قلند واسطہ پڑا کہ نہیں، کاش کہ وہ حسرت دیکھ لیتے جو فقر و استغنا کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ حسرت کو دیکھ کر چرچل مجسم قلندر کو دیکھ

مولانا کے ایک مداح حسن ندی فرماتے ہیں "مولانا کی طرزِ زندگی اور شخصیت نے مفلسی و ناداری کا سر ہمیشہ اونچا رکھا۔ اوں میں معمولی چپل، سر پر معمولی سی ٹوپی بدن پر معمولی سا لباس۔ کوئی معمولی سے معمولی آدمی بھی ان کے پہلو میں کھڑا ہو جاتا تو کبھی اپنے آپ کو معمولی نہ سمجھتا اور بڑی تسکین پاتا۔ وہ اپنی اسی وضع قطع میں پیدل ہی کسی اجلاس میں پہنچ جاتے تو بڑے بڑے رہنما اور رؤسا ان کو دیکھتے ہی سرو قد کھڑے ہو جاتے جیسے ان سے بڑا دنیا میں کوئی نہ ہو۔ یہ عظمتِ فقرِ غیور تھی۔"

شورش کاشمیری اور احراری لیڈر میاں فیروز الدین حسرت سے ملنے کانپور گئے تو دیکھا کہ ان کا مکان کیا تھا کلبۂ درویش تھا نہ کوئی ڈرائنگ روم نہ مہمان خانہ۔ حسرت مہمانوں سے بڑے تپاک سے ملے۔ سامنے ایک مسجد تھی وہاں لے گئے، بٹھایا اور کوئی بات پوچھنے سے

پہلے فرمایا "اتنی دور سے آئے ہو، پہلے کھانا کھاؤ پھر بات کرتے ہیں"۔ گھر میں گئے اور تھوڑی دیر بعد ایک چنگیر سر پر اٹھائے تشریف لائے اور مہمانوں کے سامنے رکھ دی۔ مسجد سے مٹی کے لوٹے میں کنوئیں کا پانی بھرا۔ شورش لکھتے ہیں "چنگیر سے کپڑا اٹھایا، آلو گوشت تھا، دال تھی چٹنی تھی اور روٹیوں کا ڈھیر تھا۔ مٹی کے تین آبخورے حجرے سے لیے، بسم اللہ کی۔ خود بھی شریک ہوئے کھانا سیر ہو کر کھایا"۔

اب ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے۔ ایک مرتبہ کانپور کے ایک سوداگر چوب جو حسرت کے نیازمند تھے، ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ مولانا کچھ تحریر فرما رہے ہیں (غالباً شرح دیوانِ غالب لکھ رہے تھے)۔ یہ سلام کرنے کے بعد شکستہ بورئیے پر جو مولانا کے ڈیسک کے سامنے بچھا تھا بصد ادب بیٹھ گئے۔ مولانا لکھتے بھی جاتے تھے اور گفتگو بھی فرماتے جاتے تھے۔ پشت پر ایک پھٹا پرانا پردہ لٹک رہا تھا، مولانا پردے کے پیچھے سے کچھ نکالتے اور منہ میں رکھ لیتے اور گڑ کی ڈلی سے تھوڑا سا گڑ کھا لیتے۔ سوداگر چوب خاموشی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ جب ضبط نہ ہوا تو عرض کی کہ آپ کیا کھا لیتے ہیں کچھ خادم کو بھی عطا ہو۔ مولانا نے پردے کے پیچھے سے مٹی کا ہنڈا نکال لیا جس میں سوکھی روٹیاں تھیں پانی میں بھیگی ہوئی۔ گڑ کی ڈلی بھی ڈیسک پر رکھ دی اور فرمایا "لو کھاؤ۔ فقیروں کا کھانا تم رئیس نہ کھا سکو گے"۔ سوداگر آبدیدہ ہو گئے۔ مولانا نے فرمایا "آج تیسرا فاقہ ہے شکر ہے سوکھی روٹی میسر آگئی۔ بڑی تسکین ہو گئی"۔

سچ ہے:

جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

حسرت جنگِ آزادی کے ان لیڈروں میں سے تھے جن کے پاس نہ بنگلہ تھا، نہ بینک بیلنس۔ ان کی زندگی میں بس نمازیں، روزے اور حج تھا۔ زکوٰۃ کا تو ذکر ہی کیا وہ کبھی صاحبِ نصاب ہوئے ہی نہیں

بیگم حسرت ایک خط میں فرماتی ہیں "کل دوپہر کو پولیس نے یکایک حسرت کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ بعد کو مکان اور دوکان کی تلاشی لی۔ لیکن اللہ کے فضل سے کچھ تھا ہی نہیں، کیا نکلتا"۔ پنڈت لشن پرشاد کول بیگم حسرت سے ملنے علیگڑھ گئے، بقول ان کے حسرت کے گھر میں ہر طرف حسرت کا دور دورہ تھا۔

مولانا آزاد نے اس زمانے کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

"حسرت موہانی جب قید سے رہا ہو کر آیا تو کوئی چیز اس کے لئے دنیا میں ایسی باقی نہ تھی جو ذریعۂ معاش ہوتی۔ ڈیڑھ دو روپیہ ماہوار کا ایک جھونپڑا ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی صحنچی اور کوٹھری ہے اور باہر بھی اتنی ہی مکانیت ہے۔ اندر وہ فقیر حسرت اپنی کوہِ عزم و ثبات بیوی کے ساتھ رہتا ہے اور باہر کاٹھ کا دستی پریس اور دو چار پتھر ہیں۔ لیکن حسرت اور بیگم حسرت اپنی دھن میں مگن زندگی کی شاہراہ طے کرتے رہے یہاں تک کہ مولانا کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاری ۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو عمل میں آئی اور مسلسل دو سال جاری رہی۔ یہ سارا دور بیگم حسرت موہانی کے لئے صبر آزما اور حوصلہ شکن تھا لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری"۔

مولانا آزاد نے بیگم حسرت کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "مولانا حسرت نے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں اب تک خالی نہیں ہوئیں"۔

مجاہدِ آزادی حسرت موہانی ان پہلے اشخاص میں سے تھے جو اس صدی کے آغاز میں آزادی کی خاطر جیل گئے۔ ۱۹۰۸ء میں ان کے پرچے میں حکومت برطانیہ کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا جس پر صاحبِ مضمون کا نام درج نہیں تھا حسرت نے مضمون نگار کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں انھیں دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ حسرت زمانۂ طالب علمی ہی سے انگریزوں کے خلاف تھے۔ سید سجاد حیدر یلدرم کا قول ہے کہ ایک مرتبہ علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم نے کسی انگریز کلب سے میچ جیت لیا۔ پھر کیا تھا یونیورسٹی کے طلبا تھالیاں، لوٹے، گلاس، کھانے کی سینیاں بجا بجا کر رات کی تاریکی میں شورِ محشر برپا کرتے رہے۔ حسرت جنہوں نے اپنی زندگی میں بیٹ چھوا تھا نہ گیند پھینکا تھا، شور سنتے ہی ایک شکستہ حال کنستر لیے ہوئے کمرے سے نکلے اور تیل کو حوالۂ خاک کر کے سب سے آگے آگے اسے بجاتے پروفیسروں حتیٰ کہ نواب محسن الملک کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا نام فردِ سیاہ میں لکھ لیا گیا۔

کانگریس میں حسرت بال گنگادھر تلک کے شاگرد تھے جن کا نعرہ تھا کہ "سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے"۔ حسرت نے تلک کی موت پر جو شعر کہے وہ ایک کٹر ہندوستانی ہی کہہ سکتا ہے،

ماتم ہو نہ کیوں بھارت میں بپا دنیا سے سدھارے آج تلک
بلونت تلک، مہراج تلک آزادی کے سرتاج تلک
اب جا کے بہشت میں نزدِ خدا حوروں پہ کریں گے راج تلک

مولانا حسرت کو ہمیشہ انتہا پسند سمجھا جاتا رہا۔ کچھ تو اس لئے کہ وہ تلک کے شاگرد تھے جو اعتدال پسندوں کے مقابلہ میں انتہا پسندوں کے سربراہ تھے اور کچھ اس لئے کہ حق گوئی ہمیشہ انتہا پسندی ہی نظر آیا کرتی ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے کانگریس اجلاس میں مکمل آزادی کا ریزولیوشن پیش کیا تھا جو نامنظور کر دیا گیا۔ لیکن اپنے اس عمل سے انہوں نے ملک کو صحیح راستے کی نشاندہی کر دی اس طرح وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مسلمانوں میں سودیشی کی تحریک چلائی اور خود سودیشی کپڑے کی

دکان کھولی۔ ادھر بیگم حسرت نے پردہ ترک کر دیا اور شوہر کے دوش بدوش کام کرنے لگیں۔ اپنی اصول پرستی اور آزادیٔ وطن کی خاطر حسرت کی جوانی قیدِ فرنگ کی نذر ہوئی۔ انہوں نے اپنی بیڑیوں کے ساتھ ہر روز ایک من اناج بھی پیسا اور شعر و شاعری سے دل بھی بہلایا۔ ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ان کا عقیدہ تھا کہ حق پرست انسان کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کا عادی ہونا چاہیے۔ ان کی سیرت ان کے اس شعر سے واضح ہو جاتی ہے: ؎

جان کو محوِ غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر

ایک موقع پر مولانا کے خیر خواہ چاہتے تھے کہ قید میں ان کی علالت کے پیشِ نظر حکومت انھیں رہا کر دے۔ لیکن حکومت کی پیش کردہ شرائط حسرت کے لئے قابل قبول نہیں تھیں چنانچہ رہا ہونے سے انکار کر دیا:

فکرِ احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال
اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی

اس ضمن میں بیگم حسرت کا رویہ بھی قابلِ رشک ہے۔ انہوں نے کہا کہ "نظر بندی سے قید بہرحال بہتر ہے۔ حسرت نے خوب کیا۔ مجھے ان سے ایسی ہی امید تھی"۔ یہ رائے کسی خوش حال گھرانے کی عورت کی نہیں، بیگم حسرت کی تھی جو مولانا کے ہمراہ نمک روٹی کھا کر اور اجرت پر سلائی کر کر اور چکی پیس کر گذر اوقات کرتی تھیں۔ ان کے صبر و استقلال اور حرارت ایمانی کو دیکھ کر مولانا کو خود کہنا پڑا تھا کہ "اگر بیگم حسرت، بیگم آزاد اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے، مولانا ابوالکلام آزاد الہلال و البلاغ نکالتے رہتے اور جواہر لعل زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے۔ یہ عورتیں وفا پرست اور ایثار مجسم تھیں۔ انہوں نے جان دیدی مگر ہم سے کبھی یہ نہ پوچھا کہ ظالمو سیاست کے پرستارو! تم تو جیل جا رہے ہو ہمارا کیا ہوگا؟"

۱۹۲۷ء میں بیگم حسرت کے انتقال پر انہوں نے نہایت پُر درد غزلیں کہی تھیں: ؎

سرمۂ چشمِ عیش تھی بخدا
خاک تیرے غریب خانے کی
غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس
دل کسی اور سے لگانے کی
مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے تجھے
سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ دل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق
توڑ دوں کنجیاں خزانے کی
ان کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرت
دل فریبی ترے فسانے کی

یا پھر ؎

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

اگر انھیں فراغت ہوتی تو وہ اور بہت کچھ بھی لکھتے۔ ڈاکٹر امرناتھ جھا نے ٹھیک کہا تھا کہ "مولانا حسرت موہانی نے ادب کا حصہ سیاست کی نذر کر دیا"۔ انھیں تصوف سے گہرا لگاؤ تھا اور بزرگان دین سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ کرشن جی کو خدا کا پیغمبر مانتے تھے اور زیارت کے لئے متھرا جایا کرتے تھے۔

حسرت ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ حسرت جیسا قلندر، حسرت جیسا مجاہد اور حسرت جیسا شاعر کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ اقبال کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ؎

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

حسرت موہانی کی شخصیت

انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کچھ عرصہ ہوا انھوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ مجھے یہ سن کر تعجب اور افسوس ہوا۔ یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی۔

حسرت کے کیرکٹر کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے عقیدے اور ایمان کے سچے تھے، جو کچھ یقین کرتے تھے اس پر عمل کرنے سے دریغ نہ تھا۔ دنیا کی بڑی سے بڑی کوئی قوت بھی ان کے قدم راہِ عمل سے ڈگمگا نہیں سکتی۔ یہ بڑے آدمیوں کا جوہر ہوتا ہے البتہ ان میں دو اوصاف کی کمی تھی اول تو دماغی توازن اور عملی تدبر ان میں بالکل نہ تھا۔ اس کے علاوہ بڑے آدمیوں میں جو دوسروں کو اپنے طرف کھینچنے کی ایک کیفیت ہوتی ہے وہ بھی ان میں نہ تھی۔ اگر یہ دونوں وصف ان میں اور ہوتے تو یقیناً ان کا شمار ہندوستان کے بہت بڑے آدمیوں میں ہوتا۔ حسرت نے اپنی زندگی کا نصف حصہ وطن کی خدمت میں جاں نثاری سے گزارا اور نصف حصہ اپنی ملت کی پرجوش حمایت و خدمت میں، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جو قدر ملک و ملت کو ان کی کرنی چاہیے تھی دونوں میں سے کسی نے نہ کی۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ حسرت اپنا ڈھنڈورا آپ پیٹنا نہیں چاہتے تھے کہ جو آج کل کے زمانہ کا رنگ اور خاصہ ہے۔ خیر اب تو وہ یادگار ہستی دنیا سے اٹھ گئی۔ کچھ باتیں اس ذات سے منسوب دھیان میں رہ گئی ہیں، ان کے دہرانے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ البتہ حسرت کا نام ہماری اردو کی ادبی دنیا میں ایک درخشندہ ستارہ کی طرح مدت تک چمکتا رہے گا۔ رہا ان کی موت کا ماتم سو انھیں کے شعر کو بار بار دہرا لیجئے اور دل بھر کر کیجئے:

شاید جہاں سے حسرت دیوانہ چل بسا
ہاں ہاں جبھی تو چشم جنوں اشکبار ہے

(بشکریہ قومی آواز لکھنؤ)

نیاز فتح پوری



حسرت کی خصوصیاتِ شاعری

حسرت کی یہ خصوصیت کہ انھوں نے غزل کے سوا کسی اور صنف سخن کی طرف مطلق توجہ نہیں کی بہت کم کسی دوسرے شاعر میں پائی جاتی ہے اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ حسرت اپنی فطرت کے لحاظ سے بڑے یک رنگ واقع ہوئے تھے اور چونکہ یہ سلسلۂ شعر و سخن غزل سے ان کو زیادہ مناسبت تھی اس لیے وہ اسی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی فطرت کی جھلک ہم کو ان کی سیاسی زندگی میں بھی ملتی ہے۔

حسرت نے غزل گوئی میں جو شہرت حاصل کی وہ نتیجہ مشق و مزاولت کا نہ تھا بلکہ صرف جذبات کے اقتضار کا۔ چنانچہ اسی لیے ان کی بہترین غزلیں اس وقت کی ہیں جب ان کے جذبات جوان تھے اور آخیر عمر کی غزلیں حالانکہ انتہائے مشق سخن کے زمانہ میں لکھی گئی تھیں اکثر بے آب و رنگ ہیں۔ مثلاً ان کی سب سے پہلی غزل لیجیے جو ۱۸۹۳ء میں (جبکہ ان کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی) لکھی گئی:۔

میں سمجھا تھا قیامت ہو گئی
خیر پھر صاحب سلامت ہو گئی

مسجدوں میں کون جائے واعظا
اب تو اک بت سے ارادت ہو گئی

جب میں جانوں دل میں بھی آؤں نہ یاد
گرچہ ظاہر میں عداوت ہو گئی

ان کو کب معلوم تھی طرزِ جفا
غیر کی صحبت قیامت ہو گئی

عشق نے ان کو سکھا دی شاعری
اب تو اچھی فکر حسرت ہو گئی

اس غزل کے ہر شعر سے ان کی طفلانہ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ اس غزل میں سوا اس کے کہ کوئی شعر وزن سے خارج نہیں اور زبان بہت سہل و سادہ ہے۔ دوسری کوئی خصوصیت نہ پائی جاتی، اور معلوم ہوتا ہے کہ عشق، جفا، عداوت وغیرہ کا ذکر محض روایتی و رسمی طور پر کیا گیا ہے۔ اور کہنے والے کو ان کا صحیح احساس و ادراک نہیں ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حسرت کی شاعری کی بنیاد تو پڑ گئی تھی لیکن اس بنیاد پر عمارت کیسی تیار ہونا تھی، اس کا علم غالباً خود ان کو بھی نہ تھا اس کا حال اس وقت کھلا جب چند سال تک اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنے عنفوان شباب کے جذبات اس طرح پیش کیے:۔

مجھے ہو خواہشِ بالِ ہما کیا
نہیں میں ان کے کوچہ کا گدا کیا

جو آتا ہے تو آئے بے تکلف
یہ عرضِ جلوۂ حیرت فزا کیا

دلِ وقفِ الم ہاں پھر تو کہنا
وہ رنج ہجر کا ہے ماجرا کیا

نہ ہو مجھ سا کوئی محوِ تمنا
ہوا کرتی ہیں باتیں دل سے کیا کیا

اس غزل نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ ان کا ذوق انھیں مومن و مصحفی کی طرف کھینچے لیا جا رہا تھا اور آخر کار انھیں کے رنگِ تغزل کو انھوں نے اپنے لیے پسند کر لیا۔ لیکن باوجود اس کے کہ اس غزل میں جلوۂ حیرت فزا، خواہشِ بالِ ہما، دلِ وقفِ الم، مومن کی سی ترکیبیں موجود ہیں اور چوتھے شعر میں مصحفی کا سا اندازِ بیاں بھی پایا جاتا ہے، لیکن سوز و گداز سے ملی ہوئی عشق و محبت کی وہ کیفیت جو رچے ہوئے رنگ تغزل کے لیے ضروری ہے اس میں آپ کو نہ ملے گی، بیان میں جوش ہے، لب و لہجہ میں ولولہ ہے، محبوب سے بات کرنے کا ایک خاص تیور ہے، لیکن محبت کی کسک نیاز عشق کی سپردگی یا راز و نیاز کی وہ باتیں جو دل کے زخمی ہونے کے بعد کی جاتی ہیں۔ اس

غزل میں نہیں پائی جاتیں۔

یہ غزل حسرت نے سنہ ۹۹ء میں کہی تھی جب ان کی عمر ۱۸۔۱۹ سال کی تھی اور ان کی تعلیم کالج کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ اس غزل سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک وہ جذباتِ محبت سے آشنا ہو چکے تھے لیکن کوئی ایسا چرکا نہ کھایا تھا جو انسان کو خون رونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ سعادت انھیں کبھی نصیب نہیں ہوئی اور اسی لیے ان یہ تمنا کہ "میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں" کبھی پوری نہ ہو سکی تاہم ان کی شاعری معاملات حسن و عشق اور جذبات دونوں حیثیتوں سے ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ تین چار سال کے اندر ہی ان کے تغزل میں ایک خاص ٹھہراؤ پیدا ہو گیا اور کچھ ایسی باتیں بھی ان کے قلم سے نکلنے لگیں جو ہر چند "پختہ مغزان جنوں" کی دنیا سے تو تعلق نہ رکھتی تھیں۔ لیکن "شیوۂ کار اگہی" ضرور ان سے ظاہر ہوتا تھا۔ ؎

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا
رونق پیرہن ہوئی خوبی جسم نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ تیرے لباس کا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
نہاں شانِ تغافل میں ہے رمز امتیاز اس کا
بہ انداز جفا ہے التفات دلنواز اس کا
غلط ہے شکوۂ سنجی میرے عشق ناشکیبا کی
بجا کرتا ہے جو کرتا ہے حسن بے نیاز اس کا
چھیڑا پا دم زدن میں دل کو فکر شادی و غم سے
قیامت پر اثر تھا جلوۂ حیرت نواز اس کا
دیار شوق میں ماتم بپا ہے مرگ حسرت کا
وہ وضع پارسا اس کی وہ عشق پاکباز اس کا

ان اشعار سے آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ حسرت کے تغزل میں عمر کے پچیسویں سال تک کافی پختگی پیدا ہو گئی تھی لیکن پختگی سے زیادہ اہم چیز انداز بیان کی شگفتگی و شیرینی تھی۔ ہر چند حسرت کا یہ رنگ زندان افرنگ میں جانے سے پہلے ہی اپنا ایک خاص اسلوب قائم کر چکا تھا، لیکن اس کو پختگی حاصل ہوئی سنہ اور سنہ ۹ میں جب وہ قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے اور یہ رنگ ان کا کم و بیش ۸۔۱۰ سال تک قائم رہا۔ اس کے بعد اس میں انحطاط شروع ہوا۔ چنانچہ سنہ ۲۳ء کی وہ غزلیں جو انھوں نے برودا جیل میں لکھیں، ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک تھکے ہوئے دماغ کا نتیجہ ہیں، ایک ایسے دل کی صدائیں ہیں جس کا زخم بھر چکا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ایک سبب یہ بھی ہو کہ سیاسی زندگی نے ان کو عشق و محبت کی دنیا سے بڑی حد تک جدا کر دیا تھا، لیکن گمان غالب یہی ہے کہ شباب کے انحطاط کے ساتھ ساتھ ان کا وہ ولولہ بے احتیاط بھی ختم ہو گیا تھا جو ماضی کے یاد کے ساتھ ساتھ مستقبل کو بھی کچھ عرصہ تک کے لیے پُر کیف و رنگین بنائے رکھتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۲۵ء اور سنہ ۴۰ء کے درمیان کی لکھی ہوئی غزلیں ہم کو ان کی ابتدائی غزلوں سے بہت ہلکی نظر آتی ہیں اور سنہ ۴۳ء سے سنہ ۵۰ء تک کی غزلیں تو قافیہ پیمائی سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔

الغرض حسرت کی شاعری یکسر جذبات کی شاعری ہے، جو عمر کے مختلف حصوں کے ساتھ ساتھ ابھری، ٹھہری اور ختم ہو گئی، لیکن بایں ہمہ حسرت کا ایک نہایت خوشگو شاعر ہونا اپنی جگہ مسلم ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جو درجۂ شہرت و قبول انھیں حاصل ہوا وہ ان کے ہمعصر شعراء میں سے شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ جس کے متعدد اسباب تھے۔

حسرت کے ہمعصر شعراء میں متعدد قابل ذکر لوگوں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان میں اکثر لکھنؤ کے تھے۔ گو دہلی میں سائل و بے خود موجود تھے لیکن ان کا ذکر ہم اس لیے نہیں کرتے کہ ان کی روایتی شاعری یکسر انحطاطی دور کی چیز تھی اور دہلی اسکول کی کوئی خصوصیت ان کے کلام میں نہ پائی جاتی تھی۔ لکھنؤ کے شعراء نے البتہ قدیم روایات سے ہٹ کر دہلی کی جذباتی شاعری کو سنبھال لیا تھا اور ناسخ کا قائم کیا ہوا طلسم ایہام ختم ہو چکا تھا۔

حسرت کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب عہد متاخرین کے دورِ دوم کے شعراء میں امیر و داغ، شاد، جلال، وحشت اور سالک و تسلیم زندہ تھے اور دورِ حاضر میں جلیل، آرزو، صفی، عزیز، یاس، اثر، اصغر، و فانی کی شاعری عروج پر تھی لیکن شاید ہی سے بہتر تھی۔ خود حسرت نے اس کی صراحت یوں کی ہے:۔ ؎

ہے زبان لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
مجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ حسرت کی شاعری میں رنگ دہلی کی نمود تو ضرور ہے۔ لیکن زبان لکھنؤ سے اسے کوئی واسطہ نہیں لیکن جس حد تک خالص زبان اور لب و لہجہ کا تعلق ہے حسرت کا کلام لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جس کی تصدیق خود ان کے اس شعر سے بھی ہے۔ ؎

حسرت مجھے پسند نہیں طرزِ لکھنؤ
پیرو ہوں شاعری میں جناب نسیم کا

اس کے علاوہ اور متعدد اشعار سے ان کے دلی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

پیرو تسلیم ہوں۔ شیدائے انداز نسیم
شوق ہے حسرت مجھے اشعار حسرت خیز کا
شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد
تازہ حسرت، اثر و حسن و بیاں کی رونق

شیرینیِ نسیم ہے سوز وگدازِ میر
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

طرزِ مومن میں مرحبا حسرتؔ
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبعِ حسرتؔ نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

قائم ہے ترے دم سے طرزِ سخن قائم
پھر ور نہ کہاں حسرتؔ یہ رنگِ غزل خوانی

آپ نے دیکھا کہ حسرتؔ نے کسی ایک جگہ بھی کسی لکھنوی شاعر کا نام نہیں لیا اور دہلوی اسکول کے شاعروں میں بھی انھوں نے صرف قائمؔ میرؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، مومنؔ و نسیمؔ کا ذکر کیا ہے۔ دوقؔ و سوداؔ اور ان کے متبعین سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گو ان کے استاد ہونے سے انھیں انکار نہ تھا۔

متاخرین شعرائے لکھنؤ میں وہ آتشؔ و جلالؔ کی شاعری کے بھی قایل تھے لیکن ان سے متاثر ہو کر انھوں نے تغزل میں تقلید نہیں کی۔

اپنے عہد کے شعرا میں انھوں نے شادؔ وحشتؔ، صفیؔ، عزیزؔ، محشرؔ، جگرؔ، اصغرؔ، فانیؔ نظم طباطبائی سبھی کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے لیکن خود ان کا رنگ شاعری ان سب سے الگ تھا، میں اس جگہ ان تمام شعرا سے حسرتؔ کا مقابلہ یا موازنہ کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ حسرتؔ کی شاعرانہ انفرادیت کا تعلق جس چیز سے ہے وہ خود اس فرق و امتیاز کو متعین کر دیتی ہے جو حسرتؔ اور ان تمام شاعروں کے کلام میں پایا جاتا تھا۔

لیکن قبل اس کے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی کے متعلق خود حسرتؔ کی رائے ظاہر کر دیں۔

انھوں نے سب سے پہلے تین بڑی قسمیں کی ہیں ایک وہ جس کا تعلق صرف آمد سے ہے، دوسری وہ جس میں صرف آورد ہی آورد پائی جاتی ہے۔ اور تیسری وہ جس میں آورد و آمد دونوں پائی جائیں

آمد کی بھی انھوں نے تین قسمیں کی ہیں:۔ عاشقانہ، عارفانہ، فاسقانہ۔ اسی طرح آورد کی تین قسمیں بتائی ہیں:۔ ناقدانہ، ماہرانہ، مضاحکانہ اور آورد و آمد ملی ہوئی شاعری کی تین قسمیں شاعرانہ، واصفانہ، باغیانہ، ظاہر کی ہیں۔

اس تقسیم کے بعد وہ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں۔ [1]

جو کلام خالص جذباتِ حسن و عشق کا حامل ہو اور اپنی خوبی کے لیے کسی محسوس صنعت گری کا محتاج نہ ہو وہ عاشقانہ کہلائے گا۔

جس کلام میں عشق مجازی سے برتر عشق سے عشقِ مطلق اور حسن سے حسنِ مطلق مراد ہو وہ عارفانہ ہوگا، اس کے برخلاف جن غزلوں میں مجازی عشق سے کمتر درجہ کے جذباتِ ہوس کی مصوری موجود ہو وہ فاسقانہ کہلائے گا۔

"مثلاً عاشقانہ شاعری کی مثالیں زیادہ تر میرؔ، مصحفیؔ، قائمؔ، غالبؔ، شیفتہؔ، حالیؔ، جلالؔ لکھنوی اور شادؔ عظیم آبادی کی غزلوں میں ملیں گی اور عارفانہ شاعری کے نمونے دردؔ دہلوی، نیازؔ بریلوی، آسیؔ سکندر پوری کی غزلوں میں دستیاب ہوں گے اور فاسقانہ سخن سنجی کی تصویریں زیادہ جرأتؔ کے ہاں، کمتر مصحفیؔ و انشاؔ و متاخرین میں اور کسی قدر مظفرؔ خیر آبادی اور گستاخؔ رام پوری کے ہاں موجود ہیں۔

فاسقانہ شاعری کو بد مذاقی پر محمول کرنا یا سوقیانہ و مبتذل قرار دینا انصاف کا خون کرنا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلم ہے۔ تو پھر اس کے دائرے کو صرف پاک جذبۂ عشق و محبت تک محدود کر دینے اور عامۂ خلایق کے ۹۹ فی صدی جذباتِ ہوس کو اس سے خارج کر دینے کی کوشش انتہائی بد مذاقی اور بے شعوری ہے۔ البتہ اس ضمن میں اعتدال سے گر جانا جیسا کہ رنگینؔ کی بعض ریختیوں اور جان صاحب وصاحبقرآن کے متبذل اشعار میں پایا جاتا ہے بیشک قابل اعتراض ہے مگر ایسے کلام کو فاسقانہ کے بجائے فاحشانہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔

اب اگر عاشقانہ شاعری کی خوبی بسیط ہونے کے بجائے مرکب ہو یعنی صنعت گری کی بھی شرمندۂ احسان ہو اور یکسر بیگانۂ تاثیر بھی نہ ہو تو اسے عاشقانہ کے بجائے شاعرانہ کہنا چاہیے۔ دورِ حاضر کے متغزلین کی اکثر غزلیں اس رنگِ سخن کی حامل ہیں۔

اس کے بعد بھی شاعرانہ طرزِ سخن اگر خوبیِ اثر بالکل محروم ہو تو اسے شاعرانہ کے بجائے ماہرانہ یا استادانہ کہنا چاہیے مثلاً امیرؔ مینائی، منیرؔ شکوہ آبادی سے لے کر بزمؔ اکبر آبادی۔ ثاقبؔ لکھنوی وضامنؔ کنتوری تک کی غزلیں نہ عاشقانہ ہیں نہ شاعرانہ بلکہ ماہرانہ ہیں، پھر اگر یہ ماہرانہ شاعری پختگی و مشاقی کے جوہر سے بھی خالی ہو اور بقول مصحفیؔ موزونیِ طبع کا نتیجہ ہو تو اسے مضاحکانہ کہیں گے۔

عاشقانہ شاعری کے مانند عارفانہ شاعری بھی ہے۔ اگر اس میں عشق و حسنِ مطلق کی رسمی حد یا اصطلاحی تصوف کا جلوہ نظر آتا ہو تو اسے عارفانہ کے بجائے ناقدانہ کہنا چاہیے یا اگر روحانی محرکاتِ عشق سے کمتر درجہ پر جذباتِ خلوص و عقیدت کے تحت نعت یا منقبت یا سوز و سلام کی صورت میں ظاہر ہوئے ہوں تو ایسی شاعری کو واصفانہ شاعری کہنا چاہیے مثلاً غلام احمد شہید شاہ نیاز بریلوی، محسنؔ کاکوروی، رضوانؔ مراد آبادی، ضیاؔ بدایونی، حمیدؔ لکھنوی یا انیسؔ و متعلقین انیسؔ، تعشقؔ و رشیدؔ وغیرہ کا کلام کہیں اگر اس قسم کا کلام محض صنعت گری ہو اور تاثیر سے محروم، یا محض حصولِ ثواب و نجات کی غرض سے وجود میں آیا ہو مثلاً امیرؔ مینائی یا مضطرؔ خیر آبادی کا نعتیہ دیوان یا مرزا دبیرؔ کا تمام

[1] "حسرتؔ موہانی کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ جو عبدالشکور صاحب نے اپنی کتاب حسرتؔ موہانی میں درج کیا ہے۔

دفتر منظومات، تو اس کو واصفانہ کے بجائے ماہرانہ کہنا ہوگا یا نافعانہ اور یہ دونوں قسمیں آورد کے تحت آتی ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس فاسقانہ شاعری میں اگر خالص جذبات ہوس کی مصوری ہے یا ستمانی یا مذہب وحکومت کے استخفاف یا انکار کا پہلو نمایاں ہو تو اسے باغیانہ کہنا چاہیے

اب صرف ایک قسم سخن اور رہ گئی یعنی ضاحکانہ جس میں محض ظرافت ہوتی ہے مثلاً ظریف لکھنوی یا احمق پھپھوندوی کا کلام یا ظرافت کے ساتھ طنز و قدامت پرستی کا پہلو نکلتا ہو مثلاً اکبر الہ آبادی اور ظفر علی خاں کا کلام۔

ہزل یا ہجو کا شمار بھی اسی قسم سخن میں ہوتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں حد اعتدال سے گزر کر پھکڑپن یا فحش گوئی کے درجہ تک پہنچ جائیں تو اسے ضاحکانہ کے بجائے سوفیانہ کہیں گے

ناسخ کا[1] کلام ماہرانہ ہے کیونکہ ان کے یہاں آورد ہی آورد اور جگر کا کلام بالعموم شاعرانہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے یہاں اکثر آمد پائی جاتی ہے،،

حسرت کی اس تقسیم کو سامنے رکھ کر اگر ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اسے زیادہ تر ہم عاشقانہ و شاعرانہ پائیں گے اور کہیں کہیں فاسقانہ۔ یعنی ان کا کلام خالص جذبات حسن و عشق کا حامل ہے جس میں صنعت گری کو بہت کم یا بالکل دخل نہیں۔ لیکن صرف اتنا کہہ کر ہم حسرت اور ان کے ہمعصر دوسرے خوشگو شعراء کے کلام میں جو چیز "قدر مشترک" ہے وہ نوبت دیتے ہیں "حد فارق" کا پتہ نہیں چلتا، حالانکہ حسرت کی شاعری نمایاں طور پر ان سب سے علیحدہ ہے اس کے لیے ہم کو صرف یہی دیکھنا ہوگا کہ حسرت اپنی جذبات نگاری میں کس حد تک صداقت و واقعیت کے پابند ہیں بلکہ یہ بھی کہ انھوں نے ان جذبات کے اظہار کے لیے کون سا اسلوب اختیار کیا ہے

حسن و عشق کے جذبات بہت محدود ہیں اور عالم محبت کی کوئی کیفیت ایسی نہیں ہے جو جانی بوجھی نہ ہو۔ جو شعراء اس منزل سے گزر چکے ہیں وہ تو خیر جانتے ہی ہیں لیکن جن کو خود اس کا تجربہ نہیں ہے وہ بھی دوسروں سے اتنا کچھ سن چکے ہیں کہ وہ بلا تامل اسے اپنی بیتی کے رنگ میں پیش کر دیتے ہیں، تاہم دونوں کے بیانات میں ضرور ایسا فرق موجود ہوتا ہے جس سے "حال و قال" کی تمیز بہ آسانی ہو سکتی ہے اور یہ فرق پیدا ہوتا ہے صرف انداز بیان اور لب و لہجہ سے جو بالکل وجدانی چیز ہے اور فن و اکتساب سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

ایک شاعر کا زبان داں ہونا۔ محاورات پر عبور، عروض میں مہارت یہ تمام باتیں سیکھنے سے آ سکتی ہیں، لیکن انداز بیان و لب و لہجہ بالکل فطری چیز ہے جو بڑی حد تک قصد و ارادہ یا سعی و کوشش کے حدود سے باہر ہے۔

مشہور ہے کہ جو بات "دل سے کہی جاتی ہے وہی دل پر اثر کرتی ہے" لیکن عمومیت کے ساتھ یہ نظریہ قابل تسلیم نہیں، کیونکہ ہر ایسا شاعر جو واقعی محبت کی دردمندیوں سے آگاہ ہے۔ اپنے قلبی تاثرات کو موثر طریقہ سے ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا یا یہ کہ کبھی وہ اس کے اظہار میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں۔ اسی طرح تاثرات قلبی سے ہٹ کر آرٹ اور تکلف کی شاعری کو دیکھیے تو یہاں بھی آپ کو یہی فرق نظر آئے گا اور انداز بیان اور لب و لہجہ کی اہمیت تسلیم کرنا پڑے گی۔

تغزل میں میر کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ نہ صرف تاثرات قلبی کا اظہار کرتے تھے بلکہ اس اظہار کے لیے ان کا لب و لہجہ بھی مخصوس تھا میر کے علاوہ اکثر شعراء دہلی کی شاعری جذبات و تاثرات عشق ہی سے تعلق رکھتی تھی اور ان کے لب و لہجہ میں بھی صداقت پائی جاتی تھی، لیکن بقول ذوق میر کا سا انداز کسی کو نصیب نہ ہوا۔ میر کے رنگ میں مصحفی، درد، حاتم، قائم، سوز، افسوس، حسن اور متاخرین میں آزردہ، مجروح، شیفتہ، حالی وغیرہ متعدد شعراء نے شاعری کی اور جذبات محبت کی فتادگی اور سپردگی کا اظہار ان سب نے مختلف طریقوں سے کیا۔ لیکن میر کے سیکڑوں نشتروں میں سے کسی ایک نشتر کا بھی جواب پیش نہ کر سکے۔

اسی طرح غیر جذباتی یا فنی شاعری میں بھی لب و لہجہ اور طرز ادا کو بڑا دخل ہے۔ مثلاً ناسخ آرٹ کی شاعری کا بادشاہ ہے اور وہ اپنے اس رنگ کے اشعار کی وجہ سے کافی بدنام ہے:۔

آج ہوتا ہے دلا درد جو میٹھا میٹھا
دھیان آتا ہے مجھے کس کے لب شیریں کا
کیا پڑ گیا ہے عکس تری چشم مست کا
نرگس کی شاخ بن گئی ہر موج، آب میں

لیکن جب اس کا لب و لہجہ بدلتا ہے تو وہ ایسے شعر بھی کہہ جاتا ہے:۔

اڑا کے ساتھ یہ منت غبار لیتا جا
مجھے رکاب میں او شہسوار لیتا جا
ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت
آنکھ کی بند ہوا کوچہ جاناں پیدا
گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج
ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں
مانع صحرانوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

آتش نے بھی ناسخ کے جواب میں کم ہرزہ سرائی نہیں کی، ملاحظہ ہو:۔

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو
منہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا
بیتاب دل کو تسکیں ہوتی ہے دید خط سے
وہ بوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں

لیکن رنگ سے ہٹ کر اس نے ایسے شعر بھی کہے ہیں:۔

---

[1] حسرت نے ایک جگہ ناسخ و آتش کے فرق کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

حسرت اک رنگ رواں ایک سے دو ... ہوا
فرق ناسخ و آتش کی ... میں

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
تیلیوں سے خاک کے یہ گڑھے بھر چکیں کہیں
دہانے زمیں کے نشیب و فراز کا

اسی طرح لکھنوی شعرا میں وزیر، برق، رشک، صبا، رند، خلیل وغیرہ اپنی بے کیف شاعری کی وجہ سے بدنام ہیں، کہیں کہیں ان کے کلام میں ہم کو ایسے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں، جیسے

برق:

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

صبا:

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

رند:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس لحاظ سے لکھنؤ میں جلال خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ زبان اور لب ولہجہ کی شاعری کا بادشاہ تھا۔

نہ خوف آہ بتوں کا نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجہ ہے ان دل دکھانے والوں کا

دل سے تنگ آئے ہیں ہم جوش جنوں کا کیسا
یوں گریباں نہیں کیا پھاڑتے سودا کیسا

میں شوق دید میں کیا جانے کتنی دور آیا
کھلی کچھ آنکھیں مری جب قریب طور آیا

ہوش میں ذرا آؤ تم تو بھلا کیا ہو جلال
اچھے اچھوں کو وہ دیوانہ بنا دیتے ہیں

الغرض یہ جذباتی شاعری بھی انداز بیاں اور لب ولہجہ کی وجہ سے مؤثر و دلکش بن جاتی ہے۔ چہ جائیکہ داخلی وجذباتی شاعری۔ اور حسرت کی کامیابی کا یہی راز ہے

حسرت کے ہمعصر شعرا میں صفی، عزیز، شاد، اور جلیل کی شاعری بھی جذباتی تھی اور ان کا لب ولہجہ بھی بہت مؤثر دلآویز تھا، لیکن حسرت کا لب ولہجہ ان سب سے علیحدہ تھا۔

حسرت نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ میری شاعری "ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود" لیکن جیسا میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں، ان کا یہ بیان صحیح نہیں، کیونکہ نہ ان کی زبان نہ ان کی طرز ادا اور نہ ان کا لب ولہجہ اس سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ واقعی مومن، مصحفی اور نسیم کے پیرو تھے، جیسا کہ انھوں نے بارہا ظاہر کیا ہے تو پھر لکھنؤ میں دہلی کے رنگ کی شاعری کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ زبان کا تعلق صرف تذکیر وتانیث یا مخصوص محاورات سے نہیں بلکہ اسلوب بیان سے ہے اور وہ حسرت کے یہاں بالکل دہلی ہی رنگ کا ہے۔

حسرت کی شاعری کی دو خصوصیتیں بہت نمایاں ہیں۔ ایک ان کی دلنشین فارسی تراکیب اور دوسرے زبان سلاست اور انداز بیان کی حلاوت اور ان دونوں باتوں میں وہ دہلی کے مقلد ہیں، فارسی تراکیب تو مومن اسکول سے تعلق رکھتی ہی ہیں لیکن اس سے ہٹ کر یوں بھی جو زبان و انداز بیاں انھوں نے اختیار کیا ہے وہ دہلی کا ہے اور لکھنؤ اسکول سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں

طے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا معاملہ
شب عجب لطف کا سامان بہم پہنچا تھا
جان امیدوار کا حسرت محو یاس کا
مقرر ہے خیال یار کی یہ کارفرمائی
ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز
فنا ہو جاتے ہم کار محبت میں تو بہتر تھا
مخصوص غم عشق ہیں ہم لوگ، ہمارا
یوں بسر ہو جائے لیل ونہار انتظار
اچھا نہیں لے گردش افلاک ستانا
دل پہ کا ہمکو رہے کا اختیار اب کی برس
مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حال دل
دشوار ہے اہتمام تمکیں
ہم نے کس دن ترے کوچہ میں گزارا نہ کیا
ہم پہ کہ ہلاک گفتگو ہیں
ٹھہرا ہے ضبط شوق پر آکر معاملہ
کسی عنوان صبر آتا نہیں مجھ ناشکیبا کو
یاد روز گار عاشقی دن بجے نکال
اب ایسے بھی ان کے مبتلا نہیں ہم
آئین وفا مد نظر لے کے گئی ہے
حال مرا ان سے جب بتا، تب تو نہ ہوئے تم خبر
دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر
انکار نہیں ہوتا ارشاد نہیں کرتے
تم تو یہ خوب کار پسندیدہ کر چلے
شوق کی بیتابیاں حد سے گذر جانے لگیں
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے
لے ترا غم رہے مجھے روز کا
کھنچا نہ کبھی اس نے اندوہ پشیمانی
عشق میں خوف جاں سے در گزرے
جس میں اٹھے بار ہا ان کی عیادت کو مزے
میری تاثیر محبت پر گماں لے جائے گا
التماس نگہ شوق پذیرا نہ ہوئی
وہ بھی کچھ کام نہ خدمت میں تمہاری آیا

حسرت کے یہاں اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ایسی نظر آتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان بھی دہلی کی تھی انداز بیان بھی دہلی کا تھا اور لکھنوی زبان ولب ولہجہ سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات بھی ان کی شہرت وقبول کا باعث ہوئی۔

دہلی اسکول جذبات وزبان دونوں حیثیتوں سے بالکل ختم ہو چکا تھا، صرف داغ رہ گئے تھے

سو وہ بھی گلزار داغ کے زمانے کے نہیں، اس لیے ان کی شاعری گو زبان و محاورات کے لحاظ سے دہلی کی رہی ہو لیکن خیال اور لب و لہجہ کی حیثیت سے یقیناً وہ غیر دہلوی تھی۔ لکھنؤ میں امیر اور ریاض کی نئی شاعری ضرور مقبول تھی، لیکن جلال صفی اور عزیز کے سامنے وہ بھی ماند پڑ چلی تھی۔ اسی زمانے میں حسرت کی آواز بلند ہوئی اور اس مخصوص زبان و لب و لہجہ جو مومن و مصحفی، نسیم و قائم کے زمانہ میں پایا جاتا تھا تو لوگ دفعتاً چونک پڑے اور دہلی شاعری کے اس دور کی یاد سامنے آگئی جب شاعر خود معصوم رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن لب و لہجہ یقیناً بہت معصوم تھا۔

گزر گئیں کی جگہ گزر جانے لگیں۔ بدگماں ہو گا کی جگہ گماں لے گا۔ تم کو خبر نہ ہوئی کی جگہ تم خبر نہ ہوئے۔ مزے حاصل ہونے کی جگہ مزے اٹھے قبول نہ ہوئی کی جگہ پذیرا نہ ہوئی زمانۂ عاشقی کی جگہ روزگار عاشقی۔ یہ زبان غیر لکھنوی تو تھی ہی، حسرت کے زمانے میں غیر دہلوی بھی تھی۔ یہاں تک کہ شاہ عظیم آبادی کے یہاں بھی جن کے آخری دور کی شاعری بڑی حد تک دہلی کی چیز تھی، یہ زبان ہم کو نہیں ملتی اور اسی لیے حسرت جب یہ زبان لے کر سامنے آتے تو سب کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں لیکن اس کو متروک کہہ کر رد کر دینے کی جرأت اس لیے نہیں ہوتی کہ زبان و لب و لہجہ کے ساتھ حسرت نے جو جذبات پیش کئے وہ بجائے خود اس نوعیت کے تھے کہ حسرت کو مصحفی و مومن کے عہد سے علیحدہ کر کے ان کی شاعری پر انتقاد کے کوئی معنی تھے اور اس حیثیت سے حسرت کی زبان بالکل موزوں اور برمحل تھی۔

اس وقت تک جو کچھ میں نے لکھا اس کا تعلق زیادہ تر زبان سے تھا اور گو اس سلسلے میں لب و لہجہ کا بھی ہر جگہ ذکر ضمناً آگیا ہے لیکن اس کی صراحت و وضاحت نہیں کی گئی۔ اسی لیے مناسب نہ ہوگا کہ اگر اس پر بھی اظہار خیال کیا جائے۔

جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا ہے کہ لب و لہجہ کا تعلق بڑی حد تک جذبات سے ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا لب و لہجہ صحیح جذبات کا ہم آہنگ بھی ہو۔ لب و لہجہ سے مراد بات کرنے کا ڈھنگ ہے اور یہ مختلف ہوا کرتا ہے۔ دو شخص ایک ہی چیز کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں لیکن باوجود تاثر کی یکسانیت کے وہ اپنے خیالات کا اظہار مختلف صورتوں سے کرتے ہیں۔ یہی اختلاف لب و لہجہ کا اختلاف ہے اور اسی پر شاعری کا حسن و قبح بڑی حد تک موقوف ہے۔

لب و لہجہ کی سب سے بڑی خوبی اس کی صداقت ہے۔ یعنی کسی جذبہ کو خواہ وہ بلند ہو یا پست اس طرح ظاہر کرنا کہ حقیقت سامنے آجائے اور سننے والا ایسا محسوس کرے کہ اس نے گویا اس کے دل کی بات کہہ دی ہے۔ ایسے لب و لہجہ کا مبالغہ و تصنع سے پاک ہونا ضروری ہے اور حسرت کے لب و لہجہ کی یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔

حسرت کی شاعری میں نہ فلسفہ طرازی ہے نہ معنی آفرینی ہے، نہ بلندی خیال ہے نہ جدت بیان۔ وہ آسمان کے تارے توڑنے کی فکر نہیں کرتے بلکہ وہی باتیں کہتے ہیں جو عام طور پر سب کے دل میں گزرتی ہیں لیکن کہتے اس انداز سے ہیں کہ دل میں اتر جاتی ہیں۔

حسرت کے یہاں ہم کو دو قسم کے اشعار ملتے ہیں، ایک وہ جن میں انھوں نے فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہے اور دوسرے وہ جو بالکل روز کی سادہ و [illegible] زبان میں ہیں لیکن یہ خوبی کہ ان کے نثر کرنے کی ضرورت نہیں [illegible] طرح کے اشعار میں پائی جاتی ہے اور [illegible] ممتنع لیتے ہیں۔

فارسی ترکیبوں کے استعمال سے شعر میں اکثر و بیشتر گرانی و ثقل پیدا ہو جاتا ہے لیکن حسرت کی فارسی تراکیب اس قدر سبک و شیریں ہوتی ہیں اور ان کا استعمال وہ صرف اس طرح کرتے ہیں کہ ہمیں ترکیبوں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ توالی اضافات میں ثقل و ناگواری سے بچنا بہت مشکل ہے۔ لیکن حسرت اس میں بھی غضب کی سلاست و روانی پیدا کر دیتے ہیں۔ ؎

اب آرزوئے شوق کی بیتابیاں کہاں
یعنی وہ سب ملازم عہد شباب تھا

اب میں ہوں اور تغافل بسیار کے گلے
وہ میں کہ مورد کرم بے حساب تھا

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاری دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز
تجھ کو آخر آشنائے ناز بے جا کر دیا

ہجوم بے کسی کو وجہ لطف بیکراں پایا
کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا

سیکھا ہے کہاں سے لے لب یار
یہ شیوۂ دلکش شکر خند

اس عشوۂ نازنیں کے جلوے
ہیں دشمن عقل مصلحت کوش

آپ بیٹھیں تو کبھی آکے مرے پاس کبھی
کہ میں فرصت میں حدیث دل دیوانہ کہوں

روش حسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے

اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا
سعی تاویل خیالات چلی جاتی ہے

درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جایئے
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جایئے

سکھا دے گی ندامت شیوۂ قدر وفا تم کو
یہ شانِ کج ادائی میری جانِ ناتواں تک ہے

ان تمام اشعار میں تولی اضافات پائی جاتی ہے، لیکن شعر پڑھتے وقت ہم مطلق محسوس نہیں کرتے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ فارسی ترکیبیں بجائے خود بہت شگفتہ ہیں اور دوسرے یہ کہ مفہوم کی لذت اور لب و لہجہ کی دلکشی ہم کو اس کی طرف متوجہ ہی ہونے نہیں دیتی، فارسی ترکیبوں کا استعمال زیادہ تر اس لیے کیا جاتا ہے کہ بیان میں قوت پیدا ہو جائے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ وسیع مفہوم ظاہر کر سکیں، لیکن اس کوشش میں جذباتی زبان کا لطف باقی نہیں رہتا اور اظہار خیال میں ناگوار تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔ حسرت کے یہاں آپ کو کوئی فارسی ترکیب ایسی نہ ملے گی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ قصداً جوش و قوت پیدا کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکیبیں خود جذبات نے بے اختیار پیدا کی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ حسرت نے صرف ایک غزل ایسی لکھی ہے جس میں بہ لحاظ ترکیب اقبال کی جھلک نظر آتی ہے، لیکن وہ بھی کیفیات سے اس درجہ شرابور ہے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ حسرت نے صرف بیان میں قوت و جوش پیدا کرنے کے لیے ان ترکیبوں سے کام لیا ہے، ملاحظہ ہو:۔

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیازمندی
بہ غرور دلربائی بہ یقین دل پسندی
نہ ہے اختیار دل پر نہ ہے اعتبار دل پر
ترے عاشقوں کا دیکھے کوئی رنگ مستمندی

مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت
وہ ستم بھی گر کرے ہے تو بہ لطف ہوشمندی
تری بزم ناز ظالم ہے عجیب طلسمِ حیرت
کہ جہاں ہے میرے دل کو سرِ خدمت پسندی
غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

اس غزل کا ایک ایک مصرعہ سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے اور اثر کے اعتبار سے بھی ان اشعار میں وہی تلوار کا کام کر رہی ہے جو حسرت کے سادہ اشعار میں نظر آتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ تلوار زیادہ جوہردار ہے۔

حسرت کے تغزل میں محبت کی کیفیت جو انساں کو یکسر سوز و گداز بنا دیتی ہے۔ نہیں پائی جاتی اور اسی لیے ان کے یہاں یاس و قنوط، وہ غم و الم اور وہ حسرت و جاں گدازی بھی نہیں ہے جو میر یا فانی کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ ان کے یہاں عشق خاک بسر رہنے کا نہیں بلکہ زخم کھا کر اس سے لذت اٹھاتے رہنے کا نام ہے، وہ محبت میں رات رات بھر گریہ وزاری کرکے دوسروں کی نیند حرام کرنا پسند نہیں کرتے وہ اپنی بے بسی و بیچارگی کے اظہار سے دنیا کی ہمدردی حاصل کرنا نہیں چاہتے، وہ اغیار کا ذکر کرکے اپنی محبت کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کوئی اخلاقی حجت پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتے، وہ عالم نزع یا موت کے ذکر سے محبوب میں استرحام پیدا کرنے کے قابل نہیں، بلکہ ان کے یہاں حسن و محبت کا ایک بہت صاف سیدھا نظریہ یہ ہے کہ محبت ایک فطری تقاضہ ہے اور عاشق محبوب دونوں اسی دنیا کے انسان ہیں جن میں نہ تقابل ضروری ہے نہ تصادم۔ ان کی محبت ملکوتی یا افلاطونی محبت نہیں ہے۔ جو جنسی جذبات سے خالی ہو، لیکن اس کی غایت ان کے یہاں ان جذبات کی تسکین بھی نہیں وہ محبوب کے اظہار خیال میں چنیں و چناں سے کام نہیں لیتے، انھیں باتیں بنانا نہیں آتیں اگر انھیں محبوب کی طرف سے بے اعتنائی کی شکایت ہوتی ہے تو وہ نہ ہائے واویلا کرتے ہیں اور نہ اسے کوئی قیامت خیز سانحہ جانتے ہیں، وہ نہایت سادگی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ اگر آپ لطف و کرم نہیں کرنا چاہتے تو نہ کیجئے لیکن

ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے

اور اسی کے ساتھ دبی زبان سے یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ:۔

پھر کہئے کس امید پہ ہم زندگی کریں
جب التفات آپ ذرا بھی نہ کیجئے

بات یہ ہے کہ حسرت کی شاعری کا ایک خاص ماحول ہے، ایک خاص پس منظر ہے اور اس کا تقاضہ یہ نہیں کہ وہ فضول بڑھ بڑھ کر باتیں کریں۔ ان کی محبت کی جولانگاہ اس دنیا سے بلند کوئی ایسی فضا نہیں ہے جہاں جسم کا گزر محال ہو اور گوشت و خون سے پیدا ہونے والے جذبات پر جسم [illegible] بند ہوں۔ ان کا محبوب وادی ایمن کوہ طور کی مخلوق نہیں بلکہ انھیں کی سوسائٹی کا فرد ہے جو چلمن کی اوٹ، پردے کی آڑ، جھروکوں اور جھلملیوں سے کوٹھے پر آکر اور موقع ہو تو نقاب الٹ کر بھی فریفتہ بنا سکتا ہے۔ حسرت کی محبت کی فضا وہی ہے جو "بزم عشق" کی تھی اور جس میں حکیم مومن خاں نے کسی ساعد سیمیں کو دیکھ کر اپنا دل گنوایا تھا۔ یہ فضا عشق و محبت کی وہ موہوم فضا نہیں جس میں گناہ کا خیال ہی دل میں نہ آئے اور واسطہ صرف فرشتوں سے ہو بلکہ یہ وہ ماحول ہے جو جذبات میں جنسی ہیجان بھی پیدا کرتا ہے اور جس کی بدولت کبھی کبھی انسان زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

پھر اگر محبت لاہوتی و ناسوتی دنیا سے ہٹ کر بھی کوئی مفہوم رکھتی ہے اور ایک عاشق کا تنہا فرض یہی نہیں کہ وہ صرف فلسفہ

وحکمت اور کائنات کا غوامض و دقائق حل کرتا
ہے ہے، تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ حسرت کی شاعری
حسن و عشق کے معاملات کی ایسی واقعی و حقیقی
تصویر ہے کہ اس سے ہٹ کر انسان فلاطوں
اور ارسطو تو بن سکتا ہے لیکن انسان شاید نہیں
بن سکتا اور شاعر تو یقیناً نہیں۔

حسرت کی شاعری اسی انسانی محبت کی زبان ہے اور اس میں جو جو کیفیتیں دل پر طاری ہو سکتی ہیں، یا جو جو جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہی سب انھوں نے بغیر کسی تصنع و آورد کے نہایت سادہ لیکن پُر اثر انداز میں بیان کر دیئے ہیں۔

ان تمام کیفیات اور مدارج محبت کا استقصار اور ان کی جدا جدا مثالیں پیش کرنا تو ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں لیکن حسرت نے ان بعض مسلسل غزلوں میں تقریباً ان تمام مدارج کیفیات کو یکجا ظاہر کر دیا ہے ایک غزل وہ ہے جس کا مطلع ہے:۔

توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

اور دوسری غزل وہ جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

(پوری غزلیں انتخاب کلام میں ملاحظہ فرمائیے)

یہ غزلیں جن کو ہم مثنوی اور واسوخت بھی کہہ سکتے ہیں سنہ ۱۲ء اور سنہ ۱۶ء کے درمیان کی ہیں جب حسرت کا شباب تھا اور محبت کا رنگ ان کے دل میں پوری طرح رچا ہوا تھا۔ ان غزلوں میں جو زبان، طرز بیان اور پُرکارانہ سادگی پائی جاتی ہے، وہ نہ قصد و ارادہ سے پیدا ہو سکتی ہے نہ کسب و اکتساب سے بلکہ اُسے ایک چوٹ کھایا ہوا دل پیدا کر سکتا ہے جس کے نزدیک محبت نام شورش و واویلا کا نہیں بلکہ اس دھیمی دھیمی آنچ کا ہے جسے آداب محبت شعلہ نہیں ہونے دیتے۔

حسرت کے یہاں ان غزلوں کے علاوہ بھی، بہ کثرت ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن کو ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ایک مجروح زندگی کی داستان کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً:۔

قصۂ درد کہوں شوق کا افسانہ کہوں
دل ہو قابو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں
خود ہے اقرار انہیں اپنی ستمگاری کا
پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں
آپ بیٹھیں تو سہی آ کے مرے پاس کبھی
کہ میں فرصت میں حدیثِ دلِ دیوانہ کہوں

ستم تم چھوڑ دو میں شکوہ سنجیہائے ناچاری
کہ فرضِ عین ہے کیشِ محبت میں رواداری
ہوئیں ناکامیاں بدنامیاں رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری
نہیں غم جیب و دامن کا مگر ہاں فکر ہے اتنی
نہ اُٹھے گا مرے دستِ جنوں سے رنج بیکاری
نہ ان کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ہے ممکن
کہیں آسان ہو یارب محبت کی یہ دشواری
وفورِ اشک پیہم سے ہجومِ شوق بیحد میں
مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری

اس رنگ کے اشعار ان کے کلیات میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان مثالوں میں متقدمین کے یہاں بھی مشکل سے مل سکتی ہے، متاخرین کا کیا ذکر۔ لیکن حسرت کا سارا کلام اس رنگ کا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ شاعر ہو یا نبی ہر وقت اس کو الہام نہیں ہوا کرتا۔

حسرت کے یہاں اس کے بعد دوسرا قابل ذکر رنگ وہ ہے جسے ہم خاندانِ مومن کا فیض کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی حسرت کا رنگ مومن سے زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ پیچیدگیوں سے صاف ہے [illegible] زیادہ گہ[illegible] تاثرات کا حامل ہے۔ مثلاً

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے
[illegible]ت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

حسن بے پروا کو خود بیں و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

جنتے جاتے رہ گیا وہ نازنین صبح وصال
نازبردار اثر ہوں گریۂ مجبور کا

ہجوم بیکسی کو وجہ لطف بیکراں پایا
کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا

نہاں شانِ تغافل میں ہے بے مزامتیاز اس کا
جلاندازِ جفا ہے التفاتِ دلنواز اس کا

غلط ہے شکوہ سنجی مرے عشقِ ناشکیبا کی
بجا کرتا ہے جو کرتا ہے حسنِ بے نیاز اس کا

دشوار ہے اہتمامِ تمکیں
ہم بر سرِ بلائے گفتگو ہیں

تاثیر برقِ حسن جو ان کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں کہ منزلِ جاناں کے قریب

ان تمام اشعار میں حسرت نے فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہے لیکن وہ سب اتنی آسانی و روانی کیساتھ زبان سے ادا ہو کر دماغ تک پہنچ جاتی ہیں کہ ہمارا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی طرف نہیں جاتا، علاوہ اس کے مومن کے کلام کی سی تعقید ان کے اشعار میں نہیں پائی جاتی اور نہ نثر کرنے کے لئے الفاظ کی ترتیب کو زیادہ بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

حسرت کی شاعری کی یہ عمومی خصوصیت ہے گویا وہ کسی سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے تمام اشعار میں پائی جاتی ہے خواہ وہ روز کی معمولی زبان میں ہوں یا فارسی آمیز زبان میں، اور اسی لئے ان کے اشعار سمجھنے کے لئے دماغ پر مطلق زور دینے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ان کو پڑھ کر یا سن کر زبان کان اور دماغ سب ایک ساتھ اپنا اپنا کام کرنے لگتے ہیں۔

حسرت کی شاعری میں بہ لحاظ بیان ہم کو مختلف رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ ایک وہ جن میں زبان محبت کے حالات پر عمومی گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے وہ جو صرف ان کے اور ان کے محبوب سے تعلق رکھتے ہیں تیسرے وہ جو محبوب کے مطالعۂ حسن سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن بیان کی دلاویزی، شیرینی و حلاوت، سلاست و روانی سب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

قسم اوّل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

کوئی بھی پُرساں نہیں حالِ دلِ رنجور کا
یہ ستم دیکھو دیارِ شوق کے دستور کا

کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ محبت جس کو
نام اسی کا دلِ مضطر نے دوا رکھا ہے

وہی جورِ خزاں ہوگا، وہی محرومیاں ہوں گی
نشاطِ بلبلِ بیدل بہارِ بوستاں تک ہے

اس رنگ کے اشعار حسرت کے یہاں بہت کم ہیں، کیوں کہ ان کی شاعری زیادہ تر خود اپنے حال کا اظہار تھا اور اسی قسم کے اشعار ان کے یہاں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:-

تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نجانا
حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریِ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

گر جوشِ آرزو کی یہی کیفیتیں رہیں
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے
ڈرتا ہوں مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے

مجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا
تجھ کو بھی مجھ سے ہمیں گلہ نہ ہوا

تیسرے رنگ میں انھوں نے صرف حُسن کے ظاہری مطالعہ کو پیش کیا ہے جو محبوب کے جسم لباس اور رنگ سے تعلق رکھتا ہے:-

رونق پیرہن ہوئی جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار
خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

ان رنگوں کے علاوہ بعض اور رنگ بھی حسرت کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:-

کسے فرصت تمہاری جستجو کی شوق بیحد ہے
ابھی ہم نے کہاں ڈھونڈھا ابھی بیٹھے کہاں پایا

نہ پا سکتے کبھی پابندہ کر قیدِ ہستی میں
سو بنتے بے نشاں ہو کر تجھے او بے نشاں پایا

اس درجہ دل پسند ہے آہنگِ نغمہ کیوں
پنہاں لباسِ درد میں تیری صدا ہے کیا

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں
تیری محل سرا کا یہی راستہ ہے کیا

ہر نغمہ نے انھیں کی طلب کا دیا پیام
ہر ساز نے انھیں کی سنائی صدا مجھے

حسرت کی تقسیم کے مطابق یہ عارفانہ کلام ہے اور گو اس قسم کے اشعار ان کے یہاں بہت کم ہیں لیکن جتنے بھی ہیں وہ تصوف کی خشک اصطلاحوں سے پاک اور تاثرات سے لبریز ہیں۔ اس رنگ میں ان کا ایک شعر جو علاوہ بلندیِ مفہوم کے نہایت گہرے تاثرات اور ایک خاص لہجے کا حامل ہے۔ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے:-

جذبۂ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے

شاعری میں ایک اور چیز بھی ہے جسے "بات سے بات پیدا کرنا" کہتے ہیں۔ حسرت کے یہاں یہ چیز بالکل نہیں پائی جاتی۔ ان کے یہاں مجھے صرف ایک مطلع اس انداز کا ملا ہے:-

انھوں نے پھیر دیا خط یونہی سلام کے بعد
بڑھا کے میرا تخلص بھی میرے نام کے بعد

حسرت کا کلام صنائع و بدائع سے بھی خالی ہے۔ البتہ صنعت تقابل جس کا رواج لکھنؤ میں بہ سلسلۂ ایہام بہت عام ہو گیا تھا کہیں کہیں ان کے یہاں البتہ پایا جاتا ہے لیکن ایسی خوبصورتی کے ساتھ کہ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً:-

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا ہے
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

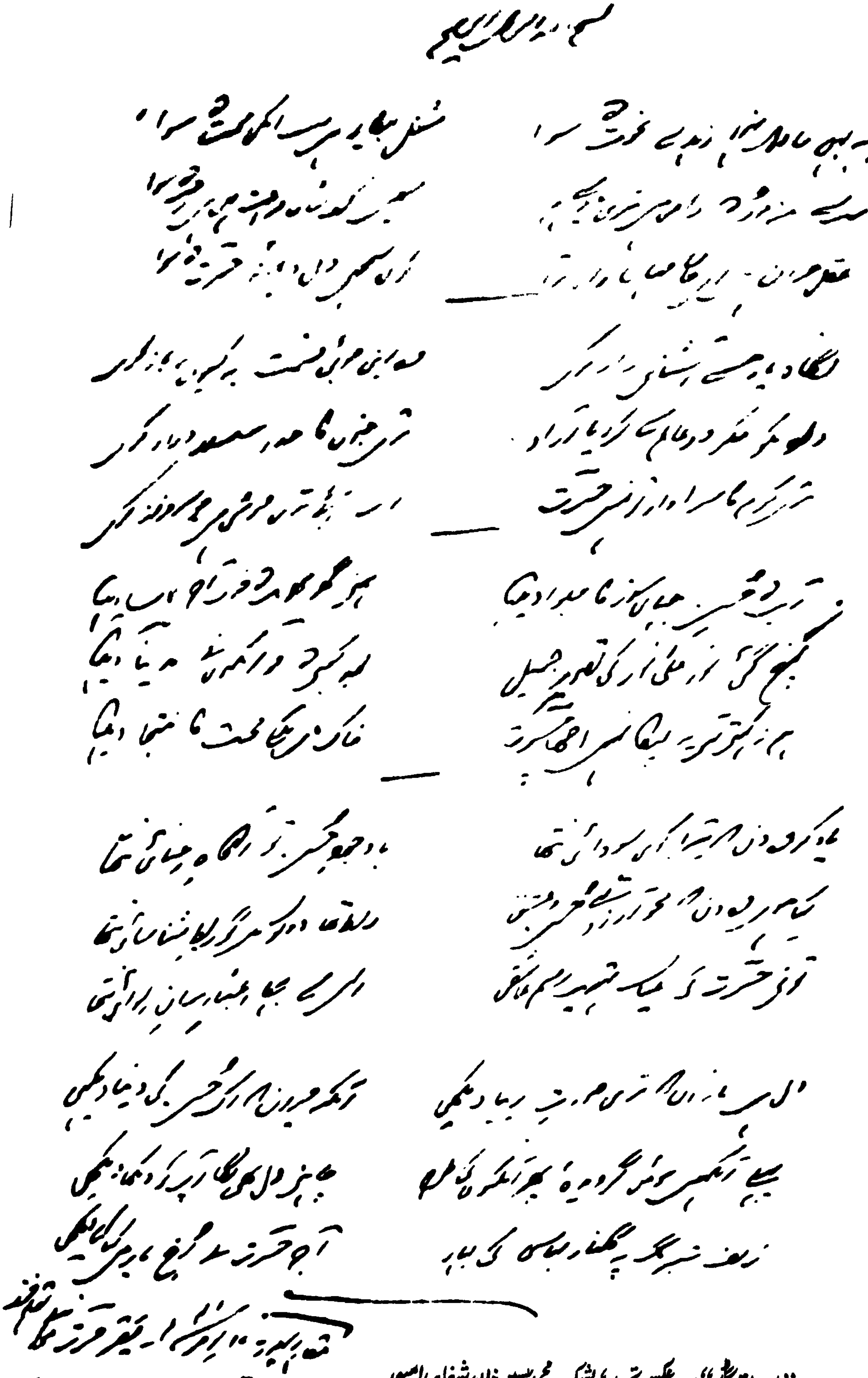
عمر ہی کیا ہے وہ کمسن ہیں ابھی نام خدا
ان پہ مرتا ہے تو کچھ دن ابھی جینا ہے تجھ کو

الغرض حسرت کی شاعری بالکل انسانی جذبات کی شاعری ہے اس میں کوئی کیفیت "جنون زندگی" کی پائی جاتی ہے اور نہ کوئی ایسی کیفیت جس کو آج کل اصطلاح میں "ماورائی" کہا جاتا ہے اور جس میں فلسفہ و حکمت اور حقیقت و معرفت کے نکات "تلاش" کیے جاتے ہیں۔

حسرت کی شاعری قطعاً "ادب برائے زندگی" ہے۔ بشرطیکہ "زندگی" سے اقتصادی و سیاسی مسایل کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ کر دیا جائے اس کا تعلق یکسر "جمالیات" سے ہے جس میں (OPTIMIRM) کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے یہاں محبت کا بیان ہے لیکن عشق کی شکست خوردگی سے بالکل پاک ان کے یہاں جنسیاتی جذبات ہیں لیکن ہوسناکی سے معرا، ان کی شاعری ایک خاص کلچر کی حامل ہے جو بالکل ہمارے مشرقی ماحول اور خاص شایستہ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جس حد تک زبان و اندازِ بیان کا تعلق ہے وہ بھی طبقۂ عوام سے علیحدہ ہے اور خواص میں بھی صرف ستھرے ذوق والوں کو اپیل کر سکتا ہے۔

جذبات کے لحاظ سے ان کی شاعری ہوسناکی و ابتذال سے پاک ہے اور بڑی حد تک خودداری لئے ہوئے ہے۔ جرأت کے انداز کے بعض اشعار انکے

(بقیہ صفحہ ۵۲ پر)


بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اوراقِ گل" سے: عکس تحریر، بشکریہ محمد یسین خان شفاء، رامپور

انتخاب کلیاتِ حسرت موہانی

حسرت مرحوم نے اپنی ۷۰ سال کی عمر میں ۵۸ سال تک شعر کہے اور صرف ۱۲ سال اس جذبے سے خالی گزرے۔ اس مدت میں انھوں نے تقریباً سات ہزار اشعار کہے، جن میں سے تقریباً ۷۵۳ اشعار انتخاب میں آسکے، یعنی تقریباً دس فی صدی۔

جس ترتیب کے ساتھ انتخاب شائع کیا جارہا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ حسرت کی شاعری کا ارتقائی دور ۲۸ سال (۱۸۹۳ء سے ۱۹۲۲ء تک) قائم رہا کیونکہ ۶۱۱ اشعار اس دور کی شاعری کا انتخاب ہیں۔

اس کے بعد ان کی غزل گوئی میں نہایت تیزی کے ساتھ انحطاط شروع ہوا اور آخری ۲۸ سال میں صرف ۴۲ اشعار قابلِ انتخاب ہوسکے۔

۱۸۹۳ء ——— ۱۹۰۳ء

جو آتا ہے تو آؤ بے تکلف   یہ عرض جلوۂ حیرت فزا کیا
دل وقفِ الم ہاں کچھ تو کہنا   وہ رنجِ ہجر کا ہے ماجرا کیا
نہ ہو مجھ سا کوئی محوِ تمنا   ہوا کرتی ہیں باتیں دل سے کیا کیا
ہوا حسرت مجھے پھر شوقِ صحرا   جنوں نے پھر مجھے سمجھا دیا کیا

میری نگہِ شوق کا شکوا نہیں جاتا   سونے میں بھی وہ پاس سے دیکھا نہیں جاتا
کرتے تھے کبھی حوصلۂ ترکِ محبت   اب صدمۂ دوری بھی اٹھایا نہیں جاتا
امید نہیں اُن سے ملاقات کی ہر چند   آنکھوں سے مگر شوقِ تماشا نہیں جاتا
واللہ تجھے چھوڑ کے اے کوچۂ جاناں   حسرت سے تو فردوس میں جایا نہیں جاتا

کیا کہوں تم سے مُدعا کیا ہے   کاش میں خود ہی جانتا کیا ہے
ہاں دلِ دردمند پھر تو ذرا   وہ تپِ غم کا ماجرا کیا ہے
حکم پر ان کے جان دیتا ہوں   میں نہیں جانتا قضا کیا ہے
مستِ صہبائے شوق ہوں حسرت   ہوش جانے مری بلا کیا ہے

کیا تم کو علاجِ دلِ شیدا نہیں آتا   آتا ہے پر اس طرح کہ گویا نہیں آتا
ہو جاتی تھی تسکین سو اب فرطِ الم سے   اس بات کو روتے ہیں کہ رونا نہیں آتا

جوشِ ارماں میں خیالِ رُخِ زیبا نہ رہا   کثرتِ شوق سے یارائے تماشا نہ رہا
میرے اظہارِ وفا کی انھیں پروا نہ رہی   ان کی تخصیصِ جفا کا مجھے دعویٰ نہ رہا

دلِ مایوس بھی عجب شے ہے   پھر اسی کا خیال کرتا ہے

ہم سے اُس شوخ سے اگلی سی محبت نہ رہی   گلۂ ترکِ ملاقات کا جھگڑا چھوٹا
اب نہیں کوئی بھی ارمان خوشا ناکامی   ایک آفت سے دلِ وقفِ تمنا چھوٹا

ایک ٹھوکر ہی تو ناز شوخ بے پروا خرام   رہگذر میں ہے تری اک آمدہ والا پڑا
کرتی تھی لیلائے شب نورمہ کامل نثار   سو رہا تھا بام پر وہ گیسوؤں والا پڑا
اس شرابی کا وہ عالم آج تک نظروں میں ہے   حسرت دیوانہ دل پھرتا ہے متوالا پڑا

اللہ ری محرومی اللہ ری ناکامی   جو شوق کیا ہم نے سو خام نظر آیا
اس شغل سے آنکھوں کو دم بھر جو نہیں مہلت   رونے میں وہ کیا ایسا آرام نظر آیا

وہ بگڑنا کبھی کبھی مجھ سے تو منانے کے لیے   یاد ہے انداز تیرے جورِ لطف آمیز کا

کیا پوچھتے ہو عاشقِ بیمار کا مزاج   آہ اس ادائے لذتِ آزار کا مزاج
میں کیا کہوں کہ شرم سے کیسے جھکا کے سر   پوچھا انھوں نے حسرتِ بیمار کا مزاج

گزر گئی حد سے پائمالی عتاب ترکِ کلام کب تک   رہیگی مدِ نظر وہ اے ستمگر وہ پیام و سلام کب تک
قفس میں صیاد بند کر دے نہیں تو یہ ہم چھوڑ ہی دے   میانِ امید و بیم آخر رہیں گے ہم زیرِ دام کب تک

کچھ عرضِ حال کرنے نہ پائے کسی سے ہم   کس طرح شکوہ سنج نہ ہوں بے خودی سے ہم
ناکامیوں پہ اپنی ہنسی آگئی تھی آج   سو کتنے شرمسار ہوئے بے کسی سے ہم
کس درجہ دل پذیر ہے حیرانیِ جنوں   فارغ ہیں شوقِ عزتِ فرزانگی سے ہم

سنائیے نہ مجھے یوں ہی دل فگار ہوں میں   رُلائیے نہ مجھے خود ہی بے قرار ہوں میں
ترا یہ رنگ کہ بنتے ہے سبب خفا مجھ سے   مرا یہ حال کہ بے وجہ بے قرار ہوں میں

نہ دردمند ہوں حسرت کہ اب بجائے ستم　　کرے جو لطف بھی کوئی تو اشکبار ہوں میں

پھر اور تغافل کا سبب کیا ہے خدایا　　میں یاد نہ آؤں انھیں ایسا نہیں ممکن
اس بے خودیِ شوق کی ہو کس سے شکایت　　وہ سامنے ہیں پھر بھی تماشا نہیں ممکن

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں　　کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں
شوقِ لقائے دوست میں ساری خدائیاں　　ورنہ دعا سے اور کوئی مدعا نہیں
خود اس کو میری عرضِ تمنا کا شوق ہے　　کیوں ورنہ یوں سنے ہے کہ گویا سنا نہیں

سب یہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے گنہگار نہیں　　ہاں مگر اتنی جفا کے بھی سزاوار نہیں
نہ سہی آپ جفا سے جو نہیں باز آتے　　جائیے جائیے اب ہم کو بھی اصرار نہیں

دستِ نازک سے تو قاتل کی نہ اٹھی تلوار　　اور ہوا نام مرا مفت گرانجانوں میں
یاد ایام کہ ہم جوششِ جنوں میں حسرت　　خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں

مضطرب ہے بہت میری طبیعت کئی دن سے　　دیکھی جو نہیں آپ کی صورت کئی دن سے
چھیڑا ہے مجھے پھر خلشِ خارِ محبت　　بے چین ہے پھر میری طبیعت کئی دن سے

ہزاروں بار نکلے اشک لیکن پھر بھی کم نکلے　　الٰہی اور کیسے آرزوئے چشمِ نم نکلے
ہزاروں بار چھیڑا جوششِ غم نے زرقت سے　　ہزاروں بار آنسو آپ کے سر کی قسم نکلے

وہ جو بے چین ہوئے دیکھ کے حالت میری　　ہوگئی اور پریشان طبیعت میری
دیکھ لینا کہ وفا میری رلائے گی تمھیں　　یاد آئے گی مرے بعد محبت میری
آہ وہ ذکر پہ حسرت کے کسی کا کہنا　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے اس کو محبت میری

کہاں شکوے تھے جورِ ناروا کے　　کہاں اب شوق ہیں اُن کی جفا کے
سناتے ہیں انھیں افسانۂ قیس　　بہانے ہیں یہ عرضِ مدعا کے
خدا جانے تجھے اے دل تمنائے شفا کیوں ہے　　یہ اُن کے درد سے بیوجہ آخر تو خفا کیوں ہے

غمِ ہجراں کا یارب کس زباں سے ماجرا کہیے　　نہ کہیے گر تو کیا کیجیے اگر کہیے تو کیا کہیے
کہاں ہر لحظہ پیشِ دوست محوِ لطف تم رہتے تھے　　کہاں یہ صدمہ ہائے غم اٹھاتے ہیں کہ کیا کہیے

وہی آرزوئیں ہیں حسرت وہی ہے　　مجھے تم سے اب تک محبت وہی ہے
ہوئی گرچہ ترکِ محبت کو مدت　　مگر مجھ کو رونے کی عادت وہی ہے

بظاہر اُن میں گو خوئے تغافل آتی جاتی ہے　　مگر ہے یوں کہ اُن کو مجھ سے الفت بڑھتی جاتی ہے

بہانا کیا ہے ساقی بادۂ گلگوں پلانا بھی　　کہاں کی پارسائی کیسی توبہ جام لانا بھی

وہ آغازِ محبت میں کرم اُن کا جفا اُن کی　　رہیگا یاد حسرت ہم کو برسوں وہ زمانہ بھی

فکر ہے تو نہ ہوا وصل کا ساماں کوئی　　تو ہی تدبیر بتا اے دلِ ناداں کوئی
موسمِ گل میں عجب رنگ ہیں دیوانوں کے　　چاک داماں ہے کوئی چاک گریباں کوئی

بے کلی سے مجھے راحت ہوگی　　چھیڑ دیں آپ عنایت ہوگی
ایک دن کھول کے جی رو لیں گے　　ضبطِ غم کی تو اجازت ہوگی

چھیڑا ہے دستِ شوق نے مجھ سے خفا ہیں وہ　　گویا کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار ہے
وہ سب مزے تھے نازشِ دردِ جگر کے ساتھ　　اب اشکبار آنکھ نہ دل بے قرار ہے

پھر تغافل کس لیے ہے گر محبت دل میں ہے　　سچ بتا کیا تیرے آخر بے مروت دل میں ہے

عذرِ گناہ پر بھی اس درجہ کج ادائی　　اللہ ری کم نگاہی اللہ ری بے وفائی
تیرا فسوں کہاں ہے اے گریۂ محبت　　کر آہِ نارسا کی کچھ تو ہی رہنمائی
عفوِ خطا کی حسرت بے کار ہیں امیدیں　　اُس دشمنِ وفا سے اب ہو چکی صفائی

شرمِ جفا سے لطفِ سراپا بنے ہوئے　　وہ آج کل ہیں جانِ تمنا بنے ہوئے

جملہ ۲۷ اشعار

۱۹۰۳ء - ۱۹۱۲ء

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازنیں　　اور بھی شوخ ہوگیا رنگ ترے لباس کا
طے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا معاملہ　　جانِ امیدوار کا حسرتِ محوِ یاس کا

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں　　ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز　　تجھ کو آخر آشنائے نازِ بے جا کر دیا
سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں　　دردِ دل اُس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
جو بہ تہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا　　دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا　　حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا
اب عشق کا وہ حال نہ ہے حسن کا وہ رنگ　　باقی ہے فقط عہدِ تمنا کا فسانا
آتی ہے تری یاد سو حسرت کو شبِ غم　　ہر بار اُسے افسانۂ دل کہہ کے سنانا

کوئی بھی پرساں نہیں حالِ دلِ رنجور کا　　یہ ستم دیکھو دیارِ شوق کے دستور کا
جاتے جاتے رہ گیا وہ نازِ صبحِ وصال　　نازبردار اتنے ہوں گریۂ مجبور کا
مایوس میں نقشِ امیدِ وصلِ یار　　نور ہے صحرا میں گویا اک چراغِ طور کا

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا / ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کر دیا
مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل / پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا
بیتابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل / آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا

ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا / تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا
ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریِ دل / التفات اُن کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا
گر یہی ہے ستمِ یار تو ہم نے حسرت / نہ کیا کچھ بھی جو دنیا سے کنارا نہ کیا

چہرۂ یار سے نقاب اٹھا / دل سے اک شورِ انقلاب اٹھا
رات پیرِ مغاں کی محفل سے / جو اٹھا مست اٹھا خراب اٹھا
ہم تھے بے باک اور وہ محجوب / غرضِ لطف بے حجاب اٹھا
مستِ صہبائے شوق ہے حسرت / ہم نشیں ساغرِ شراب اٹھا

ہجومِ بیکسی کو وجہِ لطفِ بے کراں پایا / کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا
مگر تھا رنگِ بزمِ یار میں نیرنگِ عالم کا / کسی کو سرنگوں دیکھا کسی کو شادماں پایا
کسے فرصت تمہاری جستجو کے شوقِ بیجا سے / ابھی ہم نے کہاں ڈھونڈا ابھی ہم نے کہاں پایا

پیہم دیا پیالۂ مے برملا دیا / ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا
اب وہ ہجومِ شوق کی سرمستیاں کہاں / مایوسیِ فراق نے دل ہی بجھا دیا

اضطرابِ عاشقی پھر کارفرما ہو گیا / صبر میرا ناشکیبائی سے رسوا ہو گیا
سادگی ہائے تمنا کے مزے جاتے رہے / ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خود آرا ہو گیا

نہاں شانِ تغافل میں ہے رمزِ امتیاز اُس کا / بانداز جفا ہے التفاتِ دل نواز اُس کا
غلط ہے شکوۂ سختی میرے عشقِ ناشکیبا کی / بجا کرتا ہے جو کرتا ہے حسنِ بے نیاز اُس کا
دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا / وہ وضعِ پارسا اس کی وہ عشقِ پاکباز اُس کا

برسرِ ناز وہ از راہِ کرم بیٹھا تھا / شب عجب لطف کا سامان بہم پہنچا تھا
شرح بے مہریِ احباب کروں کیا حسرت / رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا

ازبسکہ نازِ یار بشکلِ عتاب تھا / جو کامیاب تھا وہی ناکامیاب تھا
اب میں ہوں اور تغافلِ بسیار کے گلے / وہ میں کہ موردِ کرمِ بے حساب تھا

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا / باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشقِ روز افزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی / جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی / جبکہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق / ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

[illegible] سے اب شوق کہیں تیرا / ہے پیشِ نظر ہر دم حسنِ نمکیں تیرا
آنکھوں کے تبسم نے سب کھول دیا پردہ / ہم پر نہ چلا جادوئے چینِ جبیں تیرا

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے / باقی ستم کا اور ابھی حوصلا ہے کیا
گر جوششِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی / میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا
اک برقِ مضطرب ہے کہ اک تیرِ بیقرار / کچھ پوچھیے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا
جل بھی گئے وہ دیکھ کے صبر و قرارِ دل / ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا
حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا / آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

[illegible] / [illegible] سے التفات سے آخر کیا ہے کیا
[illegible] کہاں کہاں طبیعت [illegible] / رنجِ فراقِ یار بھی راحت فزا ہے کیا

کیا کہئے آرزوئے دلِ مبتلا ہے کیا / جب یہ خبر بھی ہو کہ وہ رنگیں ادا ہے کیا
دیکھو تو [illegible] وفا کی طرف رواں / [illegible] کا یہی راستا ہے کیا
ہم کیا کریں [illegible] / دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا
یوں [illegible] / کیا وہ جانتے ہی نہیں کہ گلا ہے کیا
رونے لگا [illegible] / تم نے ابھی فسانۂ حسرت سنا ہے کیا

لاکھوں کو [illegible] کر دیں / [illegible] ہے

غضب ہے دل [illegible] تو اُن سے کہنا / [illegible] چل کہ [illegible]
خفا [illegible] جان ہے یا [illegible] آداب [illegible] / کہ بات کو [illegible] کہنا فی المثل کہنا

ادا نہ ہم سے ہوا حق تری عنایت کا / نصیبِ شوق رہا داغِ ناتمامی کا
کھلے نہ ہم سے [illegible] آرزو کی زباں / جو اتفاق بھی ہو ان سے ہم کلامی کا
بقدرِ شوق کہاں تابِ التماس ہمیں / لکھیں جواب جو اس نامۂ گرامی کا

اک برقِ طپاں ہے کہ تکلم ہے تمہارا / اک موج ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمہارا

صحبتِ اہلِ عشق و شغلِ شراب / تھا یہی مقتضائے عہدِ شباب
جان بھی دی پیامِ شوق کے ساتھ / ہم نے کھینچا نہ انتظارِ جواب

جاں فزا تھی کس قدر یارب ہوائے کوئے دوست / بس گئی جس سے مشامِ آرزو میں بوئے دوست
بن گئی محفل کی محفل اک طلسمِ بے خودی / چل گیا آخر فسونِ نرگسِ جادوئے دوست

جو نازِ حسن سے کی تھی کبھی غرور کی بات / سو آج تک ہے مجھے یاد وہ حضور کی بات
بدیر جا کے ہوا ختم سلسلہ اس کا / چلی جو اہلِ محبت میں [illegible] کی بات

یہ ہوا پیتا ہوں پر نشے کا اثر　　کہہ دیا سب اُن سے حالِ شوق گستاخانہ آج
حسرتیں دل کی ہوئی جاتی ہیں پامالِ نشاط　　ہے جو وہ جانِ تمنا رونقِ کاشانہ آج

ہم بھی مشتاق ہیں شہادت کے　　اے تجھے خونِ اہلِ شوق مباح

شرمندۂ جور ہو نہ وہ شوخ　　اربابِ وفا ہیں یوں بھی خرسند
سیکھا ہے کہاں سے اے لبِ یار　　یہ شیوۂ دلکشِ شکر خند
اے عہد شکن سے کام حسرت　　آئینِ وفا کی تجھ کو سوگند
یہ ماتمِ روزِ وصل تا کے　　یہ گریۂ بے قرار تا چند

مجبور تجھ کو جان کے عہدِ وفا کے بعد　　بے مہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد
تم پہ مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے　　ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

صبر مشکل ہے ضبط ہے دشوار　　دل وحشی ہے اور جنوں بیدار
لطف کر لطف اے سراپا ناز　　تجھ پہ زیبندہ ہے یہ شعار

اب تو اٹھ سکتا نہیں آنکھوں سے بارِ انتظار　　کس طرح کاٹے کوئی لیل و نہارِ انتظار
اُن کی الفت کا یقیں ہو اُن کے آنے کی اُمید　　ہوں یہ دونوں صورتیں تب ہے بہارِ انتظار
اُن کے خط کی آرزو ہے اُن کی آمد کا خیال　　کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار

ہے غضب ہنگامۂ فصلِ بہار اب کی برس　　دل پہ ہم کو رہ سکا کیا اختیار اب کی برس
نکہتِ ساقی ہے یا حسرت کشانِ بادہ سے　　ملتے رہیں خوب ابر و بہار اب کی برس
نہیں رندوں کو ہوئیں [illegible] ہے　　یہ آتی ہے کیوں بے اختیار اب کی برس

پیمانِ وفا نہ کر فراموش　　اے حسرتِ بے قرار خاموش
پوشیدہ سکون اس میں ہے　　اک تختۂ اضطرابِ خاموش
آزاد ہیں قید میں بھی حسرت　　ہم دل شدگانِ خانہ بدوش

سب ہیں تری انجمن میں بے ہوش　　نظارۂ حسن کا کسے ہوش
تم آئے کہ ختم ہو گئے ہم　　باقی تھے مگر اسی لیے ہوش
روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام　　مہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ ری جسمِ یار کی خوبی کہ خودبخود　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

کام لوں ناکامیوں سے عشق کا کتنا کروں　　ہو کے واقف لطفِ غم سے رات دن رویا کروں
بڑھ چلا تھا حد سے جورِ شیوۂ بیگانگی　　ورنہ میں اور اس سراپا ناز کا شکوا کروں
مجھ سے تم چھپنے لگے، اچھا کیا، یونہی سہی　　اور جو میں اب دیدۂ دل سے تمہیں دیکھا کروں
اب ستمگر مجھ سے گو ترکِ وفا ممکن نہیں　　میں کروں لیکن کبھی ایسا تو کیا بیجا کروں
حسرت اُس نا آشنا کی آرزو آساں نہیں　　دل میں پہلے ضبطِ غم کا حوصلہ پیدا کروں

آوارۂ دشتِ جستجو ہیں　　ہم خانہ بدوشِ آرزو ہیں
دشوار ہے اہتمامِ تمکیں　　ہم یہ کہ ہلاکِ گفتگو ہیں

بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں　　اب تجھے اے ستمِ یار کہاں سے لاؤں
پرسشِ حال پہ ہے خاطرِ جاناں مائل　　جرأتِ کوششِ اظہار کہاں سے لاؤں
ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز　　التفاتِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں

نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں ہوں قدرداں اپنا　　ستم ہر طرف بیگانۂ رسمِ شکایت ہوں
کمالِ خاکساری پہ ہے یہ دادِ ایماں حسرت　　میں اپنی داد خود لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

نگاہِ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے　　تغافل ہائے پیدا میں نوازش ہائے پنہاں ہیں
مجھے معلوم ہے کچھ جوشِ الفت رنگ لائے گا　　ترے عہدِ تغافل میں مرے پیمانِ حرماں ہیں
الٰہی خیر ہو اب ترکِ گنہگاری کی　　ہجومِ شوق میں ہنگامۂ فصلِ بہاراں ہیں

ہم پہ بھی شکایتیں ہیں کیوں مہربانیاں　　اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں
ٹھہرا ہے جذبِ شوق پہ آ کر معاملہ　　اس درجہ آرزو کی بڑھیں بے زبانیاں
ہو ترکِ آرزو کہ زمانہ گزر گیا　　لیکن گئیں نہ ہم سے تری سرگرانیاں

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں　　الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی　　مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی　　تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں　　آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو　　ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
عشق میں جان سے گزر جائیں　　اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں
شب وہی شب ہے دن وہی دن ہیں　　جو تری یاد میں گزر جائیں

نغمۂ شوق کہوں درد کا افسانہ کہوں　　دل ہو قابو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں
خود ہے اقرار انھیں اپنی ستمگاری کا　　پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں
آپ بیٹھیں تو سہی آ کے مرے پاس کبھی　　کہ میں فرصت میں حدیثِ دلِ دیوانہ کہوں

کسی عنوان چین آتا نہیں مجھ ناشکیبا کو　　الٰہی کیا کروں اس خاطرِ محوِ تمنا کو
نہ تھی واقف جو میرے اشتیاقِ بے نہایت سے　　نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اس نگاہِ بے محابا کو
وہ خوابِ ناز میں تھے اور نہ تھے ارمانِ پابوسی　　نہ سمجھی پستیِ ہمت تری اس لطفِ ایما کو

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے　　وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد　　ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

لایا ہے دل پر کتنی خرابی
اے یار تیرا حُسنِ شرابی

پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر
نورِ سحر کی وہ لاجوابی

پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت اُن کی وہ نیم خوابی

اس قیدِ غم پر قربان حسرت
عالی جنابی گردوں رکابی

اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے
اک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے

آہ وہ یادکہ اُس یاد کو ہو کر مجبور
دلِ مایوس نے مدّت سے بُھلا رکھا ہے

اگہ یار سے پیکانِ قضا کا مشتاق
دلِ مجبور نشانے پہ کھلا رکھا ہے

دل کو تری دزدیدہ نظر لے کے گئی ہے
اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے

اُس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت
آئینِ وفا مدِ نظر لے کے گئی ہے

ستم تم چھوڑدو میں شکوہ بیجا سے نلچاری
کہ فرضِ عین ہے کیشِ محبت میں رواداری

ہوئیں ناکامیاں بدنامیاں رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری

تمہیں غم جیب و دامن کا مگر ہاں فکر ہے اتنی
نہ اُٹھیگا مرے دستِ جنوں سے رنجِ بیکاری

نہ اُن کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ہے ممکن
کہیں آسان ہو یارب محبت کی یہ دشواری

وفورِ اشکِ پیہم سے ہجومِ شوق بیجد میں
مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری

نہ دیکھے اور دلِ عشاق پر پھر بھی نظر رکھے
قیامت ہے نگاہِ یار کا حُسنِ خبرداری

یہی عالم رہا گر اس کے حُسنِ سحر پرور کا
تو باقی رہ چکی دنیا میں راہ و رسمِ ہشیاری

چلا برسات کا موسم نہ چھوٹے قیدِ غم سے ہم
بڑی بے لطفیوں میں اب کی گزرا وقتِ میخواری

عشاق کے دلِ نازک اس شوخ کی خو نازک
نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

ہر چند ہے دل شیدا حریت کامل کا
منظورِ دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

آنکھوں کو انتظار سے گرزیدہ کر چلے
تم یہ تو خوب کارِ پسندیدہ کر چلے

ہم بیخودوں سے چھپ نہ سکا رازِ آرزو
سب ان سے عرضِ حالِ دل و دیدہ کر چلے

یہ طرفہ ماجرا ہے کہ حسرت سے مل کے وہ
کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

اسبابِ اشتیاق سے پروا نہ چاہیئے
اے حُسنِ خود نما تجھے ایسا نہ چاہیئے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں
اس درجہ اعتبارِ تمنا نہ چاہیئے

عطائے عشق مدِ نظر ہو تو حُسن سے
اظہارِ آرزو میں محابا نہ چاہیئے

روشِ حُسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے

اُس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا
سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر ہرگز نہ کیجے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

خاطرِ محروم کو کر دیجیئے محوِ الم
در پے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجئے کچھ جواب
دیکھ لیجیے اور تغافل آشنا ہو جائیے

مجھ سے تنہائی اگر ملئے تو دیجیے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اُس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجیے نکال
آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری، تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

ابھی تک کبھی نہیں گستاخیاں جوششِ تمنا کی
تمہاری کم نگاہی التماس بے زباں تک ہے

سکھادیگی ندامت شیوۂ قصدِ وفا ان کو
یہ شانِ کج ادائی میری جانِ ناتواں تک ہے

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیاز مندی
بغرورِ دلربائی بہ یقینِ دل پسندی

نہ ہے اختیار تجھ پہ نہ ہے اختیار دل پر
ترے عاشقوں کا دیکھے کوئی رنگِ مستمندی

مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت
وہ ستم بھی گر کرے ہے تو بلطفِ ہوشمندی

تری بزم ناز عالم ہے عجب طلسمِ حیرت
کہ جہاں ہے ہر دل کو سرِ خدمتِ سپندی

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

تھی راحتِ حیرت کی کس درجہ فراوانی
میں نے غمِ ہستی کی صورت بھی نہ پہچانی

دیکھ اے ستمِ جاناں، یہ نقشِ محبت میں
بنتے ہیں بدشواری مٹتے ہیں بآسانی

میں اُس بتِ بدخو کی اس آن پہ مرتا ہوں
کھینچا نہ کبھی اُس نے اندوہِ پشیمانی

سُن چکے شکوے ملالِ خاطرِ ناشاد کے
ہم کہ خوگر ہیں سپاسِ لذتِ بیداد کے

دیکھ کر عالم مری حیرانیِ خاموش کا
اُڑ گئے ہوش اُن کی تمکینِ ستم ایجاد کے

مے نوشیوں میں بے خبرِ دو جہاں رہے
ہم خوش رہے کہ بندۂ پیرِ مغاں رہے

یہ مقتضائے رابطۂ حُسن عشق تھا
ہم بدگمان ادھر، وہ اُدھر بدگماں رہے

محرومیِ وفا سے نہ آیا یقینِ لطف
وہ مہرباں ہوئے بھی تو ہم بدگماں رہے

اُن سے شبِ وصال بھی کھُل کر نہیں ملے
تا صبح شکوہائے جفا درمیاں رہے

اُس نازنیں سے ہم کو جتنے گزند پہونچے
سب دل پذیر پہونچے سب دل پسند پہنچے

عالم ہی اب نہیں وہ تفریحِ بے خلل کا
محفل میں تیری ناحق ہم دردمند پہونچے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حُسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حُسن و اُلفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا اُن کی عیادت کے مزے

میں ہوں مجبور دلِ بے سودائی
رخصت اے صبر اے شکیبائی

مذہبِ عاشقی میں ہے اے عقل
بیخودی انتہائے دانائی

بندۂ بستگانِ حضرتِ عشق
حسرتِ سرفرازِ رسوائی

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے
یہ رنگیں ماجرائے عشق شہرہ کار پیدا ہے

مرے اصرارِ مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی
ترے اقرارِ آساں سے ترا انکار پیدا ہے

کثرتِ التفات آموزِ مے نوشی نہ تھی — ورنہ مے خانے میں ساقی مجھ کو بیہوشی نہ تھی

عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجیے — ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجیے
پھر کیجیے کس امید پر ہم زندگی کریں — جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجیے

تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی — یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے
دل بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت — نگہِ شوق نے کیا جانیے کیا دیکھا ہے

مجبورِ خاک کے محرومِ کرم کرنا — بھولیں گی نہ باتیں اے عہد شکن تیری
اب رونے سے کیا ہوگا پروانہ ہے بے پروا — برباد ہے سب محنت اے شمع لگن تیری

ظاہر ملالِ رشک و رقابت نہ کیجیے — بہتر یہی ہے اس سے شکایت نہ کیجیے
ملنے نہ پائیں رنجشِ باہم کی لذتیں — رفعِ ملال و دفعِ کدورت نہ کیجیے
مدِ ستم منزدہ تھا آپ کے لیے — حسرت کو شرمسارِ ندامت نہ کیجیے

تم بھلانے شہید کرم ایسا بھی ہوتا ہے — محبت میں بتانے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

دل کی جو ترکِ عشق سے حالت بدل گئی — وہ بے خودی و خرمی بے خلل گئی
تجھ کو فلک نے مجھ سے چھڑایا تو کیا ہوا — کیا تیری یاد بھی مرے دل سے نکل گئی
اب دل ہے اور فراغِ محبت کی راحتیں — تشویشِ زندگانی و فکرِ اجل گئی

دل مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے — گداز غم اگر چاہے تو مجھ کو با خدا کر دے
عطا ہو اُس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یارب — نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کر دے

تسکین ہو سکی نہ دلِ بے شکیب کی — سب ہم پہ کھل گئیں تری باتیں فریب کی

نہ مجھ کو اس کی خبر ہے نہ خود انھیں خیال ہے — کچھ اس طرح سے محبت بڑھائی جاتی ہے
وہ چار ہو نظرِ شوق اُس سے کیا حسرت — نگاہِ یار تو دل میں سمائی جاتی ہے

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی — روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں — کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی
یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا — ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی
دل کو تھا حوصلۂ عرضِ تمنا سو انھیں — سرگزشتِ شبِ ہجراں بھی سنائی نہ گئی
غمِ دوری نے کشاکش تو بہت کی لیکن — یاد ان کی دلِ حسرت سے بھلائی نہ گئی

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے — ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے
بیتابیٔ اس پرستشِ پیہم کی نوازش — عشاقِ ستم کش کو [illegible] نہ کر دے
ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا — یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے
کچھ حد بھی ہے اس شورشِ خاموش کی حسرت — یہ کشمکشِ غم تجھے بے کار نہ کر دے

جملہ ۲۷۷ اشعار

۱۹۱۲ء — ۱۹۱۶ء

شرف حاصل ہے اُس جانِ جہاں سے مجھ کو نسبت کا — غلامی کا سہی لیکن ہو سکتا ہے محبت کا
غضب تھی عشق کے جذبات گونا گوں کی رنگینی — دلِ حسرت بھی اک نیرنگ ہے رازِ محبت کا
وہ میرے قتل ہی کو آئیں لیکن سامنے آئیں — نتیجہ کچھ تو نکلے جذبِ تاثیرِ محبت کا

مجھ سے گردیدہ اک زمانہ رہا — کچھ فقط میں ہی مبتلا نہ رہا
آپ کو اب ہوئی ہے قدرِ وفا — جب کہ میں لائقِ جفا نہ رہا

عشق جب شکوہ سنجِ حسن ہوا — انتہا ہو گئی گلا نہ رہا

بیاں منظور ہے جو کچھ سزا ہو جرمِ الفت کی — کہ ہم نے فیصلہ اس بات کا بھی آپ پہ رکھا

ذکر نا تھا سہی دعوائے تمکیں پر کیا، دل پر — میرے پہلو میں انھیں لاکے بٹھا دینا تھا
تم جو افسردہ ہوئے سن کے مرا حال سو کیوں — سرسری طور سے باتوں میں اڑا دینا تھا
وہ جو بگڑے تو خفا تم بھی ہوئے کیوں حسرت — ~~پائے تخت پہ سرِ شوق جھکا دینا تھا~~

قرب میں ہے نہ لذت یار میں تھا — جو مزہ اس کے انتظار میں تھا
مجھ پہ اب طعنِ اضطراب ہے کیوں — دل انھیں کے تو اختیار میں تھا
ہم بھی آخر ہلاکِ شوق ہوئے — یہی دستور اُس دیار میں تھا

مایوس نہ یوں ہوتے تو وعدہ اگر ہوتا — ہم کچھ نہ تجھے کہتے مجبور اگر ہوتا
کچھ دادِ وفا حسرت ہم کو نہ ملی ملتی — دنیا میں یہ افسانہ مشہور اگر ہوتا

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا — ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر — ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

کون لاتا تب عتاب کی تاب — خیر گزری کہ سامنا نہ ہوا
چھڑ گئی جب جمالِ یار کی بات — ختم تا دیر سلسلہ نہ ہوا
میں گرفتارِ الفتِ صیاد — دام سے چھوٹ کے بھی رہا نہ ہوا
کچھ ہوئے جانِ مضطرب کو سکون — آپ کی یاد کے سوا نہ ہوا

کون لے عرضِ حال کرکے عذاب — جان پر اُن کی سرگرانی کا

شوقِ پوشیدہ کا اظہار نہ ہونے پایا — داغِ دل کوئی نمودار نہ ہونے پایا
دل کچھ اس وضع سے بے اُن سے کہ برسوں کوئی — حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

محفل میں اُن سے کی ہوں گستاخیاں کسی نے — پردہ بھی کہیں گے "سب ہے قصور تیرا"
بیتاب دل کے ہاتھوں کیوں اے اسیرِ الفت — پھر اس گلی میں جانا ٹھہرا ضرور تیرا

انھیں مناکے بھی اظہارِ حال ہو نہ سکا — قبولِ عذر سے رفعِ ملال ہو نہ سکا
جفا سے باز نہ آئے تم اور کیوں آتے — کہ ہم سے ترکِ وفا کا خیال ہو نہ سکا
حضورِ یار گئے بھی تو کیا ہوا حسرت — سلام کر نہ سکے ہم سوال ہو نہ سکا

یاس کا دل پہ کچھ اثر نہ ہوا — قصۂ شوق مختصر نہ ہوا
اشکِ پیہم سے شوقِ بیحد کا — گوشۂ آستیں بھی تر نہ ہوا
صرفِ عصیاں ہوا وہ لحظۂ عمر — جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

شکوۂ عشق جو ہم سے کسی عنواں نہ ہوا — حشر میں بھی وہ جفا کار پشیماں نہ ہوا
شکر بہر کا دیتے ہو تغافل سے جواب — دشمنی یہ تو ہوئی مجھ پہ کچھ احساں نہ ہوا

ہر گھڑی شیخ کو ہے فکرِ ثواب — یہ بھی اک طرح کا عذاب ہوا
اب یہ کیوں آپ ان سے پھر بگڑے — اب یہ کس بات پر عتاب ہوا
آپ کے ہاتھ سے کرم کہ ستم — جو ہوا مجھ پہ بے حساب ہوا

تو نے جو کیا بھی تو عجب کام کیا — دلِ دیوانہ کو سرِشتۂ اوہام کیا
جس کو جو شے تھی سزاوار خدا نے بخشی — مجھ کو جانباز کیا تجھ کو دلآرام کیا

بھر گئی نور سے تاریک شبِ منتظراں　　جلوہ اس روئے نکو نے جو سرِ بام کیا
کچھ محبت بھی عجب شے ہے کہ حسرت سا غیور　　اور اسے آپ نے خود کردۂ دشنام کیا

وصل میں بھی تو وہی ہے دلکی شانِ اضطراب　　عیش حاصل ہو رہا ہے رائگانِ اضطراب
شوقِ بیحد کے ارادوں سے ہے واقف نازِ حسن　　شرمِ خوباں سب سمجھتی ہے زبانِ اضطراب
حوصلے ابتک وہی ہیں خاطرِ بیتاب کے　　ناتوانی میں بھی ہے باقی توانِ اضطراب

جان کو صبر ہے نہ دل کو ہے تاب　　تو نہیں ہے تو زندگی ہے خراب
نشۂ مے سے بڑھ کے شوق کی مستی ساقی　　نظرِ لطف بھی اک ہو جو پسِ جامِ شراب
قیدِ مینا سے نہ مے چھٹ کے بھی آئی ابتک　　حائل اک اور بھی حدِ قفسِ جامِ شراب

آج سُنکر میرے نالوں کو زراہِ التفات　　زیرِ لب اس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات
دوستی اس فتنۂ دوراں کی ہے یادِ دشمنی　　جان برباد کرم ہے دل تباہِ التفات
عشق کا حسن عقیدت دیکھنا۔ اکثر ہوا　　تیری بے پروائیوں پر اشتباہِ التفات
ہے دلِ دیوانۂ حسرت ہلاکِ آرزو　　اس طرف بھی اے ستمگر اک نگاہِ التفات

سب نے آخر خدا پہ چھوڑ دیا　　تیرے بیمار کا ہوا نہ علاج
لائے ہیں عاشقانِ باجگذار　　نذرِ حسرت کو آنسوؤں کا علاج

اُن کی تھی میرے حالِ دل پہ نظر　　آہ اس عہدِ التفات کی یاد
کچھ نہیں ہے تری نظر کے سوا　　خواہشِ عاشقِ خجستہ نہاد

غم سے نہیں ایک دل بھی آزاد　　فریاد ز دستِ عشق فریاد
عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم　　اپنی تو یہ مختصر ہے روداد
ہوگا کسے جان دینے میں عذر　　ارشاد اور آپ کا پھر ارشاد
رہنے لگی ان کی یاد ہر دم　　اب اور ہمیں رہیگا کیا یاد
بھولے ہمیں اور سب فسانے　　اک قصۂ آرزو رہا یاد

ہیں اسی حال میں ابتک تری فرقت کے مریض　　کچھ نہ ہوتی ہے دعا کی نہ دوا کی تاثیر
اب وہ کرتے ہیں جفا بھی تو ہمیں پر حسرت　　بارے اتنی تو ہوئی آہِ رسا کی تاثیر

عشق تھا باربابِ خدمتِ حسن　　ہم کو ہے یاد وہ زمانہ ہنوز
سُرخیِ چشمِ یار سے ہے عیاں　　اثرِ مستیِ شبانہ ہنوز

وہ تو کر دیں مرا قصور معاف　　میں ہی کہتا نہیں حضور معاف
میں نے اقبالِ جرمِ عشق کیا　　اور انھوں نے کیا ضرور معاف

ان کے قدموں پہ گر بھی جا حسرت　　یوں نہ ہوگا ترا قصور معاف

دل تیری طلب میں رہے بیتاب کہاں تک　　اے بے خبر اے دشمنِ احباب کہاں تک

توی دل شادماں دل یارب دل　　ترے عاشق نے بھی پایا ہے کیا دل
بڑی درگاہ کا سایل ہوں حسرت　　بڑی امید ہے میری بڑا دل

کیا ہی شرمندہ چلے ہیں دلِ مجبور سے ہم　　آئے تھے انکی زیارت کو بڑی دور سے ہم
دیکھنا ایک نظر بھی اُنھیں ٹھیرا ہے گناہ　　درخورِ عفو ہیں واقف نہ تھے دستور سے ہم
ربط باہم کی ہو کیا شکل۔ کہ آگاہ نہیں　　دلِ رنجور سے تم خاطرِ مسرور سے ہم

تصور میں وہ شوخ تھا ہم سے باہم　　عجب لذتِ بے خودی تھی فراہم
سب آئے پر اک تو نہ آیا نہ آیا　　ترا دیر دیکھا کیے راستا ہم
جفا کو وفا سمجھیں کب تک بھلا ہم　　اب ایسے بھی ان کے نہیں مبتلا ہم
یہ کیا منصفی ہے کہ محفل میں تیری　　کسی کا بھی ہو جرم پائیں سزا ہم
تری خوئے برہم سے واقف تھے پہ بھی　　ہوئے مفت شرمندۂ التجا ہم

عشق میں صبر و سکوں اے دلِ ناکام کہاں　　اُس دلآرام کی خواہش ہے تو آرام کہاں
حسرتِ زار ہے اور کشمکشِ یاس و امید　　اب وہ بالیدگیِ شوق کا ہنگام کہاں

دیکھے کوئی نیرنگِ محبت کے یہ نقشے　　کرتے ہیں جفا آپ تو دیتا ہوں دعا میں
آزردگیِ شوق بھی کیا شے ہے کہ حسرت　　جانا نہ کسی نے وہ خفا ہیں کہ خفا میں

کیسے چھپاؤں رازِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں　　دل کی تپش کو کیا کروں دردِ جگر کو کیا کروں
غیر ہیں گرچہ ہمنشیں بزم میں ہے تو وہ حسین　　پھر مجھے لیجلا وہیں، ذوقِ نظر کو کیا کروں
حال مرا تھا جب بتر تب تو ہوئے نہ تم خبر　　بعد مرے ہوا اثر، اب میں اثر کو کیا کروں
دلکی ہوس مٹا تو دی؛ انکی جھلک دکھا تو دی　　پر یہ کہو کہ شوق کی "بار دگر" کو کیا کروں
شورشِ عاشقی کہاں اور مری سادگی کہاں　　حسن کو تیرے کیا کہوں اپنی نظر کو کیا کروں

ان کو دیکھوں یہ مجھ میں تاب کہاں　　لے چلا ہے دلِ خراب کہاں
بے مثالی کی ہے مثال وہ حُسن　　خوبیِ یار کا جواب کہاں
چھوڑ دوں عفوِ حق پہ فکرِ گناہ　　مجھ سے ہوتا ہے یہ حساب کہاں

اب جو بگڑے تو خوشامد نہ کریں گے ہم بھی　　کہ منانے سے وہ کچھ اور خفا ہوتے ہیں
بے کہے حُسن سے کہہ جائیں گے ہم شوق کی بات　　کچھ یونہی خوب مطالب بہ ادا ہوتے ہیں
دل سے مجبور نہ ہوتا تو نہ آتا حسرت　　آپ اس بات پہ ناحق کو خفا ہوتے ہیں

حُسنِ بے مہر کو پروائے تمنا کیا ہو — جب ہو ایسا تو علاجِ دلِ شیدا کیا ہو
رات دن رہنے لگی اس ستمِ ایجاد کی یاد — حسرتؔ اب دیکھئے انجام ہمارا کیا ہو

یہ عادت ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو — کون ٹالیگا بھلا آپ کے فرمانے کو
بھول جاؤں میں انھیں ہو نہیں سکتا ناصح — آگ لگ جائے جو ظالم ترے سمجھانے کو

کافی ہیں تیرے سودائیوں کو — جا بجا ہے روشن دلہائے آگاہ
اس نازنیں کی محفل میں ایک دن — لے چل مجھے بھی اے شوق گمراہ
فرقت کی شب میں کیا ہو جو حسرتؔ — آجائے تجھ تک وہ شوخ ناگاہ

تیار صلحِ شوق کے سامان ہو گئے — جتنے تھے اُن کے جور سب احسان ہو گئے
اُن کی نگاہِ قہر کو ہم نے منا لیا — پھر اس طرح کہ خود بھی وہ حیران ہو گئے

انکار اور اُس جرعۂ صہبا سے بھی انکار — ساقی یہ تری شرم کبھی یاد رہے گی

گر وفادار نہیں اغیار کا خونا ہے یہی — جان سے ہم بھی گزر جانے کو سوچا ہے یہی
شناسۂ اہلِ جہاں کی تجھے پروا کیا تھی — ہم بھی جیسے ہوں ہوے حال پہ رونا ہے یہی
دشمنیں کے جو ستم تجھ کی ایذا ہے یہی — اک اک روز ترے عشق میں ہونا ہے یہی
گوارا ہے بہت تلخی تیرا ان لیکن — تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
یہ تو ایک دردِ محبت کی خلش ہے حسرتؔ — مقصدِ دل ہے یہی جانِ تمنا ہے یہی

اثر ہوا بھی تو اُلٹا اثر دعا میں ہوا — سکونِ یاس ملا اضطراب کے بدلے
فریب سب ہیں یہ آغازِ عشق کے حسرتؔ — وہ لیں گے اس کرمِ بے حساب کے بدلے

جمالِ یار کی رنگینیاں ادا نہ ہوئیں — ہزار کام لیا ہم نے خوش بیانی سے

ابھی کچھ اور دمِ واپسیں ٹھہر جاتا — کچھ اور بھی جو ترا انتظام ہم کرتے
وہ وقت بھی کہیں آتا کہ عرضِ حال کے بعد — تری جفا پہ تجھے شرمسار ہم کرتے
ابھی سے تجھ پہ فدا ہو گئے تو غم کیا ہے — کہ یہ وہی ہے جو پایانِ کار ہم کرتے

تاثیرِ برقِ حُسن جو اُن کے سخن میں تھی — اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب — آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی
اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرتؔ سے مٹ گئی — ہیبت سی اک جو خطۂ دار و رسن میں تھی

بہت خجل ہے ترے درد سے دعا میری — یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری

پہنچے وہ تجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی — وہ جانتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری
کہیں وہ آ کے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف — کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

اس پہ بھی کچھ ایسا ہے راضی ہیں باہم دونوں — ہم شاد نہیں ہوتے تم یاد نہیں کرتے

میں ہوں کیا میری محبت کی حقیقت کیا ہے — اُسے یہ بھی تو نہ پوچھا تری حالت کیا ہے
تجھ سے برگشتہ نہ ہوتے تو تعجب ہوتا — آپ کو عذرِ تغافل کی ضرورت کیا ہے

پہلے تو ارزاں تھی متاعِ وفا — اب یہ مرے بعد گراں ہو گئی
تم سے تھی مخصوص پر اب وہ نظر — مائلِ نازِ دگراں ہو گئی
موت سے پوری ہوئی شرطِ وفا — پر نہ کہا تم نے کہ ہاں ہو گئی

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے — ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق — تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
بار بار اُٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا — اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا — اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً — اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ — حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف — وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے — وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے — جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ — مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے
باوجودِ ادعائے اتقا حسرتؔ مجھے — آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے — مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حُسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انھیں — کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے

دنیائے ستم بے حساب رہنے دے — خراب حالِ وفا کو خراب رہنے دے
بہارِ عشق تری چشمِ نیم وا پہ نثار — نہ ڈال تجھ پہ یہ افسونِ خواب رہنے دے
میں چاہتا تو بہت ہوں کہ چپ رہوں حسرتؔ — پہ جب یہ خاطرِ بے صبر و تاب رہنے دے

(جملہ ۱۴۵ اشعار)

۱۹۱۶ء - ۱۹۱۷ء

جلوۂ امید گویا درمیانِ فکر و یاس — اک نمونہ ہے چراغِ رہ گذارِ باد کا

سُن کے ذکرِ عشق رہ جاتے ہیں اکثر ہم خموش   اب تلک اتنا اثر باقی ہے اُن کی یاد کا

دلِ مایوس کو گر دیدۂ گفتار کر لینا   وہ ان کا پردۂ انکار میں اقرار کر لینا
سکونِ یاس بھی ممکن نہیں اب ہم غریبوں کو   قیامت ہے کسی کا وعدۂ دیدار کر لینا
یہ کیا ایذا پسندی ہے کہ حسرتؔ عشقِ جاناں میں   تجھے ہر عقدۂ آساں کو بھی دشوار کر لینا

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا   اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا
کیا کہا میں نے جو ناحق تم خفا ہونے لگے   کچھ سنا بھی یا کہ یونہیں فیصلا ہونے لگا
کیا ہوا حسرتؔ وہ تیرا ادعائے ضبطِ غم ،   دو ہی دن میں رنجِ فرقت کا گلا ہونے لگا

کچھ مرے کام نہ آئے گا طبیبوں کا علاج   بے ترے کس سے ہو برگشتہ نصیبوں کا علاج
کیا ہوا گر نہ کیا اُس نے دلِ زار پہ رحم   کون کرتا ہے بھلا ایسے غریبوں کا علاج
حالِ دل پہلے ہی ابتر تھا اور اب تو حسرتؔ   نہ عزیزوں کی دُعا ہے نہ طبیبوں کا علاج

باطن میں ہیں آزاد، بظاہر ہیں نظر بند   ہے دیدۂ دل باز یہاں دیدۂ سر بند
اُس غم طلبی کی بھی کوئی حد ہے کہ حسرتؔ   بیچین ہوتے ہم جو ہوا دردِ جگر بند

چھپ نہیں سکتی چھپانے سے محبت کی نظر   پڑ ہی جاتی ہے رُخِ یار پہ حسرتؔ کی نظر
ہجر میں رہنے لگیں اور بھی کچھ یاد ہمیں   وہ مراعات کی باتیں وہ مروت کی نظر

ہم پر نگاہ یار سے گزرا جو حادثہ کبھی   ہے آج تک وہ پیشِ نظر ماجرائے ناز
اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار   اِک بات اُنھیں اور بھی کچھ ہے ورائے ناز
شوقِ بقائے یار میں مرتے تو ہو مگر   حسرتؔ جو نقدِ جاں بھی نہ ٹھہرے بہائے ناز

کی میں نے لطفِ یار کی پہلے نہ کچھ بھی قدر   ہوتی ہے کس سے جنسِ فراواں کی احتیاط
رنگینیِ سخن میں بھی ہے سادگی کی شرط   مشکل ہے اس فریضۂ آساں کی احتیاط

آئی جو ترے روئے منور کے قریں شمع   ہم لوگ یہی سمجھے کہ محفل میں نہیں شمع

کیوں کہیں ہم کہ غمِ دہر سے مشکل ہے فراغ   جب تری یاد میں ہر فکر سے حاصل ہے فراغ
کوئی دل عشق سے آباد نہیں ہے، گویا   آپ کے عہد میں اِک دعویٰ باطل ہے فراغ

اے سحر حسن بہار میں اب تجھ سے کیا کہوں   دل کا جو حال تیری بدولت ہے آج کل
شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی   تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آج کل
اِک طرفہ بیخودی کا ہے عالم کہ عشق میں   تکلیف آج کل ہے نہ راحت ہے آج کل

اس تغافل پر بھی کرتے ہیں تجھی کو یاد ہم   کتنے ہیں مجبور دیکھ اور بانیِ بیداد ہم
آئے تھے محفل میں تیری باہزاراں آرزو   یا چلے ہیں ایک لے کر خاطرِ ناشاد ہم
مار ڈالا مجھ کو حسرتؔ یونہیں جب اُسنے کہا   ماننا ہوگا تجھے کرتے ہیں جو ارشاد ہم

ہم پر تری نگاہ جو پہلے تھی اب نہیں   سو بھی نہ کچھ دنوں میں رہے تو عجب نہیں

تھے بسکہ دلپذیر محبت کے واقعات   کچھ کچھ وہ اب بھی یاد مجھے ہیں جو سب نہیں
حسرتؔ جفائے یار تو اک عام تھی ادا   اظہارِ التفات مگر بے سبب نہیں

اُسی سے چھپتے ہیں ہوتی ہے جس پر اُن کی نظر   اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں
شکایت اُن کی نہ چاہو یہی کہو حسرتؔ   نشانۂ ستمِ روزگار ہم بھی ہیں

مانا کہ رسا ہیں ترے نالے مگر اے دل   اتنا بھی نہیں کرتے ہیں مجبور کسی کو
اب صدمۂ ہجراں سے بھی ڈرتا نہیں کوئی   لے پہونچی ہے یاد اُن کی بہت دور کسی کو

دِل غم سے جو کہتا ہے محبت کا بُرا ہو   ایسے میں تری یاد بھی آجائے تو کیا ہو

مرتا ہے اسی شوخ جفاکار پہ حسرتؔ   شاید یہ فسانا کہیں تم نے بھی سُنا ہو

ہم نے تو نثار کر دیا دِل   اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے
اب کا ہیکو آئیں گے وہ حسرتؔ   آغازِ جنوں کے پھر زمانے

مجھ میں تابِ جمالِ یار کہاں   شوق انھیں میرے روبرو نہ کرے
جانِ حسرتؔ کی ہجر میں تسکین   اور پھر کس سے ہو جو تو نہ کرے

عشق میں خوفِ جاں سے درگزرے   ہم نے ٹھانی جو دل میں کر گزرے
زندگی اپنی ہوکے اُن سے جدا   سخت گزرے گی، اب اگر گزرے
اُن سے اظہارِ شوق کون کرے   جان ہی سے کوئی مگر گزرے
اُن کے قدموں پہ رکھ دیا سرِ شوق   ہم یہ کیا بےخودی میں کر گزرے

سرِ پُرشور بھی ایک بار تھا جسکو مری گردن   ترے کوچے میں آج اے فتنۂ دوراں اُتار آئے
تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے   تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی
بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی مگر حسرتؔ   جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشمِ سحرکار آئی

شبِ فرقت میں یاد اُس بیخبر کی بار بار آئی   بھلانا ہم نے بھی چاہا مگر بے اختیار آئی
الٰہی رنگ یہ کب تک رہیگا ہجرِ جاناں میں   کہ روزِ بیدلی گزرا تو شامِ انتظار آئی

یہی ہے فصلِ گل میں اے دل یہ بے خروشی   مستانہ کیوں نہ گزرے ہنگامِ بادہ نوشی
آغازِ عاشقی تھا جوش و خروش یکسر   یا انتہائے غم ہے حیرانی و خموشی
دیدار کی طلب میں حد سے گزر چلی ہے   اپنی امیدواری اُن کی بہانہ کوشی

(جملہ ۳۰ اشعار)

۱۹۱۷ء - ۱۹۱۸ء

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا   شغل بیکار ہیں سب اُن کی محبت کے سوا
کون رکھیگا ترے غم سے دل و جاں کو عزیز   کچھ نہیں اور جب اس رنج میں راحت کے سوا
اس کی بات اور ہے پائیں جو ہم اس میں بھی مزا   آپ نے تو نہ دیا کچھ بھی اذیت کے سوا
سب سے مُنہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم   اس میں اک شان فراغت بھی ہے راحت کے سوا
عقل حیران ہے، اے جانِ جہاں راز ترا   کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

کاہیکو دل اے عشق ترے غم سے بچے گا   اب ہم نہ بچائیں گے نہ یہ ہم سے بچے گا

میری جانب سے شکایت نہ تقاضا ہوتا   خود مرے گھر وہ چلے آتے کچھ ایسا ہوتا

دیکھنا بھی تو اُنھیں دور سے دیکھا کرنا   شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رسوا کرنا
اُن کو یاں وعدے پہ آلینے دے اے ابرِ بہار   جس قدر چاہنا پھر بعد میں برسا کرنا
شام ہو یا کہ سحر، یاد اُنھیں کی رکھنی   دن ہو یا رات، ہمیں ذکر انھیں کا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت   اُن سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا

نظر پھر نہ کی اُس پہ دل جس کا چھینا   محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا

سیرِ گل خوش نہیں آئی کسی عنوان ہمیں   جا کے لوٹ آتے ہیں دیوارِ گلستاں کے قریب

انھوں نے پھیر دیا خط یونہیں سلام کے بعد   بڑھا کے میرا تخلص بھی میرے نام کے بعد
کمالِ شوق کو آتے ہیں ناتمام نظر   تمام شوق تری خواہشِ تمام کے بعد
ہوئی یہ کثرتِ اربابِ اشتیاق کہ اب   پڑے ہیں سوچ میں حسرت وہ اذنِ عام کے بعد

عمر ہی کیا ہے وہ کمسن ہیں ابھی نامِ خدا   اُن پہ مرنا ہے تو کچھ دن ہمیں جینا ہے ضرور

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم   گھبرا گئے ہیں بیدلیٔ ہمرہاں سے ہم
کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد   لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم
بیتابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو   آخر بچے نہ اُس نگہہِ بدگماں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق   پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

حسرت پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی   اچھا جو سر اُٹھائیں بھی اُس آستاں سے ہم

بزمِ دشمن میں بھی دل تھامے ہوئے بیٹھا رہا   غیر ممکن ہے جہاں اے شوق تو ہو میں نہ ہوں

پھر تقاضا ہے یہی مجھ سے کہ اُس محفل میں چل   اس دلِ بیتاب کی ضد کو الٰہی کیا کروں
پوچھتے ہیں وہ کہ ہم سے تیری خواہش ہے سو کیا   دلمیں جو تو کچھ ہے میرے اب بیاں نے کیا کہوں

ہجومِ شوق ہے دل میں مگر خاموش رہتے ہیں   چھپایا تھا یہ تم سے راز ہم نے آج کہتے ہیں

خدا جانے یہ اپنا حال کیا ہے ہجرِ جاناں میں   کہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں
خموشی کی عجب یہ گفتگو ہے وصل میں باہم   نہ کہتے ہیں وہ کچھ ہم سے نہ ہم کچھ اُن سے کہتے ہیں

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں   سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں
اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا   کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں
دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلّی سے کہیں   آپ اس کام کا زنہار ارادا نہ کریں
شکوۂ جور، تقاضائے کرم عرضِ وفا   تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں
حال کھل جائے گا بیتابیٔ دل کا حسرت   بار بار آپ اُنھیں شوق سے دیکھا نہ کریں
شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی   ورنہ ہم اور کرمِ یار کی پروا نہ کریں
جان ہی پہ نہ گزر جائیں کہیں اہلِ نیاز   شوق سے ناز کریں وہ مگر اتنا نہ کریں

پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو   مجھ کو دیکھو مرے مرنے کی تمنا دیکھو
جرمِ نظارہ پہ کون اتنی خوشامد کرتا   اب بھی وہ روٹھے ہیں لو اور تماشا دیکھو
ہم نہ کہتے تھے بناوٹ ہے یہ سارا غصّہ   ہنس کے لو پھر وہ انھوں نے ہمیں دیکھا دیکھو
گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال   شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو
ہوسِ دید مٹی ہے نہ مٹے گی حسرت   دیکھنے کے لیے چاہو اُنھیں جتنا دیکھو

مرادِ آرزو ہے مایۂ نازِ تمنا ہے   مرے دل سے کوئی پوچھے کہ تو اے فتنہ گر کیا ہے

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے   پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے
اُس جفاکار سے ملنے کی تمنا ہے مجھے   اب بھی میں کچھ نہیں کہتا یہی کہنا ہے مجھے
التفاتِ نگہِ یار کے لایق میں کہاں   مجھ سے بیگانہ رہیں وہ یہی اچھا ہے مجھے
مجھ سے بیکار وہ ظاہر میں خفا ہیں حسرت   جب میں چاہونگا منالونگا یہ دعویٰ ہے مجھے

پایا کہیں جو شکوۂ گزارِ جفا مجھے   بولے وہ ہنس کے آپ نے یہ کیا کہا مجھے
نزدیک ہے کہ اُن کے تغافل سے ہار کر   کرنی پڑے عتاب کی بھی التجا مجھے
ہر نغمے نے انھیں کی طلب کا دیا پیام   ہر ساز نے انھیں کی سنائی صدا مجھے

"ہرچند کہیں کہ وہ مگر ہو نہیں سکتی وفا مجھ سے"
تمہارے منہ سے یہ تکرار بھی پُر لطف ٹھہرے گی
یہ تم نے کیا کہا مجھ کو یہ تم نے کیا کیا مجھ سے
وہی باتیں سہی جو کر چکے ہو بارہا مجھ سے

دل اور تہیۂ ترکِ خیالِ یار کرے
کیسے یقین ہو، کون اس پہ اعتبار کرے
قرارِ جاں کے لیے اُس نے شیوۂ تسکین
کبھی جو اور کیا ہو تو اختیار کرے
گزر چکی ہے تمنّا کی حد سے دشواری
کہاں تک اور یہ ترا کوئی انتظار کرے

شکرِ جفا بھی اہلِ رضا نے کیا ادا
اُن سے یہی نہیں کہ شکایت نہ ہو سکی
خاموشیوں کا رازِ محبت وہ پا گئے
گو ہم سے عرضِ حال کی جرأت نہ ہو سکی
(جملہ ۵۵ اشعار)

۱۹۱۸ء-۱۹۲۲ء

اب تو فرقت میں تڑپنا بھی نہیں ممکن کہ تو
میری تاثیرِ محبت پہ گماں بیجا ہے گا
رائیگاں حسرت نہ جائے گا مرا مشتِ غبار
کچھ زمیں پہ جائے گا کچھ آسماں پہ جائے گا

شکوۂ غم ترے حضور کیا
ہم نے بیشک بڑا قصور کیا
آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے
نہ ملے حُسن کا غرور کیا

دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق
بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

عشق میں جذب کیا اثر بھی نہیں
مر مٹے ہم انھیں خبر بھی نہیں
چل چکا آپ کا فریبِ وفا
اب ہیں اس درجہ بےخبر بھی نہیں
اے دل اُن کو وفا کی خو ہی نہیں
درخورِ لطف یا کہ تو ہی نہیں
ثرتِ شوق سے ہمیں گویا
حسرت اب کوئی آرزو ہی نہیں

عشقِ بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے
آخر یہ میں نے اپنا کیا حال کر لیا ہے
خادم ہوں جان دیکر آنکھوں کو تو نے ظالم
رو رو کے بعد میرے کیوں لال کر لیا ہے

دیکھ لے اب بھی کہیں آکر جو وہ غفلت شعار
کس قدر ہو جائے مر جانے میں آسانی مجھے
بے نقاب آنے کو ہیں مقتل میں وہ بیشک مگر
دیکھنے کا ہے کہاں دیکھو کی میری حیرانی مجھے

ورنہ بھی ہو گئے بیگانہ وہ غفلت کر کے
آزمایا جو انھیں ضبطِ محبت کر کے
دل نے چھوڑا ہے نہ چھوڑے ترے ملنے کا خیال
بارہا دیکھ لیا ہم نے ملامت کر کے

گھبرائے تغافل سے تمنّا ہے ستم کی
حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

خو سمجھ میں نہیں آتی ترے دیوانوں کی
دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
ہر طرف بےخودی و بےخبری کی ہے نمود
قابلِ دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی
(جملہ ۱۸ اشعار)

۱۹۲۲ء-۱۹۲۳ء

منزلِ وصلِ یار ہے پیدا
درمیانِ حدودِ بیم و رجا

جانِ دیدار تم ہی نے کئے تھے حضور
ہم نے اور اُن سے کچھ کہا نہ سنا

غنچے ہیں دانتے نازک ان کی
کرنیں ہیں بے لطف چاندنی کا

اُن کے آگے لبِ فریاد بھی گویا نہ ہوتے
جب رہتے ہم تو دمِ شکوہ گزاری آیا

دل مجبور نہیں کہتے کہ رہ در سے اٹھتے
جس نے سو بار اٹھایا تو وہیں سو بار آیا

لطف کی اُن سے التجا نہ کریں
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
صبر مشکل ہے آرزو بےکار
کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں
بھول ہی جائیں ہم کو یہ تو نہ ہو
کون کہتا ہے وہ جفا نہ کریں
شوق ان کا سو مٹ چکا حسرت
کیا کریں ہم اگر وفا نہ کریں

کل تو رندوں میں ملا تھا مگر اب پھر بھی کہیں
دیکھئے حسرت کہاں ملے تاکہ نہیں
کچھ میرے حالِ زار کی اُن کو خبر نہیں
کیا میں ہی جا کے سنا دوں مگر نہیں
پرسش ہے میرے حال کی یارب جو روزِ حشر
اتنا بھی اب یہ قصۂ غم مختصر نہیں

نامرادوں کو شاد کام کرو
کرم اپنا کبھی تو عام کرو
سب کی خاطر کا ہے خیال مہیں
کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
پوچھتے ہیں جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

لاکھ اُس شوخِ جفاکار سے پرہیز کرو
شوق پھر بھی یہی کہتا ہے سب انگیز کرو

کیا کام انھیں پرسشِ اربابِ وفا سے
مرتا ہے تو مر جائے کوئی ان کی بلا سے
اک یہ بھی حقیقت میں ہے شانِ کرم اُن کی
ظاہر میں وہ رہتے ہیں جو ہر وقت خفا سے

میرا یہ حسنِ ظن کہ تغافل ہے التفات
دل کی یہ ضد کہ درد ہے درماں مرے لیے
فرمانِ قتل ہو جو نہیں اذن پائے بوس
آخر ہو کچھ تو اے شہہِ خوباں مرے لیے

بجا ہے دل زار کی ناصبوری   کہاں تک اٹھاتے کوئی رنج دوری
وہ تمہید ہی سے اڑا لیں گے مطلب   کہیں شوق نے کی نہ ہو بات پوری
تمنا نے کی خوب نظارہ بازی   مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

وہ چپ ہو گئے مجھ سے کیا کہتے کہتے   کہ دل رہ گیا مدعا کہتے کہتے
مرا عشق بھی خود غرض نہیں ہے   ترے حسن کو بے وفا کہتے کہتے

کیا ہا نہ اُن کی یاد سے ہوں شرمسار ہم   فرصت کبھی جو کشمکش روزگار دے
حسرت سے کہتے ہیں وہ بتا اپنی آرزو   اب کیا اُنھیں جواب یہ ناکردہ کار دے

اے عشق تازہ کار تری ابتدا کو ہم   جب سوچتے ہیں کہتے ہیں گویا ابھی تو ہے

۱۹۲۳ء

ہم شکوۂ فلک بھی کریں گے حضور دوست   ظاہر نہ ہونے دیں گے وہاں بھی قصور دوست

بار ہا کھائی ہو جس نے لب جاناں کی قسم   خضر کھاتے ہیں کیا چشمۂ حیواں کی قسم

یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء سے ۹ نومبر ۱۹۲۳ء

عہد یک عمر فراغت سے بھی خوشتر گزرا   وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا
تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصا اتنا   آج تک تیری جدائی کا یہ کیوں کر گزرا
یہ بھی اک بات ہے غیروں کے ستانے کو فقط   التفاتِ نگہ یار سے میں در گزرا
اب وہ آئیں بھی تو کیا روئیں بھی تو کیا حسرت   ہجر میں تجھ کو جو کرنا تھا سو تو کر گزرا

عاشق ہے تجھے پھر بھی کیا شکوۂ جفا   سچ پوچھئے تو ہم سے بجا ہے ملال دوست

مانوس ہو چکے تھے ازل ہی فنا سے ہم   اس انتہا کو جانتے ہیں ابتدا سے ہم
اس انجمن کے شوق میں جی کاریاں سہی   اک بار ان کو دیکھ تو لیں گے بلا سے ہم

آپ کو آتا رہا میرے ستانے کا خیال   صلح سے اچھی رہی مجھ کو لڑائی آپ کی

آخر ۱۹۲۳ء

رنج بیجا پہ کیا ہم نے جو اظہار ملال   ان کی چتون سے عیاں کچھ ہوئے آثار ملال

منعقد وقت مقرر پہ ملاقات ہوئی   آج یہ آپ کی جانب سے نئی بات ہوئی

مارچ ۱۹۲۴ء

قدموں پہ ان کے رکھ کے سر رفع ملال کر دیا   ہمت عذر خواہ نے آج کمال کر دیا

جلوۂ جاناں رہے حسرت ہوئی خوب غم سے فرصت   وہ کبھی نہ تم سے ملتے جو نہیں صبح شام کرتے

۱۹۲۵ء،۱۹۳۴ء

کرنے کو تو ہیں عہد کروں ترک ہوس کا   پر دل سے کہوں کیا جو نہیں ہے مرے بس کا

ہو رہی ہے صباح عشق طلوع   ہو چلے ہیں چراغ عقل خموش

تجھ کو اے محو تغافل میری پروا ہی نہیں   حال دل کس سے میں کہتا تو نے پوچھا ہی نہیں

۱۹۳۵ء ۔ ۱۹۴۰ء

شکوۂ جور و جفا کو چھوڑ کر شکر ستم   کیجئے اور خوب سا اُن کو پشیماں کیجئے

کوئی انکی بزم جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا   جو کبھی اٹھا بھی اٹھانے سے تو اُسی طرف نگراں اُٹھا
یہ خلوص غم کی نہ تھی کمی تو پھر اور کیا تھا کہے کوئی   کہ نہ اشد درد دل ہوئی نہ جنوں پرند جاں اُٹھا
یہ سزا کہاں یہ جزا ہوئی بخلاف خواہشِ مدعی   پئے قتل حسرت ملتجی خود اگر وہ جان جہاں اُٹھا

قسمت شوق آزما نہ سکے   اُن سے ہم آنکھ بھی ملا نہ سکے
دل میں کیا کیا تھے عرض حال کے شوق   اس نے پوچھا تو کچھ بتا نہ سکے
ہم تو کیا بھولتے انھیں حسرت   دل سے وہ بھی انھیں بھلا نہ سکے

جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لیے   اب وہ حاصل ہے تو اک زار ہے تیرے لیے

تھی کبھی یاد اُن کی وجہِ سکوں اب کسی حال میں قرار نہیں

کیا ہو یہ آج پوچھیں گے اس نازنیں سے ہم تجھ سا جو کوئی ڈھونڈھ نکالیں کہیں سے ہم

کھیلے ہم کھیل محبت کا انجام سے ہو کر بے پروا معلوم نہیں کیا پانا ہے معلوم نہیں کیا کھونا ہے
ہم سے چھٹنے کچھ ایسی گھڑی ملنے کی نہ پھر امید رہی اب یاس کی آہیں بھرنا ہیں خون کے آنسو رونا ہے

جنوری ۱۹۴۳ء سے دسمبر ۱۹۵۰ء تک

ہزار شکر کہ مستغنیِ شفا ہو کر مری دُعا بھی ترے غم سے شرمسار نہیں
بجا ہے مگر تری نسبت سے جانِ حسرت کو ترے فراق کا صدمہ بھی ناگوار نہیں

اب تک ہے یاد اے تندخو محفل میں وہ آنا ترا وہ سر جھکا دینا مرا وہ حکم فرمانا ترا
اس شوخ کا شکوا کیا، حسرت یہ تو نے کیا کیا اس سے تو اے مردِ خدا، بہتر تھا مر جانا ترا

دل ان سے مل کے اب ان کو بھلا نہیں سکتا مگر یہ کیوں ہے، میں خود بھی بتا نہیں سکتا
بقدرِ حوصلۂ عاشقی ہے شوقِ وصال مگر وہ شوق جو دل میں سما نہیں سکتا
یہ کس کے عجزِ تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ بہ زعمِ ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا
اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرت کوئی جو پوچھے کہاں ہے، بتا نہیں سکتا

رونقِ دل یوں بڑھالی جائے گی غم کی اک دُنیا بسالی جائے گی
دل نہ توڑو حسرتِ ناکام کا زلف تو پھر بھی بنالی جائے گی

چھوڑ کر اس بتِ بدخو کی محبت حسرت کہتے ہو کھا کے قسم کچھ بھی تمہیں غم نہ ہوا
خود فراموشیوں میں بھی تو ہمیں بھول جانا کسی کا یاد رہا۔

بدگماں آپ ہیں کیوں آپ سے شکوا ہے کسے جو شکایت ہے ہمیں گردشِ ایام سے ہے

پیمانِ وفا کے ایفا کا ہم ان سے تقاضا بھول گئے اسکا بھی تو اب احساس نہیں کیا یاد رہا کیا بھول گئے

(بشکریہ نگار لکھنؤ)



حامدی کاشمیری

حسرت کا شاعرانہ مرتبہ

اردو میں شاعری کی تنقید کے نام پر جو تحریریں ملتی ہیں، وہ تنقید کا صحیح اور اصلی مقصد پورا کرنے کے بجائے محض توضیح و توصیف تک محدود رہتی ہیں، چونکہ یہ تنقیدی عمل ایک آسان سا کام دکھائی دیتا رہا ہے، اس لئے اسے پیشہ ور نقادوں کے ساتھ ساتھ درس گاہوں کے معلم بھی کھلے بندوں استعمال میں لاتے رہتے ہیں۔ تنقید کے ایسے تشریحی رول کی افادیت سے انکار ممکن نہیں، مگر یہ بدقسمتی سے اتنی مقبولیت حاصل کر چکا ہے کہ تنقید کا اصلی رول (یعنی شاعری کی تخلیقی ہیئت کی شناخت اور اس کی تعین قدر) دھندلا ہو کر رہ گیا ہے، نتیجے میں اکثر و بیشتر شعرا کی اصلی امیج ابھی تک سامنے نہیں آسکی ہے، اس افسوس ناک صورتِ حال کا اطلاق میر، غالب اقبال جیسے سربرآوردہ شعرا پر بھی بہ آسانی ہوتا ہے، حالانکہ ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے دوسرے درجے کے شعرا کی تو بات ہی نہیں اس لئے کہ ان کے بارے میں اکّا دکّا مضامین لکھے گئے ہیں، اور وہ بھی تمام تر توصیفی اور تشریحی نوعیت کے، اس لیے ان کی قدر سنجی کا مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ حسرت بھی اسی ذیل میں آتے ہیں وہ موجودہ صدی کے شروع میں شعر کہتے رہے

انہوں نے غزل کو ذریعۂ اظہار بنایا، اور اس میدان میں خاصی مقبولیت حاصل کی یہاں تک کہ وہ نقادوں کے لئے لائق توجہ بن گئے، اور ان کی شاعری اور شخصیت پر مضامین لکھے گئے ان مضامین کو پڑھ کر میرا یہ تاثر اور زیادہ گہرا ہو گیا ہے کہ ہماری تنقید محض تشریح و تفسیر بن رہ گئی ہے، حسرت کی شاعری کے چند نمایاں پہلوؤں مثلاً غزل گوئی، عشق یا انداز بیاں کی چند سامنے کی خصوصیات کو گنانے سے (جیسا کہ نقادوں نے عام طور پر کیا ہے) اس کے تخلیقی ذہن کی اپج، اس کے خطرات اس کی انفرادیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، ہر نیا اور سچا شاعر اپنا مخصوص تخلیقی ذہن لے کر آتا ہے، اور تجربات کے بعض نادیدہ جہانوں کی بازیافت و تسخیر کرتا ہے، اگر تنقید ان معاملات کی چھان بین نہیں کرتی، تو اس کا وجود بیکار ہو جاتا ہے، اردو کے نقاد شاعر کے مرتبے کے تعین کے دشوار طلب کام میں ہاتھ ڈالنے سے احتراز کرتے ہیں، وہ بڑی فیاضی سے ہر صاحب دیوان شاعر کے سر پر عظمت کا تاج رکھتے ہیں حسرت کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے، ان کے تخلیقی شعور سے تعرض کرنے کے بجائے ان کی عظمت کے گن گائے گئے ہیں، رشید احمد صدیقی کہتے ہیں

"معاصر غزل گو بھی اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں، پھر بھی حسرت کی غزل گوئی ممتاز و منفرد ہے"

سید احتشام حسین لکھتے ہیں، "حسرت موجودہ دور کے سب سے بڑے غزل گو شاعر تسلیم کیے گئے ہیں، اور اردو شاعری کے مسلسل ارتقا میں ان کی ایک اہم جگہ ہے"

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں،

"دوسرے دور (یعنی سنہ ۱۹۲۰ء تک) کے سب سے بڑے کلاسیکل شاعر حسرت ہی ہیں"

غور سے دیکھا جائے تو حسرت کے بارے میں یہ خیالات، تنقیدی شعور کا زائیدہ ہونے کے بجائے عقیدت پسندانہ رویے کی غمازی کرتے ہیں حسرت نے غزل کی روایت سے قلبی وابستگی کا ثبوت ضرور دیا ہے، اور اس روایت کو پُرخلوص مساعی سے زندہ بھی رکھا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہوں نے غزل کو معنوی یا صوری اعتبار سے کوئی نئی جہت عطا کی ہے، یا اپنے غیر معمولی شعری کارناموں سے عظمت حاصل کی ہے، صحیح نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ حسرت، فانی کی طرح، غزل کی قدیم روایت کے اسیر رہے وہ قدیم اساتذہ کی پیروی کرتے رہے؛

شعری زندگی میں متقدمین یا معاصرین سے فیض یابی کا رجحان تقریباً ہر بڑے شاعر کے یہاں ملتا ہے، لیکن عام طور پر یہ رجحان ابتدائی دور میں کارفرما رہتا ہے، اور بعد میں وہ دور آتا ہے، جب شاعر اپنے تخلیقی وجود کو مکمل طور پر دریافت کرتا ہے، اور دوسروں کے اثرات کی نفی کرتا ہے۔ حسرت کی زندگی کا اکثر حصہ تقلید ہی کی نذر ہوا اس لئے وہ اپنی آخیر عمر تک تخلیقی قوتوں سے کما حقہ واقف نہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ وہ شخصیت کے فکری عناصر کو گرفت میں لانے سے قاصر رہے وہ لاشعور کی ان تاریک گہرائیوں تک بھی رسائی حاصل نہ کر سکے، جہاں سے تخلیق کے نورانی سرچشمے پھوٹتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ شعوری سطح پر فوری طور پر محسوس کئے جانے والے جذبات کے دائرہ میں بند رہے، یہ وہ کوتاہیاں ہیں، جو حسرت سے ان کی عظمت چھین لیتی ہیں اور انھیں صفِ دوم کا شاعر بناتی ہیں۔

موضوعی اعتبار سے حسرت کی شاعری حد درجہ یک رنگی کی شکار ہے، ان کی کُل کائنات حسن وعشق کے موضوعات ہیں، اور وہ بھی ہجر و وصال کے فرسودہ موضوعات جن کا اعادہ، شاعری کی تخلیقی حیثیت ہی کو مشکوک بناتا ہے، خاص کر جب یہ دیکھا جائے کہ اظہار وبیان کے معاملے میں بھی روایت ہی پر انحصار کیا گیا ہے۔ حسرت جس دور میں شاعری کرتے رہے، وہ شعری شعور میں گہرے انقلاب اور تجربہ کاری کا دور تھا، ملکی اور بین الاقوامی سطحوں پر زندگی زبردست بحران اور انتشار کی زد میں تھی اس کا ادراک اس دور کے فن کاروں مثلاً ایلیٹ، جوائس اور اقبال کے یہاں ملتا ہے، حسرت اس سے یکسر لاتعلق ہیں حد تو یہ ہے کہ ملکی سطح پر بھی سیاسی، سماجی اور معاشی کشمکشوں اور تبدیلیوں کے اثرات سے وہ محفوظ و مامون رہے حالانکہ ان کا تعلق عملی سیاست سے رہا، خارجی حالات سے لاتعلقی کا یہ رویہ ان کی تاثرپذیری کے تعلق سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، تاہم واضح رہے کہ میں ان کی شاعری میں عصری آگہی کے اظہار پر اصرار نہیں کرتا ہوں اور عصری آگہی کو ان کی شعری حیثیت منوانے کے لئے لازمی قرار نہیں دے رہا ہوں، اس لئے کہ خارجی حقیقت کا سامنا کرنے پر شاعر کے شخصی رویوں کے تعین کے بارے میں کوئی حکم لگانا شعری حیثیت کی کار آگہی اور خودمختاری سے انکار کرنے کے مترادف ہے، شعری رویوں کی تعین میں بہت سے خارجی اور داخلی عوامل کام کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبال کے زمانے میں فانی، اختر شیرانی اور جگر جیسے شعراء بھی تھے، جو بے حد شخصی اور منفرد رویوں کا اظہار کرتے ہیں اقبال کے یہاں آشوب عصر کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ جب کہ فانی 'محزوں خیالوں' کے اسیر رہے، اختر شیرانی داخلی دنیا میں نادیدہ بستیوں کی تلاش کرتے رہے، اور جگر وارفتگی عشق میں ڈوبے رہے، ان مختلف اور متضاد، اور اکثر حالتوں میں اپنے عہد سے برگشتہ رویوں کو جو چیز اعتبار کا درجہ عطا کرتی ہے، وہ تخلیقی حیثیت ہے، اور یہ تخلیقی حیثیت ہی کی بخشی ہے۔ جو شاعر کے مرتبے پر اثرانداز ہوتی ہے۔ حسرت اگر اپنی تمام عمر محض معاملاتِ عشق کے شخصی اظہار کے لئے وقف کرتے (جیسا کہ وہ کر چکے ہیں) تو بھی ان کی اہمیت مسلم ہوتی، بشرطیکہ وہ غیر معمولی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لاتے، مشکل تو یہ ہے کہ وہ غیر معمولی تخلیقی قوتوں سے متصف ہیں ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تجربات کی بوقلمونی نہیں ملتی، ان کا دائرہ خیال بہت محدود ہے وہ فکری سطح پر زندگی کے مسائل پر نہیں سوچتے، عشق ان کا محور سہی، لیکن عشق کے تجربے بھی ان کے یہاں عامیانہ اور روز مرہ ہو کر رہ گئے ہیں، ان میں اس علامتی معنویت کا دور دور تک پتہ نہیں جو میر اور غالب کا خاصہ ہے،

ان کی عشقیہ شاعری کے اس پہلو کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے کہ ان کا نظریۂ عشق روایتی نہیں، حقیقی ہے، یعنی وہ خیالی محبت نہیں کرتے بلکہ ایک مخصوص تہذیبی ماحول کی پروردہ لڑکی سے عشق کرتے ہیں، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اسی بات کو ان کی اہمیت کا ضامن قرار دینا مناسب نہیں، اردو کی عشقیہ شاعری، بلاشبہ روایتی، خیالی اور افلاطونی رہی ہے، عام طور پر روایت کی تقلید کی گئی ہے۔ تاہم میر اور غالب کے یہاں عشق کی ارضی اور جنسی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مومن یا مصحفی کے یہاں عشق کا جو جسمانی پہلو ابھرتا ہے۔ وہ اسے محض خیالی ہونے سے بچاتا ہے، اس پس منظر میں عشق کے تعلق سے بھی حسرت کی انفرادیت کا کوئی واضح نقش نہیں ابھرتا، یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ کسی شاعر کے یہاں عشق کے عام اور مانوس جذبات کی نشان دہی کرنا ہی اس کی انفرادیت یا عظمت کا ثبوت نہیں ہو سکتا، بالکل اسی طرح جس طرح دیگر خارجی یا داخلی کوائف کی عمومی ترجمانی، اعلیٰ شاعری کی ضامن نہیں ہو سکتی، شاعری تخلیقی ذہن کا جوہر لطیف ہے۔ تخلیقی ذہن کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ایسے تجربے اور کیفیات وجود میں آجائیں، جو جدت بخش مانوسیت اور انوکھے پن سے لوگوں کے تجربے کی زد میں ہیں، ان سے شعری ذہن کی گہرائی اور انفرادیت سے انکار کرنے کے برابر ہے، میر کی عشقیہ کیفیات اپنی تجریداتی، انوکھے پن، مافوق فطری انداز اور علامتی معنویت سے عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند ہو جاتی ہیں۔ ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

جیسے شعر میں عشق محض عشق نہیں۔ بلکہ

اش تشفت، عدم اور تباہی کی علامت بن جاتا ہے، اس تناظر میں دیکھیے تو حسرت کی عشقیہ شاعری چند ایسے مانوس اکھرے اور عمومی تجربات یعنی محبوبہ کی جوانی، جدائی، وصل، اس کے چھت پر ننگے پاؤں آنے، نیند سے جاگنے اور خوشبوئے پیرہن تک محدود ہو جاتی ہے، اور یہ بقول خلیل الرحمن اعظمی "وہ جذبات وکیفیات ہیں جو عنفوان شباب میں پیش آتی ہیں" ظاہر ہے کہ یہ کیفیات جو محض جذباتی ابال کا نتیجہ ہیں۔ اعلیٰ شاعری کو جنم نہیں دے سکتیں۔

حسرت کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "وہ باتیں اس انداز کہتے ہیں کہ دل میں اتر جاتی ہیں" خود حسرت نے بھی کہا ہے: ؎

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

حسرت کے اس نظریے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا شعری ذہن پیچیدگی سے یکسر محروم رہا ہے اس نظریے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ شعر میں آمد کے قائل ہیں۔ صحیح نہیں، اس لئے کہ آمد کا اطلاق سامنے کی باتوں کو نظمانے پر نہیں، بلکہ تجربے اور بیان کی کیمیائی وحدت پر ہوتا ہے حسرت کی شاعری کا معتد بہ حصہ فارسیت سے بوجھل ہے، دوسری بات یہ ہے کہ روایت کے زیر اثر ان کے نزدیک شعری خوبی کا یہ معیار رہا ہے کہ اس میں جانی پہچانی کیفیات کو پیش کیا جائے، تاکہ قاری کو انھیں گلے سے اتارنے میں وقت نہ ہو، انہوں نے ایسا ہی کیا، اور اس میں وہ کامیاب رہے،

حسرت کی شاعری کی حد بندیوں اور اس کے بارے میں تنقید کی نارسائیوں کو مدنظر رکھ کر یہ سوال زیادہ ہی اہم ہو جاتا ہے کہ آخر اردو شاعری میں ان کی کیا حیثیت ہے، کیا ان کو ایک روایتی تقلیدی اور سطحی ذہن کا آدمی قرار دے کر رد کیا جائے۔ یا ان کے شعری ذہن کی کسی ایسی خصوصیت کو تسلیم کیا جائے جو انھیں اردو شاعری کی تاریخ میں زندہ رکھنے کی ضامن ہو، میرا خیال ہے کہ ان کی شاعری کے دو پہلو ایسے ضرور ہیں، جو لائق توجہ ہیں، اور جو انھیں ایک اچھا شاعر ماننے میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں، اول یہ کہ انھوں نے بعض اشعار میں عشق کو جمالیت کا درجہ عطا کیا ہے۔ ؎

حسن ہو جس میں وہ ہر شے جلوہ گر اس دل میں ہے
جذبۂ صورت پرستی میرے آب و گل میں ہے

جذبۂ صورت پرستی سے گذرتے ہوئے ان کی شخصیت کا حسیاتی پہلو آئینہ ہو جاتا ہے۔ وہ صنف نازک سے قریبی رشتہ قائم کرتے ہوئے اپنی حسیاتی کیفیات کی لذت کا احساس کرتے ہیں، اس طرح سے جسم یا جنس ان کے یہاں ہوس پرستی کی سطح سے بلند ہو کر حسیاتی لذت آگہی میں تبدیل ہوتا ہے۔ یہ ایک تقلیبی عمل ہے جو شاعر کے ذہنی ارتقاع کو ظاہر کرتا ہے ایسے اشعار میں حواس خمسہ کی تشفی کا سامان ہوتا ہے حسرت کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک خوبصورت اور جوان عورت کے جسم کو، اپنی لطافتوں رعنائیوں اور خوشبوؤں کے ساتھ، قربت میں، بیداری میں سوتے میں، آرائش میں اور شرم و حجاب میں دیکھا اور محسوس کیا ہے، اور اپنے محسوسات کو لفظوں کے پیمانوں سے چھلکا دیا ہے، ان کے یہاں عورت کا جسم جنس زدہ نہیں، بلکہ "سرشار محبت ہے، اس لیے ایسے اشعار میں جمال پیکر کی رنگینیوں" کی ایک نشہ آور فضا قائم ہو جاتی ہے۔ جو قاری کے لئے کشش رکھتی ہے، اور اسے خوشبوئے بدن سے آشنا کرتی ہے۔ ؎

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
سر کہیں، بال کہیں، ہاتھ کہیں پاؤں کہیں
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو
رنگ تیری شفق جمالی کا
اک نمونہ ہے بے مثالی کا

محبوبی و رنگینی ہیں جز و بدن تیری
سرشار محبت ہے خوشبوئے بدن تیری

چونکہ حسیاتی وجود کی باز آفرینی کا عمل ان کے یہاں شعری تجربے کی تجسیم پر منتج ہوتا ہے۔ اس لئے پیکر تراشی کے بعض عمدہ نمونے سامنے آتے ہیں ؎

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا آتش گل سے چمن تمام
تاثیر برق حسن جوان کے سخن میں تھی
اک لرزش خفی مرے سارے بدن میں تھی

دوسرا پہلو (ایک بہت ہی خفیف سا پہلو) یہ ہے کہ ان کا شعری ذہن گاہے گاہے جذبات کے خود ساختہ حصاروں کو پھاند کر فکری بلندی پہ آ کر بعض نادیدہ اور امکانی واردات کا سامنا کرتا ہے، ذہنی تفاعل کے ایسے آزادانہ لمحے ان کے یہاں بہت کم آتے ہیں، لیکن جب بھی آتے ہیں، ان کی شعری سطح بلند ہو جاتی ہے، ایسے نایاب لمحوں میں وہ بعض انسانی مسائل وکوائف مثلاً گم شدگی، کرب، آرزو، خوف، محرومی اور جستجو کی پیکر تراشی پر قادر ہو جاتے ہیں مثلاً، ؎

اک بڑی منزل پر خوف و خطر ہے درپیش
روح کو عالم بالا کا سفر ہے درپیش

گر جوشش آرزو کی حسیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آج کل
کیفیت بہار کی شدت چمن میں تھی

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے

علی کریم ارتضیٰ

حسرت موہانی

فکر و فن کے آئینے میں

آج جب کہ شاعری کا معیار محض اظہار و ابلاغ تک محدود نہیں ہے، بلکہ شعر میں شعریت کی تلاش تک جا پہونچا ہے ایسے میں حسرت موہانی کی شاعری پر جب نگاہ پڑتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ حسرت موہانی کی شاعری کا ڈانڈا ابھی اردو کے متوسطین غزل گویوں سے ملتا ہوا ہے اور وہ اپنے دور سے بہت آگے نہیں جا سکے ہیں۔ خصوصاً آج کی غزلیں فن شعر گوئی کے اعتبار سے ارتقا کی اس منزل پر ہیں جہاں ان کے اشعار سے اکہرا پن دور ہو چکا ہے اور معنی کی تہہ داری نے انھیں شعریت عطا کر دی ہے۔ ایسی صورت میں حسرت موہانی ایک ایسے غزل گو بن کر سامنے آتے ہیں جنھیں ہم تقلیدی دنیا تک محدود رکھ سکتے ہیں مگر ہر تقلیدی کاوش اپنے اندر کچھ نہ کچھ منفرد خوبیاں رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے حسرت بھی اردو شاعری کی تاریخ میں ایک مقام کے حامل ہیں

رہ گیا معاملہ حسرت موہانی کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کا، تو جہاں تک میرا مطالعہ کام کرتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری اپنے عہد کا آئینہ ہے اس عہد کی جب قدریں دم توڑ رہی تھیں اور نئی صورتیں پیدا ہو رہی تھیں، وہ عہد جب کہ سماجی، سیاسی اور معاشی بحران، تخلیق کاری کی دنیا میں بھی ایک ہل چل بپا کیے ہوئے تھا۔ یہی عوامل حسرت موہانی کی شاعری کے محرک بھی ہیں اور موضوع بھی۔ ویسے غزل گوئی میں عشق و عاشقی کا تذکرہ نہ ہو، تصوف کے موضوعات پر اظہار خیال نہ ہو پھر غزل کی روایت میں اجتہاد کی صورت نظر آتی ہے۔ جیسا کہ جدید شاعری نے اپنی شاعری میں رویہ اپنایا ہے حسرت کی شاعری ان تمام موضوعات کا احاطہ تو کرتی ہے مگر احساسی محرکات کو گرفت میں نہیں لے پاتی۔ بہرحال ہم حسرت کی شاعری پر نگاہ ڈالنے سے پہلے ان کے عہد پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں حسرت کی شاعری کے موضوعات اور ان کے فن کی جدت کا تجزیہ کر سکیں۔

حسرت موہانی کا زمانہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا زمانہ ہے، ان کا معصوم بچپن اس دور انتشار سے گذرا ہے، جس میں غدر کے انتشار اور تباہی کے بعد ایک سکوت کی کیفیت طاری تھی۔ سینکڑوں برس کی مسلم تہذیب کا چراغ مدھم ہو رہا تھا۔ اور مغربی تہذیب کی میناکاری سے ایک نئی صورت پیدا ہو رہی تھی، ایسے میں، جو کبھی ارباب حکومت رہے تھے، محکومیوں کے درد و داغ سے آشنا ہو رہے تھے۔ دوسری طرف وہ صورت حال رفتہ رفتہ سامنے آ رہی تھی جو رول لیگ کے ذریعہ خوش آیند مستقبل کی تصویر دکھا رہی تھی۔ غرض کہ اس دور کا ہر شاعر و ادیب امید و یاس کے دوراہے پر کھڑا ہوا عالم استعجاب میں تک رہا تھا —— حسرت بھی اس دور کے بطن سے ابھرے تھے۔ اور نئے دور کی حسین تصویر تک رہے تھے۔ زندگی میں انھوں نے انقلاب کی صورت اس وقت دیکھی جب ہندوستانی پھر سے اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ قومی جذبات سیاسی اور سماجی بیداری کی لہر طلبا کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی —— علی گڑھ تحریک اپنی مکمل شکل میں ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ شروع ہوئی یہ تحریک صرف ایک سیاسی، سماجی اور تعلیمی تحریک ہی نہیں تھی بلکہ ادبی تحریک بھی تھی۔ یہ اردو ادب میں پہلی منظم تحریک تھی، جس نے اسے نئے عہد اور ماحول کا آئینہ دار بنایا سر سید کی اصلاحی تحریک نے اردو ادب کو خواب و خیال اور طوطا مینا کی دنیا سے نکال کر حقائق، سائنس، مذہبیات، سیاست، تاریخ، سوانح اور تنقید کی دنیا میں لانے کی کامیاب کوشش کی

سید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ نثر
[?]م کی دنیا ہی بدل ڈالی اور حالی نے "مقدمۂ
[?]ر شاعری" لکھ کر دنیائے شعر وادب میں
[ا]نقلاب لا دیا تھا۔ غالب کو غزل کی تنگ دامنی کا
[ش]کوہ تھا۔ حالی نے غزل کی اصلاح پر زور دیا
[ت]ھا کیونکہ غزلیہ شاعری روبہ انحطاط تھی۔
[ح]الی کا "مسدس" اردو کی پہلی نظم ہے جو اس
[با]ت کا ثبوت پیش کرنے کو کافی ہے کہ حالی اردو
[ش]اعری سے کیا توقع رکھتے تھے؟

ان تمام عوامل نے حسرت کی زندگی کو بھی متاثر کیا اور حسرت کی شاعری کو بھی۔ اس لیے حسرت نے اپنے اسلاف کے گل وبلبل کی کہانی نہیں چھیڑی، قصۂ رخسار وکلال سے اجتناب کی خواہش ظاہر کی۔ مگر حسرت صوفی وصاف دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حسن مجازی میں حسن حقیقی کے متلاشی تھے۔ اسی لیے انھوں نے غزل میں اپنے زمانے کی نہج سے ہٹ کر ایک راہ بنائی۔ جب کہ امیر مینائی اور داغ دہلوی نے غزل میں رکاکت، پستی اور ابتذال کی صورت پیدا کر دی تھی اور لوگوں کے ذہن جس قسم کے اشعار سننے کے عادی ہو چلے تھے۔ ان کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو ؎

امیر اتنا نہ چھیڑ اس کو سر شام
کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے

وصل کی رات چلی ایک نہ شوخی ان کی
کچھ نہ بن آئی تو چپکے سے کہا مان گئے

جلے میں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مرے نکلے
پریشاں باندھ کر جوڑا، دوپٹہ اوڑھ کر الٹا

ایسے حالات میں حسرت غزل گوئی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ اور جب ہم ان کو پڑھتے ہیں تو ہمیں ان کے یہاں غزل کی رکاکت وابتذال سے یکسر احتراز اور زندگی آمیزی اور زندگی آموزی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں سنجیدگی پاکیزگی، روحانیت، حقیقت، درد واثر، سوز و گداز اور محبت وخلوص کے نشان ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں کو پڑھنے سے ہمارے اندر ایک ہی لہر دوڑ جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غزل کے تن مردہ میں جان آگئی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اردو غزل میں توانائی لا کر اسے ایک خوش آئند سمت کی طرف موڑ دیا کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

تو نے حسرت یہ نکالا ہے عجیب رنگ غزل
ابھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

حسرت موہانی کی شخصیت مختلف خانوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہر خانے میں رہ کر انھوں نے ادبی کارنامے انجام دیئے تھے۔ حسرت کا کوئی مطالعہ ان کارناموں کو پیش نظر رکھے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حسرت موہانی کی شاعری کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ ان کے دوسرے کارناموں کو لوگوں نے فراموش کر دیا حالانکہ وہ صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے تذکرہ نگار، نقاد، صحافی اور سیاست داں بھی تھے۔ وہ ایک طرف جد وجہد آزادی میں پیش پیش رہے تو دوسری طرف شعر وادب کی تاریخ میں بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بہ یک وقت اسلاف کی صحت مند روایات کے امین بھی تھے اور ایک جہان نو کے نقیب بھی ان کی حیات۔ ان کی شاعری، ان کی تصانیف، اخبار "مستقل" اور "اردوئے معلی" کے تنقیدی اوراق ہمارے قومی اور ادبی سفر کی اہم منزلیں ہیں۔

حسرت موہانی کی شخصیت کی تشکیل میں علی گڑھ کالج کے دور طالب علمی کا نمایاں حصہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸۸۴ء میں اردو مڈل کے امتحان میں پورے صوبے میں اوّل آئے۔ بی۔ اے کا امتحان دیا اور نتیجہ نکلنے سے قبل رسالہ "اردوئے معلی" نکالا اور سیاست وصحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ دراصل یہیں سے ان کے ادبی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ حسرت کی شاعری پر ان کے خاندان کے علمی اور ادبی ماحول کا بڑا اثر تھا۔ وہ لڑکپن سے ہی نسیم دہلوی کے کلام سے بے حد متاثر تھے، اسی لیے انھوں نے ان کے شاگرد امیر اللہ تسلیم لکھنوی سے اصلاح لینے کا فیصلہ کیا اور ان کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے ان کے پروان چڑھنے اور سن شعور سے پہلے اردو غزل میں دو میلانات کار فرما تھے۔ ایک میلان انحطاط پذیر رنگ تغزل کا تھا۔ مثلاً ؎

وصل کیسا وہ کسی طرح بہلتے ہی نہ تھے
شام سے صبح ہوئی ان کی مداراتوں میں

جوبن ابھار پر ہے چمن کو نہ جائیے
باد صبا لگائے گی چوری انار کی

دوسرا میلان جدید غزل گوئی کا تھا جس کی رہبری حالی، اکبر وغیرہ کر رہے تھے۔ یعنی غزل میں حقیقت حیات اور اخلاقیات کی ترجمانی پر زور تھا۔ مثلاً ؎

خود بڑا بن کے دکھاؤ آپ کو
باپ دادا کی بڑائی ہو چکی

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

اسی زمانے میں غزل کا تیسرا میلان بھی ظاہر ہو رہا تھا، یعنی حقیقت کا شاعرانہ رنگ میں تخیل کے سہارے ڈھالنے کی کوشش کا میلان اس کی نمائندگی شاد عظیم آبادی کر رہے تھے۔ مثلاً ؎

میں حیرت وحسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے

تڑپ لے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

مندرجہ بالا اشعار اس وقت کی غزلوں کے اشعار سے بہت حد تک مختلف ہیں ——

حسرت نے جس وقت شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھا، اس وقت اردو غزل میں بھی تین میلانات کارفرما تھے اور حسرت نے اسی تیسرے "میلان" کو جس کی لے ابھی مدھم تھی، گلے لگایا اور اسے بام عروج تک پہنچا دیا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ حسرت نے اردو غزل کا احیا کیا —— حسرت نے یوں تو نظمیں بھی کہی ہیں اور کچھ قطعات، رباعیات اور گیت بھی لکھے ہیں، مگر اصلاً وہ غزل کے شاعر ہیں۔ خود کہتے ہیں۔ ؎

غزل گوئی رہی یکتا بیان عاشقاں میری
کہاں سے پھر کوئی لانا بیاں میرا زباں میری

حسرت کا دیوان پہلی بار فروری ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔ "کلیات حسرت" کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کی پہلی غزل ۱۸۹۳ء کی ہے اور آخری غزل ۱۹۵۰ء کی۔ یعنی ان کی شاعری کا کل زمانہ ۵۸ سال پر محیط ہے اس مدت پر پھیلی ہوئی فنی کاوش بہر طور اپنی ابتدا کی منزل سے ارتقائک ایک تسلسل رکھتی ہے اور اس عرصہ میں حسرت کا فن آگے کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی حسرت نے ذاتی تجربات سے کام لیا ہے کبھی رمز حیات کائنات کی تشریح و توجیہہ کی ہے اور کبھی تصوف کے فلسفیانہ موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ مگر محض موضوعات کے انتخاب سے شاعری اور خصوصاً غزل کی دنیا آباد نہیں ہوتی —— موضوعات پر ان کے اپنے تجربات اور ان کا اپنا غور و فکر جب مکمل طور پر کارفرما ہوتا ہے۔ تبھی وہ کسی مخصوص احساس کے اظہار کے لیے بے تاب ہوتا ہے اور تبھی اسے شعری پیکر بنانے کی سعی ہوتی ہے۔ حسرت نے، جہاں تک ان کے معاملات تصوف اور سیاست پیرا اظہار کا سوال ہے۔ اکہری شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے، جو شاعری، شاعری نہیں کہی جا سکتی، منظوم نثر کا درجہ رکھتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں موصوف نے احساسات کے پیکر بنائے ہیں اور قدرے کامیابی بھی حاصل کی ہے میرا خیال ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی نے بھی اپنے جو مضمون لکھا ہے اس میں میرے اسی خیال کی وضاحت ملتی ہے۔ آگے چل کر جب میں ان کے اشعار کا تجزیہ کروں گا، تو میری باتیں واضح ہو جائیں گی۔ فی الوقت میں ان ادبا، محققین اور ناقدین کی رائیں پیش کرتا ہوں جو حسرت اور ان کی شاعری سے متعلق انھوں نے جا بجا پیش کی ہیں۔

سید سلیمان ندوی کا خیال ہے ——

"تجدیدی کارنامہ، غزل کو لکھنؤ کی تصنع اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچے سے سادگی، آسان گوئی اور حقیقت رسی کی منزل تک پھیر لانا شاعری میں حسرت کا جدید کارنامہ ہے۔"

یہ صحیح ہے کہ حسرت کی عشقیہ شاعری کا مقابلہ اس دور کے کسی دوسرے شاعر سے نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری رسمی اور روایتی نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک زندہ اور جیتی جاگتی شخصیت کا عکس ہے۔ مجنوں گورکھپوری کے خیالات یوں ہیں: ؎

"اردو میں کہاں ہے اور حسرت
یہ طرز نظیری و فغانی

ہم کو کسی طرف سے امید نہ تھی کہ اردو غزل سنبھالا لے گی یا کوئی نئی کروٹ بھی لے گی۔ —— انھوں نے اردو شاعری میں مرکزی آمریت کو ختم کر دیا اور دلی اور لکھنؤ کے مدرسوں کی زندہ اور اہم خصوصیتوں کو قبول کر کے اپنے کلام میں اس طرح جذب کر لیا، دونوں کا فرق باقی نہ رہا۔۔۔۔"

یہ تمام آرا اپنی جگہ پر ہیں، مگر میرا اپنا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ سید سلیمان ندوی کا یہ کہنا کہ حسرت نے غزل کو لکھنؤ کی تصنع سے الگ کیا اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچے سے نکالا۔ یہاں یہ بات بحث طلب ہے کہ کیا شاعری کے لیے سادگی ضروری ہے؟ جہاں تک لکھنؤ کی تصنع سے الگ کرنے کی بات ہے۔ تو میں یہ تسلیم کروں گا کہ سید سلیمان ندوی کا یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن غالب کی مشکل گوئی سے سید سلیمان ندوی کو جو شکایت ہے، وہ بالکل بے جا ہے کہ یہی مشکل گوئی تو غالب کے فن کی جان بنی ہے غالب نے اگر احساسات کو حسرت کی طرح صاف سیدھی سادی زبان میں پیش کر دیا ہوتا۔ تو شاید غالب کو آج کی دنیا حسرت کے درجے میں ہی رکھ کر چھوڑ دیتی۔ مگر غالب ایوان شعر و ادب میں غالب ہے تو اس بنیاد پر کہ اس نے اپنے الفاظ و لغت کے معنی سے بٹا کر اپنا معنی و مفہوم عطا کیا ہے۔ عقیدت کی بات الگ ہے۔ حسرت موہانی بڑے اچھے آدمی تھے انھوں نے اپنا دامن ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھا ہے۔ لیکن کیا محض کردار کی پاکیزگی شعر و ادب کی معراج کی ضامن ہے؟ میں یہ کہوں گا کہ آلودگیاں ہوں یا حسن فن کار کا ان کے ساتھ برتاؤ ہی انہیں کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ وہ فنکارانہ برتاؤ جس سے غالب نے کام لیا ہے، یا جس سے کوئی بڑا شاعر کام لیتا ہے، حسرت کے یہاں نظر نہیں آتا۔ حسرت محض اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے منظوم پیرایہ اختیار کرتے تھے۔ حسرت نے کبھی بھی اور کہیں بھی شاعری کو اس شعوری کوشش سے نہیں گذارا، جہاں الفاظ کی پیچیدگی معنی کی سہہ پہلی اختیار کرتی ہے۔ اب یہ بات الگ ہے کہ اس دور کا مزاج اور میلان ہی تھا کہ تجربات اور خیالات منظوم صورت میں پیش کر کے لوگ

گوئی کے فرض سے عہدہ برآ ہو جاتے تھے ت نے بھی یہی کیا اس لیے حسرت اپنے دور وجہ رنگ و آہنگ شاعری سے آگے جا سکے۔ حسرت ترجمانی تو کرتے ہیں شعروں میں پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات بھی ہیں، خیالات بھی، اور اپنے دات کی ڈکر سے ہٹ کر چلنے کی دبی ہوئی خواہش بھی مگر حسرت کے اشعار میں الفاظ کا رکھ ہیں، یہ وہ خامی ہے جو حسرت کو غالب اور اس دور کے بہت سارے عظیم شعراء مثلاً فانی گورکھپوری، جگر، اصغر، جمیل مظہری، اجتبیٰ حسین حسن اور پرویز شاہدی کے مدمقابل کھڑا ہونے نہیں دیتی۔

خیال حسرت نے حق المقدور جو کارنامہ سامنے پیش کیا ہے مطالعے کی روشنی میں سکتے ہیں کہ انہوں نے دہلوی دبستان کی خصوصیات کو اپنایا ہے۔ ان کے کچھ اشعار میں پیش کرتا ہوں جن سے ان کے یہاں دہلوی رنگ تغزل اور لکھنوی رنگ فن کا پتہ چلتا ہے

حسرت مجھے پسند نہیں طرزِ لکھنؤ
پیرو ہوں شاعری میں جناب نسیم کا

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں
مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

غالب و مصحفی، میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

حسرت کے یہاں یوں تو بہت سے شعراء کے اثرات ملتے ہیں۔ مگر میر، غالب، مصحفی، مومن نسیم دہلوی اور تسلیم لکھنوی کا اثر ان کے کلام میں واضح طور پر نمایاں ہے۔ لیکن حسرت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان تمام رنگوں کو سمو کر انھوں نے ایک نئے رنگ سخن کی داغ بیل ڈالی ہے جو ان کا بالکل اپنا ہے اور اس پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی انفرادیت ہر جگہ برقرار ہے ان کے کلام میں ایک لہک ہے، ایک کیفیت ہے، جو اس بات کی غماز ہے کہ وہ عشق میں سرشار ہو کر نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہے۔ ان میں سوز و گداز، اثر، خوش بیانی، ترکیبات کی رنگینیاں اور پاکیزگی ہے۔ حسرت کے رنگ سخن کا ایک نمایاں عنصر نشاطیہ لہجہ اور ابتدامائی کیفیت ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اردو غزل کے غم انگیز اور یاس زدہ ماحول کو ان کی شاعری نے نشاط اور شادمانی اور امید کی ایک نئی دنیا میں داخل کر دیا۔ وہ غم میں بھی خوشی کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں اور درد میں بھی متبسم رہتے ہوتے ہیں وہ ہجر میں وصل کی یادوں سے خود کو بہلاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنے محبوب سے التفات کی امید ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

حسرتیں دل کی ہوئی جاتی ہیں پامال نشاط
ہے جو وہ جان تمنا رونق کاشانہ آج

بقول پروفیسر احتشام حسین ——

"جس محبت کی دنیا میں حسرتیں پامال نشاط ہوں وہاں غم دیر تک کیسے ٹھہر سکتا ہے۔ — اگر ناکامی اور مایوسی نے محبت کے حوصلے بالکل پست نہ کر دیے ہوں تو وصل و ہجر دونوں میں لذت کے اسباب نکل آتے ہیں —— اسی وجہ سے اس کا اظہار بھی ہر جگہ پرخلوص اور نشاط انگیز ہے"

حسرت موہانی کی شاعری ان کے عشق کی داستان ہے۔ وہ محبوب مجازی ہو یا حقیقی دونوں معاملے میں حسرت پرخلوص ہے۔ انھوں نے عشق مجازی کی کیفیتوں کو جس نزاکت اور لطافت سے پیش کیا ہے۔ وہ انھیں کا حصہ ہے ان کا عشق ماورائی نہیں بلکہ ان کے یہاں میر و مومن کی طرح ارضیت نمایاں ہے۔ ان کے اشعار میں ایک چلتے پھرتے محبوب کے ناز و انداز بھی خیالی نہیں۔ ان کے یہاں داخلیت اور خارجیت کا ایک مرکب اور امتزاج ملتا ہے۔ ان کے کلام میں میر کے عشق کی بلندی، مصحفی کا جنسیاتی انداز اور مومن کی معاملہ بندی اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ ...

"قائم ہے تیرے نام سے طرز سخن تمام
پھر ورنہ کیا ہے حسرت یہ طرز غزل خوانی"

حسرت نے نہ صرف ایک قدیم روایت غزل کی ہے آخری بڑی یادگار ہیں، بلکہ اردو غزل میں بڑے نام جو کچھ بھی نئی تحریک کے اثر پائے جاتے ہیں اس کے موجد بھی ہیں۔ حسرت کے بیان اردو غزل کی پوری انجمن آباد ہے۔ وہ ہمارے آخری کلاسیکل شاعر ہیں۔

حسرت کو حسن کی عظمت کا اعتراف ہے وہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں، مگر پاکیزگی کے ساتھ۔ اس میں بھی متانت ہوتی ہے سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ ان کا محبوب کوئی بازاری نہیں، بلکہ گھریلو عورت ہے۔ اس لیے اس کی بے تکلفی میں تکلف، شوخی میں ایک وقار، اداؤں میں معصومیت جھلکتی ہے۔ ملاحظہ ہو

دیار شوق میں برپا ہے ماتم مرگ حسرت کا
وہ وضع پارسا اس کی، وہ عشق پاکباز اس کا

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

قبل کہا جا چکا ہے کہ حسرت نے جس وقت غزل گوئی شروع کی تھی تو غزلیہ شاعری معاملہ بندی، ادا بندی، اور معشوق کی جھوٹی سچی تعریفوں کی ترجمان تھی ظاہر ہے حسرت نے اس کا اثر قبول کیا ہو گا۔ مگر کلیات حسرت سے حاصل

مطالعہ شعر میں یہ بتاتا ہے کہ حسرت کے یہاں ایسے اشعار میں بھی اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ کہیں ابتذال اور رکاکت نہ پیدا ہو۔ مثلاً ؎

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا میرا خیال تو شرما کے رہ گئے
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے حسرت اور جگر کی غزل گوئی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے "حسرت اور جگر اصلاً حسن و عشق کے شاعر ہیں لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک محبوب کی موجودگی میں اور دوسرا محبوب کی دوری پر غزل خواں ہوتا ہے۔" یہ سچ بھی ہے کہ حسرت کے یہاں عشق اور حسن کی نفسیات کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ ملتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ وہ عشق کے ہر مرحلے سے گذرے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں عشق اور حسن کی نفسیات کی ترجمانی ہے۔ ؎

عشاق کے دل نازک، اس شوخ کی خو نازک
نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی
حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
دل بے باک کی بے باکیاں ان سے یہ کہتی ہیں
ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کی شوخی کہاں تک ہے

حسرت کی شاعری کا ایک موضوع تو یہ ہے، جو عشقیہ شاعری کہلاتی ہے۔ مطالعہ کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی عشقیہ شاعری میں سوز و گداز، حقیقت، نشاط و شادمانی، خوش بیانی، جدت مضمون اور طرزِ ادا پائی جاتی ہیں، جو انھیں جدید غزل کا امام بنا دیتی ہیں۔ انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری کے لیے قافیہ و ردیف یا پرانے شعرا کے دواوین کے بجائے خود اپنی حیاتِ معاشقہ سے لیا ہے اپنے ہی کاروبارِ دل فروشی و دل داری کی تصویریں پیش کی ہیں۔

حسرت کی شاعری کا دوسرا موضوع تصوف ہے۔ حسرت نے نہ صرف قدیم رنگِ سخن کی صالح روایت کو برقرار رکھا بلکہ جدید غزل کو وضاحت و صلاست، اور جدت و ندرت کے ساتھ ساتھ وسعت و جامعیت عطا کی۔ ان کی زندگی اور شاعری میں جیسی ہم آہنگی اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ بہت کم شعرا کے یہاں ملے گی۔ حسرت مولانا مذہب و تصوف، فقر و استغنا، درویشی و انقلاب، بے خودی و محویت کا پیکرِ جمیل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "تصوف جانِ مذہب ہے اور عشق جانِ تصوف" ان کے تصوف کی بنیاد "العشق ھو اللہ الحسن ھو الحق" کے عقیدے پر قائم تھی اور ایسی لیے ان کے کلام میں بھی صوفیانہ رنگ ملتا ہے جس کی کششِ عشق کی گرمی اور محبت کی تڑپ نے حسرت کی صوفیانہ شاعری کو سہ آتشہ بنا دیا۔ نعت رسولِ پاک، منقبت بزرگانِ دین کا ایک ایک لفظ ان کے قلبی واردات کا ترجمان ہے۔ ؎

نگاہِ لطف اور ہم سے سیہ کار
کرم دیکھو حبیبِ کبریا کا
میرا ایمان عجب کیا ہے جو ایمانِ تصوف ہو
تصوف جانِ مذہب، عاشقی جانِ تصوف ہو

حسرت کے صوفیانہ کلام کا ایک انتخاب "حدیقۂ معرفت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔ ؎

اے زہدِ خشک تیری ہدایت کے واسطے
سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم
ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے
مایوس کر سکا نہ ہجومِ بلا مجھے

حسرت کی شاعری کا تیسرا موضوع سیاست ہے، گو کہ اردو ادب کے بیشتر تذکرہ نگاروں اور نقادوں کا یہ خیال ہے کہ حسرت کی سیاسی زندگی سے ان کی شاعری متاثر نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں، بلکہ حسرت کے سیاسی نظریات اور خیالات ان کی شاعری میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بات کو انھوں نے بادہ و ساغر کے پس پردہ پیش کیا ہے۔ ایسے اشعار پیش کرنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں، جن سے ان کے سیاسی خیالات اور ان کی شاعری پر سیاسی اثرات کا پتہ چلتا ہو۔ ؎

روح آزاد ہے خیال آزاد
جسمِ حسرت کی قید ہے بے کار
ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
خوشی سے ختم کرے سختیاں قیدِ فرنگ اپنی
کہ ہم آزاد ہیں بے گانۂ رنجِ دل آزاری

اب ایسی غزلوں کے اشعار سنئے جن میں حسرت نے لفظوں کا استعمال علامتوں کی طرح کیا ہے جس سے اصل مفہوم پر ایک پردہ سا پڑ جاتا ہے۔ مگر احساس کا تیور رکھنے والا فن کار جانتا ہے کہ اس نے اس لفظ کے پس پردہ جہانِ معنیٰ پنہاں کیا ہے۔ ؎

نظر میں بھر گئیں کیفیتیں سب عہدِ ساقی کی
بھر آئے اشکِ خوں نظارۂ مینائے خالی سے
کیا سمجھاتے اسیرانِ قفس کو اے صیاد
دل ملا دیں جو کبھی درد سے فریاد کریں
ستم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حبِ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

ان اشعار کے معنیٰ و مفہوم پر غور کرنے سے حسرت کی سیاسی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے حسرت نے اپنی غزلوں میں سیاسی خیالات کا اظہار کھل کر بھی کیا ہے اور رمز و کنایہ کے پیرائے میں بھی جہاں انھوں نے کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہاں غزلیت کے دائرے سے نکل گئے ہیں لیکن جہاں آدابِ غزل کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے وہاں ان کے سیاسی اشعار پر عشقیہ اشعار کا دھوکا ہوتا ہے۔ اور ان اشعار میں الفاظ اپنے

اصلی معنوں میں نہیں بلکہ علامتی طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں عشق، ستم، بلبل، گل چیں، صیاد قفس اور چمن وغیرہ علامتیں ہیں جن کے پس پردہ سیاسی خیالات و تجربات ہیں۔ حسرتؔ کی سیاسی شاعری کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی رقم طراز ہیں ـــــ "ان کی سیاسی شاعری، ان کا یہ رنگ اور بھی پھیکا اور بے جان ہے اب یہاں سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ حسرت خود تو اتنے بڑے سیاسی آدمی تھے مگر ان کی سیاسی شاعری رسمی اور پھس پھسی کیونکہ ہے! اس میں شدت احساس، جذباتی وفور یا سیاسی شعور نہیں ملتا۔" ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ موصوف کو حسرتؔ موہانی کی سیاسی شاعری کو سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور انھوں نے علامتی الفاظ کے معنیٰ و مفہوم پر غور نہیں کیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے الفاظ میں "غزل کے آرٹ میں بھی داخلی اور خارجی عنصر پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں ـــ یہ غزل کے ارٹ کا کمال ہے۔" اور غزل کے آرٹ کا یہی کمال ہے جو حسرتؔ کے یہاں ملتا ہے

حقیقت ہے کہ "کلیات حسرتؔ" کی تمام غزلوں کی تعداد ۷۷۱ ہوتی ہے۔ جن میں ۳۷۲ یعنی تقریباً نصف، قید یا نظربندی کی حالت میں لکھی گئی ہیں۔ جیل کی زندگی نے حسرتؔ کے یہاں، جہاں یادوں کے نقوش ابھارے وہیں رنگ و بو کے شعری محرکات اور سیاسی رنگ و آہنگ بھی پیدا کیا۔ وہ "جمالِ رخ جاناں" کے تصور سے "زنداں" کو بھی "گلستاں" بنا لیتے ہیں۔ ؎

روح کو محوِ جمال رخ جاناں کرلیں،
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کرلیں
چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے
خیال یار میں بھی رنگِ وصلِ یار پیدا ہے
یہ رنگیں ماجرا ئے عشق شیریں کار پیدا ہے

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو حسرت کی شاعری کا بنیادی محور یہ یادیں ہی ہیں۔ ان کی شاعری تحت الشعوری یادوں ہی کی بار آفریں کا نتیجہ ہے اور جیل میں حسرتؔ کی یہ یادیں ابھر آتی ہیں اور پیکر شعر میں ڈھل جاتی ہیں۔ اس کے ثبوت میں یہ بات پیش کی جا سکتی ہے کہ جب سے حسرتؔ کا جیل جانا بند ہوا اسی وقت سے ان کی شاعری بھی مائل بہ انحطاط ہو گئی۔ حسرتؔ آخری مرتبہ ۱۹۲۲ء میں گرفتار ہوئے اور ۱۹۲۴ء میں رہا ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ "زنداں" کی شاعری ایسی ہے، جس کی بدولت حسرت کا نام زندہ ہے اس کے بعد کی شاعری تو صرف حسرت کی وجہ سے زندہ ہے۔

بہ قول ممتاز حسین "حسرتؔ بہ نسبت مولانا حالی کے نیچرل شاعری کے مفہوم کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں۔ حالی نیچرل شاعری پر اخلاقیات کی قدغن لگاتے ہیں، حسرت اسے رد کرتے ہیں، لیکن دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جو لفظاً اور معناً دونوں اعتبار سے نیچرل ہو۔"

حالانکہ حالی کی نیچرل شاعری کا تصور آج کے نظریۂ شعر کے مطابق رد ہو چکا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ حسرتؔ کی اہمیت اس لفظاً اور معناً نیچرل شاعری کی وجہ نہیں، بلکہ ان احساسی پیکروں کی وجہ سے ہے، جو ہر درجہ کے قاری کے لیے اپنا اثر رکھتے ہیں۔

حسرتؔ کے فن کی دوسری اہم خصوصیت پیکر تراشی ہے اس کے لیے کبھی وہ وصفی انداز اپناتے ہیں اور کبھی تشبیہ اور استعاروں سے کام لیتے ہیں، تو کبھی خوبصورت تراکیب کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے یہ سارے پیکر بیشتر محبوب ہی سے متعلق ہیں۔ ؎

رنگ تیری شفق جمالی کا
اک نمونہ ہے بے مثالی کا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا
طرفہ عالم ترے حسن کی بیداری کا
بزم اغیار میں ہر چند وہ بے گانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

حسرتؔ کے یہاں ترکیبوں کا استعمال بھی زیادہ تر پیکر تراشی کے سلسلے میں ہوا ہے۔ جہاں بے خودی، اضطراب شوق، کشاکش ہائے شوق، گستاخ دستی، غم قید وفا، شیوۂ قدر وفا، ناز بردار اثر، مرہم زخم تمنا، سحر کاری رنگ حیا، حسن تازہ کار، حسن کرشمہ ساز اور روش حسن مراعات وغیرہ وغیرہ تراکیب میں سے بیشتر پیکر ہیں جن سے حسرت نے اپنی شاعری کو نگار خانہ سجایا ہے۔ ؎

گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ
لیکن ہجوم شوق نے مجبور کر دیا
روش حسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی رہی

حسرتؔ کی شاعری میں ترنم بھی ہے۔ شاعری میں موسیقیت کی بھی کم اہمیت نہیں ترنم سے شعر کی تاثیر میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے حسرتؔ کی شاعری اس بات کی غماز ہے کہ انھوں بھی ترنم کا جادو جگایا ہے۔

قلمی معاونین سے گذارش

دفتر میں غزلیات، منظومات، افسانے اور مضامین خاصی تعداد میں موجود ہیں، لہٰذا قلمی معاونین سے گذارش ہے کہ وہ غیر طلبیدہ تخلیقات بھیج کر شرمندہ نہ کریں۔ اِدارے کو ان کے بارے میں خط و کتابت سے معذور سمجھا جائے۔

محمد ضیاء الدین انصاری

اردوئے معلّٰی کے مضامین کی فہرست

اردوئے معلّٰی یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو علی گڑھ سے جاری ہوا، اور ۱۹۱۳ء تک وہیں نکلتا رہا۔ اس درمیان میں مئی ۱۹۰۸ء سے ستمبر ۱۹۰۹ء تک مولانا حسرت موہانی کی قید فرنگ کے سبب اس کی اشاعت منقطع رہی۔ یہ اردوئے معلّٰی کا پہلا دور تھا۔ دوسرے دور میں جنوری ۱۹۲۵ء سے مارچ ۱۹۴۲ء تک وہ کانپور سے شائع ہوا۔ گویا ادوار کے لحاظ سے اس کی تقسیم اس طرح ہے:

دور اول: جولائی ۱۹۰۳ء تا جون ۱۹۱۳ء علی گڑھ

دور دوم: جنوری ۱۹۲۵ء تا مارچ ۱۹۴۲ء۔ کانپور

دوسرے دور کے آغاز پر جنوری۔ فروری ۱۹۲۵ء کے مشترک شمارے میں مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں:

> "رسالہ اردوئے معلّٰی علی گڑھ جولائی ۱۹۰۳ء سے اپریل ۱۹۱۳ء تک جاری رہ کر حکومت کے جبر و استبداد کا شکار ہو گیا۔ الحمدللہ کہ اب کانپور سے دوبارہ شائع ہوتا ہے۔ درمیان میں کچھ دن اردوئے معلّٰی کے بجائے تذکرۃ الشعراء نام کا ایک سہ ماہی پرچہ نکلتا رہا۔ مگر علی گڑھ سے کانپور آنے کی کشمکش میں اس کا بھی خاتمہ ۱۹۲۰ء میں ہو چکا تھا۔ فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ اردوئے معلّٰی کے اس جدید دور میں، کثرہ مضامین کا سلسلہ اس انداز سے جاری رہے گا کہ آخر میں ان کا مجموعہ علیٰحدہ علیٰحدہ مرتب ہو کر مستقل کتابوں کی شکل اختیار کرے گا۔"

دوسرے دور کے شماروں میں دورِ اول کا معیار برقرار نہیں رہ سکا۔ اس کی ضخامت بتدریج کم ہوتی گئی اور پابندی اوقات بھی برقرار نہیں رہی۔ اب کئی کئی ماہ کے شمارے ایک ساتھ نکلنے لگے۔ ۱۹۳۴ء کے بعد رسالہ زوال پذیر ہو گیا۔ مضامین کی تعداد کم ہو گئی اور وقفۂ اشاعت بھی غیر یقینی ہو گیا۔ مولانا کو اکثر معذرت کرنی پڑی کہ یہ شمارہ کافی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے، آئندہ پابندی وقت کے ساتھ نکلے گا۔ لیکن اس پر وہ سختی سے کاربند نہ رہ سکے۔ ان کے سیاسی مشاغل اور نجی حالات اب رسالہ کی طرف زیادہ توجہ کی مہلت نہ دیتے تھے۔ بالآخر مارچ ۱۹۴۲ء کے بعد اسے ہمیشہ کے لیے بند کرنا پڑا۔

اردوئے معلّٰی کے کسی بھی شمارہ کی فہرست مضامین "معیاری" نہیں ہے۔ فہرست کے مندرجات اور رسالہ میں شامل مضامین میں مطابقت بہت کم ہے۔ یہ تو ہمیشہ ہی ہوا ہے کہ فہرست میں مضامین کے عنوانات کو اختصار کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ فہرست میں مضمون دے دیا گیا ہے لیکن رسالہ میں اسے شائع نہیں کیا اور یہ نوٹ دے دیا کہ گنجائش نہ ہونے کے سبب اسے اس شمارے میں شامل نہ کیا جا سکا۔ آئندہ شائع کیا جائے گا۔ کبھی کبھی مضمون نگار کا نام بھی فہرست میں نہیں دیا گیا۔ اس طرح محض فہرست مضامین پر انحصار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مضامین کے بارے میں صحیح اور مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے اندر سے رسالہ دیکھنا ضروری ہو گیا۔

اردوئے معلّٰی کے مضامین کی فہرست مرتب کرنے کا کام بہ ظاہر بڑا آسان معلوم ہوا تھا، لیکن جب کرنے بیٹھا تو پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں۔ جلد ہی یہ محسوس ہو گیا کہ محض فہرست مضامین پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر رسالہ کی ورق گردانی بھی کرنی پڑے گی خصوصیت

"حصہ نظم" اور تنقید رسائل و کتب کے لیے جن
کتابوں اور رسالوں پر تبصرے کیے ہیں، ظاہر
ہے ان تمام کے نام تو فہرست مضامین میں نہیں
ملتے۔ ان سب کے بارے میں تفصیلی معلومات
اندر سے ہی حاصل کی جائیں گی۔ یہی صورت حال
حصہ نظم اور ایڈیٹوریل نوٹس کے ساتھ بھی ہے۔
لہٰذا مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے رسالہ کو
اندر سے دیکھنا لازمی ہوگیا۔

مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)
میں اردوئے معلیٰ کا مکمل سیٹ نہیں ہے۔
بیچ بیچ سے شمارے بلکہ جلدیں بھی غائب ہیں۔
جو شمارے مل سکے ہیں ان کے اندراجات کی
فہرست ذیل میں پیش کی جارہی ہے (مرتب)

جلد ۱

شمارہ ۳ یکم ستمبر ۱۹۰۳ء

(۱) اردو شاعری از امیر احمد علوی
(۲) انتخاب بیاض فطرت موہانی
(۳) دوران خون اور ہماری صحت جسمانی
از لطافت حسین
(۴) جدید شاعری از محمد یعقوب
(۵) **حصہ نظم**: غزلیات حسرت موہانی، خیال
شاہجہاں پوری، شاد عظیم آبادی، وفا رامپوری
طلسم اسرار (منظوم ڈراما) از مرزا محمد ہادی
عزیز لکھنوی۔

شمارہ ۴۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۳ء

(۱) تذکرۃ الشعراء: شاہ حاتم
(۲) زبان اردو از احمد علی شوق
(۳) متروکات از شاد عظیم آبادی
(۴) انتخاب بیاض سید آل حسن موہانی
(۵) ایک پھول کی زبانی دلچسپ کہانی از لطافت
(۶) انجمن حوائج خمسہ از علی سجاد عظیم آبادی
(۷) الروح (فارسی) (… ن اللہ خاں ثاقب اکبرآبادی)
(۸) اردو کے نادان دوست از "تنقید ہمدرد"
(۹) **حصہ نظم**:
پیام صبح (نظم) از پروفیسر محمد اقبال
غزلیات فارسی سجاد عظیم آبادی، ثاقب اکبرآبادی
نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی حسرت

شمارہ ۵ یکم نومبر ۱۹۰۳ء

(۱) تذکرۃ الشعراء: سودا کے بہتر خنجر
(۲) تعبیر خواب از حیات الحسن موہانی
(۳) کلام غالب از حسرت موہانی
(۴) سائنس کی مذہبی حقیقت از غلام الحسنین
(۵) انتخاب بیاض بسمل موہانی و سجاد عظیم آبادی
(۶) ایک خط از محمد سعید دہلوی
(۷) شکستہ دل (ترجمہ) محمد ہادی مچھلی شہری
(۸) جیون ساگر (نظم) از ضامن کنتوری
(۹) آسمانی سقا " از سجاد عظیم آبادی
(۱۰) ریویو: محل خانہ مصنفہ سجاد عظیم آبادی
(۱۱) غزلیات اخگر قاضی پوری، وفا رامپوری
وجاہت جھنجھانوی، گستاخ علی گڑھی، احمد علی شوق،
حسرت موہانی، غزل فارسی مولوی عالم علی

شمارہ ۶ یکم دسمبر ۱۹۰۳ء

(۱) تذکرۃ الشعراء: قائم چاندپوری
(۲) قوم عاد کی تاریخ از محمد حلیم انصاری ردولوی
(۳) بادلوں کے اسرار (ترجمہ از رسکن)
از محمد سعید دہلوی
(۴) انتخاب بیاض سید اکبر حسن موہانی
(۵) فن طب (ماخوذ از مقدمہ ابن خلدون)
از حیات الحسن موہانی
(۶) ایک خط ایک طالب علم کے نام جو اپنے حافظے کے
خراب ہونے کی شکایت کرتا تھا (از ہبرٹ)
ترجمہ محمد عبدالرحمٰن امیر لاہور
(۷) موت از سید محمد علی امید امیٹھوی
(۸) ریاض و حالی از "تنقید"
(۹) **حصہ نظم**:
غزلیات شاد عظیم آبادی، اصغر علی روحی (فارسی)
حافظ جلیل حسن جلیل، امید امیٹھوی،
محمد صدیق صدیق مراد آبادی (فارسی)
(۱۰) اڈیٹوریل نوٹس

جلد ۲

شمارہ ۲ فروری ۱۹۰۴ء

(۱) تذکرۃ الشعراء: سعادت یار خاں رنگین
(۲) مسلمان اور پالیٹکس از شیخ عبداللہ
(۳) علم کا سیکھنا اور سکھانا انسان کا مقتضائے طبیعت
ہے۔ از سید ہدایت الحسن موہانی
(۴) قدرت کی صناعیاں از ضیاء الحسن کاکوروی
(۵) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۶) اتفاق کی خوبی اور پسندیدگی (مترجمہ ہادی مچھلی شہری)
(۷) ایک خط (گزشتہ سے پیوستہ)
(۸) دلا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمے دارد
از قاضی شمس الضحیٰ اخگر
(۹) تنقید (امداد امام اثر، خوشی محمد ناظر، مولانا
حالی کے شاعرانہ تسامحات)
(۱۰) اصلاح زبان پنجاب از "تنقید"
(۱۱) **حصہ نظم**:
غزلیات اثر عظیم آبادی، جلیل حسن جلیل،
وفا رامپوری، مرزا محمد ہادی، حسرت موہانی
(۱۲) ریویو: الاخلاق المحمدیہ مترجمہ سید احمد فاروقی
اور وحدۃ الوجود پر کیشب چندر سین کی ایک
تقریر پر عطا حسین کاکوروی کے تبصرے

شمارہ ۳۔ مارچ ۱۹۰۴ء

(۱) تذکیر و تانیث لفظ معشوق از امداد امام اثر
(۲) مسلمان اور کانگریس از "حق پسند"
(۳) ہستی کے دو پہلو از مرزا سلطان احمد
(۴) انتخاب بیاض سجاد عظیم آبادی
(۵) عمر طبیعی از احمد علی
(۶) خود غرضی اور اس کی وسعت از علی محمد شمسی مانکپوری

(۷) اصلاح زبان از "تنقید ہمدرد"
(۸) تنقید: علی گڑھ منتھلی۔ عصر جدید کشمیر درپن دکن ریویو۔ فتنہ اور عطر فتنہ۔ البشیر پر تبصرے
(۹) حصہ نظم:
غزلیات امیر اللہ تسلیم، ضمیر الدین احمد عرش، اثر عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، وفا رامپوری، حسرت موہانی۔

شمارہ ۴۔ اپریل ۱۹۰۴ء

(۱) فارسی اور اردو کی شاعریاں واحد المذاق ہیں از امداد امام اثر
(۲) کلام انیس از علامہ شبلی
(۳) مسلمان اور کانگریس از "مسلمان"
(۴) انتخاب بیاض حسرت موہانی۔
(۵) نگارش ایڈیسن در احوال وقت و ہنگام: فارسی ترجمہ از ثاقب اکبر آبادی
(۶) اردو زبان از حکیم برہم
(۷) کلام اقبال از چکبست لکھنوی
(۸) عزیز (حیات و تصانیف) از عبدالاحد قدوس
(۹) حصہ نظم: غزلیات عزیز، لطیف احمد اختر مینائی، شاد عظیم آبادی
(۱۰) ریویو: ماہنامہ اتحاد لکھنؤ۔ ماہنامہ ترقی محبوب الکلام و دبدبۂ آصفی

شمارہ ۵۔ مئی ۱۹۰۴ء

(۱) غزل گوئی
(۲) سائنس از لطافت حسین خاں
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) سید جمال الدین حسینی افغانی از مولوی سعید احمد
(۵) تنقید: مخزن لاہور۔ دبدبۂ آصفی
(۶) زیب النساء مخفی از سید علی اصغر بلگرامی
(۷) غیر منصرف
(۸) نجم الدین برقی از حیدر حسن

(۹) قصیدہ از عبدالہادی وفا رامپوری
(۱۰) غزلیات: امداد امام اثر، جلیل حسن جلیل، احسن اللہ خاں ثاقب، امید امیٹھوی، اخگر قاضی پوری، عفت اہلیہ ثاقب اکبر آبادی، حسرت موہانی

شمارہ ۶ جون ۱۹۰۴ء

(۱) غزل فارسی از حبیب الرحمٰن خاں شروانی
(۲) سائنس ۳ از لطافت حسین خاں
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) مکتوبات مشاہیر از احسن اللہ خاں ثاقب
(۵) شطرنج کی ابتدا (ترجمہ از ہندوستانی ریویو) از عظمت اللہ برق
(۶) تنقید: دکن ریویو
(۷) حصہ نظم: زندگی (نظم) از ضامن کنتوری غزلیات جلیل حسن جلیل، اثر عظیم آبادی

جلد ۳

شمارہ ۱ جولائی ۱۹۰۴ء

(۱) اردو شاعری ۲ از امیر احمد علوی
(۲) اردو ایپک (انتخاب مراثی انیس۔ دفتر اول)
(۳) انتخاب بیاض جگموہن ناتھ شوق
(۴) غزل نواب آصف الدولہ
(۵) سفر لندن از لطافت حسین خاں
(۶) حصہ نظم: غزلیات امیر اللہ تسلیم، ضمیر الدین عرش، حسرت موہانی

شمارہ ۲ اگست ۱۹۰۴ء

(۱) تذکرۃ الشعراء: شگفتہ
(۲) اردو غزل از حبیب الرحمٰن خاں شروانی
(۳) طلسم خواب از مرزا سلطان احمد
(۴) لٹریچر اور سائنس از عبدالغفار خاں
(۵) انتخاب بیاض چکبست لکھنوی
(۶) انتخاب بیاض جگموہن ناتھ شوق

(۷) الخالق والمخلوق: ترجمہ از امید امیٹھوی
(۸) حسن تدبیر (افسانہ) از محمد یعقوب احمد نگری
(۹) تنقید: مخزن لاہور، کشمیر درپن، نسیم دکن اور خدنگ نظر کے بعض مضامین و غزلیات پر اظہار خیال۔
(۱۰) درد انگیز سانحہ: ثاقب اکبر آبادی کی اہلیہ کی وفات پر تعزیتی مضمون۔
(۱۱) حصہ نظم: غزلیات ثاقب، امداد امام اثر، وفا رامپوری
(۱۲) ریویو: اخلاق عزیزی مترجمہ عبدالعزیز، زرتشت نامہ مولفہ خلیل الرحمٰن، پھول مصنفہ دیوی دیال اور مراکلس آف دی ہولی قرآن (انگریزی)، مولفہ ابوالحسن صدیقی

شمارہ ۳ ستمبر ۱۹۰۴ء

(۱) تذکرۃ الشعراء (اشرف) از حسرت موہانی
(۲) مسلمان، کانگریس اور پولیٹیکل ایجی ٹیشن
(۳) اردو از کشن پرشاد کول
(۴) اسپیچ مسٹر گوکھلے (مدراس)
(۵) تنقید: مخزن لاہور، گلدستہ بہار (عظیم آباد)
(۶) انتخاب بیاض شوق شاہجہانپوری و جگموہن ناتھ رینہ شوق
(۷) مثنوی از امیر علی بلگرامی
(۸) غزلیات شفق عمادپوری، رئیس اکبر آبادی تمیز کانپوری، بیخود الہ آبادی، بدر بدایونی
(۹) ریویو: زچہ بچہ از ڈاکٹر رام نرائن، عذرا یعنی عجائبات شہر کور، از خلیل الرحمٰن، کرشن کنہیا مصنفہ حکیم برہم

شمارہ ۵۔ نومبر ۱۹۰۴ء

(۱) تذکرۃ الشعراء (رند) از امیر احمد
(۲) انتخاب بیاض جگموہن ناتھ رینہ شوق
(۳) تقریر و تحریر کا ڈھنگ از مقتدی خان
(۴) مسلمان اور کانگریس

(۵) تنقید: مخزن لاہور
(۶) ریویو: تند پارسی علی گڑھ، علی جنتری،
مرتبہ عبداللہ تاجر کانپور
(۷) حصہ نظم: بیل کی سرگزشت (نظم)
از ریاض خیرآبادی
غزلیات داغ دہلوی، قمر لکھنوی، شمشاد علی خاں فرح
طوفان مارہروی، عبدالصمد فصیح، شفق عمادپوری
محمد اسمٰعیل ذبیح، احسن مارہروی، اثر مارہروی

فہرست مضامین زمانہ کانپور بابتہ اکتوبر ۱۹۰۴ء

شمارہ ۶ - دسمبر ۱۹۰۴ء

(۱) دمشق (ماخوذ از سفرنامہ ابن بطوطہ)
مترجمہ حیات الحسن موہانی
(۲) مسلمان اور پالیٹکس (ترجمہ از ہندوستانی ریویو)
مترجمہ حیدر علی قریشی
(۳) براہین ثلاثہ از مولوی ذکاء اللہ
(۴) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۵) املائے اردو از شاد عظیم آبادی
(۶) مصیبتوں کا پہاڑ از عبدالرحمٰن امیر لاہوری
(۷) مسلمان اور کانگریس از قاضی کبیرالدین
(۸) مرثیہ شاہ محمد حسین اجمیری از اختر الہ آبادی
(۹) غزلیات شاد عظیم آبادی، جلیل حسن جلیل،
شفق عمادپوری، قاضی عبدالصمد فصیح،
سجاد عظیم آبادی، مرزا رسوا لکھنوی۔

جلد ۶
شمارہ ۵ - مئی ۱۹۰۶ء

(۱) حمد لکھنوی از وصل بلگرامی
(۲) دارالسلطنت فرانس کی سیر از "مانی"
(۳) انتخاب بیاض سید انور علی انور
(۴) کانگریس اور مسلمان از "حق پسند"
(۵) جنگ روس وجاپان از ضامن کنتوری
(۶) مکتوبات امیر مینائی مرتبہ ثاقب اکبرآبادی
(۷) تلمذ مولوی برکت اللہ از نیویارک
(۸) غزلیات رضا علی وحشت، محشر لکھنوی،
اثر مارہروی، حسرت موہانی

شمارہ ۶ - جون ۱۹۰۶ء

(۱) مصحفی از حسرت موہانی
(۲) اقوام ہند کے درمیان باہم اتفاق از قاضی تلمذ حسین
(۳) مکتوبات امیر مینائی مرتبہ ثاقب اکبرآبادی
(۴) صداقت از شروانی بلونوی
(۵) انتخاب بیاض سید انور علی انور
(۶) دارالسلطنت فرانس کی سیر (قسط ۵) از "مانی"
(۷) مثنوی حضرت عیش مرحوم
(۸) غزلیات رضا علی وحشت، نسیم بھرتپوری،
شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی

جلد ۷
شمارہ ۲ - اگست ۱۹۰۶ء

(۱) منتظر (سوانح و تبصرہ بر کلام نورالاسلام منتظر)
(۲) سیرت جیبن از امیر احمد
(۳) طالب علم اور پالیٹکس از "طالب علم"
(۴) انتخاب بیاض محمد علی آزاد
(۵) آسمانی کتب اور شاعری از اسلم جیراجپوری
(۶) مکتوبات امیر مینائی مرتبہ ثاقب اکبرآبادی
(۷) تنقید: مخزن لاہور، فصیح الملک، اخبار
گیلک امریکن نیویارک، دی سن (The Sun)
کے بعض خیالات پر تنقید۔
(۸) حصہ نظم: غزلیات ثاقب اکبرآبادی،
عزیز لکھنوی، ضامن کنتوری، کوثر خیرآبادی
موج عظیم آبادی، بیخود موہانی، جوہر بھوپالی
نواب شمشیر بہادر اخگر، شاد عظیم آبادی۔

جلد ۸
شمارہ ۵ - مئی ۱۹۰۷ء

(۱) راسخ عظیم آبادی از اڈیٹر
(۲) فنون لطیفہ اور اسلام از وحید الدین سلیم
(۳) ہندوستان کے روسائی لیڈر از پنجاب جرنل
سیالکوٹ۔
(۴) قومی شاعری (ماخوذ از انسٹی ٹیوٹ گزٹ)
(۵) ایک خط ایسے مصنف کے نام جو سخت
دماغی محنت کا عادی تھا (۲)
از پی۔ جی۔ ہمرٹن
(۶) انتخاب بیاض خان بہادر ناصر علی
(۷) اضطراری فرائض کا شکریہ لازمی نہیں ہے
ترجمہ از انڈین سوشیالوجسٹ۔
(۸) ہندوستانی مسلمان درہندوستان (فارسی)
از محمد برکت اللہ نیویارک
(۹) بے چینی کے آثار از اڈیٹر
(۱۰) کلید حافظ از عبدالحمید فراہی
(۱۱) غزلیات شاد عظیم آبادی، نسیم بھرتپوری،
ریاض حسن خیال، نورالحسن نیر، راز لکھنوی

شمارہ ۶ - جون ۱۹۰۷ء

(۱) حضرت کاہش جونپوری از ارنی الحق
(۲) مسلمان ہند کا پولیٹیکل مستقبل از اڈیٹر
(۳) تاریخ اسلام پر ایک سرسری نظر
از معشوق حسین خاں
(۴) ایک خط ایسے مصنف کے نام جو بہت مضامین کا
مطالعہ کرتا تھا: ترجمہ از پی۔ جی۔ ہمرٹن
(۵) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۶) ہندوستانی مسلمان درہندوستان (۲)
از برکت اللہ نیویارک
(۷) بلجیم کے دلفریب نظارے از مانی لندن
(۸) تنقید: جنید بغدادی از عبدالحلیم شرر لکھنوی،
جہاں آرا از محبوب الرحمٰن کلیم
ثمرۂ فصاحت: دیوان فیاض حیدرآبادی،
رپورٹ کمیشن تحقیقات شورش مدرسۃ العلوم
علی گڑھ
(۹) غزلیات شاد عظیم آبادی، ضامن کنتوری،
کوثر خیرآبادی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی،
اکبر الہ آبادی، زاہد سہارنپوری۔

جلد ۹

شمارہ ۱۔ جولائی ۱۹۰۷ء

(۱) کراہت علی خاں شہیدی
(۲) مسئلہ وقف از حکیم برہم
(۳) تاریخ اسلام پر ایک سرسری نظر
از معشوق حسین خاں
(۴) انتخاب بیاض حسرت
(۵) ایک خط ایسے طالب علم کے نام جو اپنے مشاغل علمی
میں مستقبل رہنے پر مجبور تھا۔ ترجمہ از پی۔ جی۔ ہمرٹن
(۶) تنقید: حکمت عملی مولفہ سجاد مرزا۔ ٹیکس مولفہ
سجاد مرزا، ہندوستان کے نادان دوست۔
بجٹ ہندوستان اور مسٹر مارلے کی پالیسی
(۷) حصہ نظم: غزلیات علامہ شبلی، شرر کاکوری،
محشر لکھنوی، سید محمد نذر اشرف لکھنوی،
محمد عبدالحیٔ بازغ، سید جلال الدین توفیق،
ظہیر الدین حسن ظہیر، رضی الدین کیفی، وفا لیموزی

جلد ۱۰

شمارہ ۱ جنوری ۱۹۰۸ء

(۱) حبیب کنتوری
(۲) قومیت ہند اور اس کے پیدا کرنے میں اسلام
کا حصہ: لکچر مسٹر بپن چندر پال، مترجمہ
عظمت اللہ برق کانپوری
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) تنقید نساخ برکلام مرزا دبیر مرحوم
(۵) تنقید نساخ برکلام میر انیس مرحوم
(۶) مثنوی برگ سبز یا تحفۂ درویش (فارسی) قسط ۲
(۷) غزلیات ضامن کنتوری، رضا علی وحشت،
محشر لکھنوی، عزیز لکھنوی، بدر الزماں بدر،
قطب الدین تسلی، حسرت موہانی
(۸) مولانا حالی کی ایک نظم "ترقی و تنزل" کا اقتباس
(۹) مولانا حالی کی شاعری از محبوب الرحمن کلیم
(۱۰) رسید کتب و اخبارات جدیدہ

شمارہ ۲ و ۳ فروری۔ مارچ ۱۹۰۸ء

(۱) مرحوم مصطفیٰ کامل پاشا
(۲) مصطفیٰ کامل کے سوانح زندگی
(۳) مصطفیٰ کامل کی بے مثال اسپیچ بمقام اسکندریہ
(۴) مصطفیٰ کامل پاشا: ترجمہ از بندے ماترم کلکتہ
(۵) مرثیہ کامل پاشا (فارسی)
(۶) مصری ہیرو: اردو ترجمہ کامل پاشا (عربی)
از حافظ ابراہیم مصری
(۷) مصطفیٰ کامل کے آخری الفاظ
(۸) متفرق حالات متعلق مصطفیٰ کامل پاشا
(۹) مصریوں کا قومی گیت از مصطفیٰ صادق رافعی
(عربی سے اردو ترجمہ)

جلد ۱۱

شمارہ ۳۔ مارچ ۱۹۱۰ء

(۱) مذاق بدایونی از اڈیٹر
(۲) مشاہدات زنداں از اڈیٹر
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) سوامی شوانند از ایڈیٹر
(۵) تنقید رسایل و کتب و گلشن عیش مولفہ
اچھے صاحب عیش، غنچۂ نوبہار از شفیق عماد پوری،
اخلاق محمدی مولفہ سید احمد فاروقی، رسالہ نظام المشائخ
(شہید نمبر)، رسالہ ادیب الہ آباد
(۶) غزلیات حسرت موہانی، عبدالعلیم آسی،
عرش گیاوی، محمد یونس، شفیق عماد پوری،
منگل سین بیدل، بسمل موہانی
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: انتخاب دیوان
واجد علی شاہ اختر لکھنوی

شمارہ ۴۔ اپریل ۱۹۱۰ء

(۱) نوائے بدایونی از حسرت موہانی
(۲) مشاہدات زنداں از حسرت موہانی
(۳) انتخاب بیاض ثاقب اکبرآبادی
(۴) جیل خانوں میں سیاہ و سفید رنگ کا امتیاز
(۵) تنقید رسائل کتب: دیوان وحشت،
دلگداز لکھنؤ (جنوری ۱۹۱۰)، اخبار نیر اعظم مراد آباد
(۶) غزلیات حسرت موہانی، تفضل حسین فطرت،
محشر لکھنوی، سید محمد شاد غازی پوری،
ذاکر حسین انجم غازی پوری، شفیق عماد پوری،
عرش گیاوی
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: انتخاب دیوان مرزا قادر بخش صابر

شمارہ ۵۔ ۱۹۱۰ء

(۱) النور دہلی از حسرت موہانی
(۲) ہندوستان کے پالیٹکل قیدی
(۳) انتخاب بیاض ثاقب اکبرآبادی
(۴) مشاہدات زنداں از حسرت موہانی
(۵) تنقید کتب و رسایل: سوانح عمری حضرت محمد صاحب
بانی اسلام از شردھے پرکاش دیوجی،
ماہنامہ استبصار رائے بریلی (فروری ۱۹۱۰ء)
صلائے عام دہلی (اپریل ۱۹۱۰ء)
(۶) حصہ نظم: غزلیات حسرت موہانی، اسمٰعیل میرٹھی،
شاہ عبدالعلیم آسی۔ ضامن کنتوری، بشیر حسن بشیر،
ثاقب بدایونی، تفضل حسین فطرت لکھنوی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: بقیہ دیوان صابر و انتخاب
دیوان درد

شمارہ ۶۔ جون ۱۹۱۰ء

(۱) تنویر دہلی از اڈیٹر
(۲) انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام
از شوکت بلگرامی
(۳) انتخاب بیاض رضا علی وحشت
(۴) مشاہدات زنداں از اڈیٹر
(۵) تنقید رسایل کتب: لسان العصر لکھنؤ پر
تعارفی نوٹ
(۶) حصہ نظم: غزلیات حسرت موہانی، شوکت بلگرامی،
ثاقب اکبرآبادی، عرش گیاوی، بسمل موہانی،

راز لکھنوی، نہال عظیم آبادی
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: انتخاب دیوان انشار

شمارہ ۷ - جولائی ۱۹۱۰ء

(۱) معروف دہلوی از حسرت موہانی
(۲) بابو آر بند دگھوش
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) مشاہدات زنداں از حسرت موہانی
(۵) مرزا غالب کا ایک شعر از شوکت بلگرامی
(۶) تنقید رسایل وکتب: صلائے عام دہلی
(مئی ۱۹۱۰ء)، ہندوستانی لاہور
تذکیر وتانیث مولفہ جلیل حسن جلیل
(۷) حصہ نظم: غزلیات حسرت موہانی،
اسمٰعیل میرٹھی، رضا علی وحشت، شوکت بلگرامی،
ثاقب اکبر آبادی، احسن مارہروی، انجم غازیپوری،
نطرت کلکتوی، تجمل حسین بیمار، امام خاں نوشہروی
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: انتخاب دیوان انشار

شمارہ ۸ - اگست ۱۹۱۰ء

(۱) میرزا علی لطف از اڈیٹر
(۲) مشاہدات زنداں از اڈیٹر
(۳) تنقید کتب ورسایل: کلیات رضوان مرادآبادی
الناظر لکھنؤ (اگست ۱۹۱۰ء)، ہندوستانی لاہور
(جولائی ۱۹۱۰ء)
(۴) حصہ نظم: غزلیات حسرت موہانی، اسمٰعیل میرٹھی
علی احمد راز، محشر لکھنوی، بسمل موہانی، راز لکھنوی
ابر شاہجہانپوری، نیاز فتحپوری۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ بقیہ دیوان انشار۔

شمارہ ۹ - ستمبر ۱۹۱۰ء

(۱) عبدالاحد خاں مہر لکھنوی از حسرت موہانی
(۲) مشاہدات زنداں " "
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) تنباکو یا تمباکو از اکبر الہ آبادی

(۵) غالب کا ایک شعر از شوکت بلگرامی
(۶) تنقید رسایل وکتب: تاج سخن یعنی دیوان جلیل،
پنجاب ریویو - ادیب الہ آباد (اگست ۱۹۱۰ء)
(۷) غزلیات حسرت موہانی، رضا علی وحشت،
عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، عرش گیاوی
عبدالصمد حسن موہانی، راز لکھنوی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: دیوان شاکر میرٹھی

شمارہ ۱۰ - اکتوبر ۱۹۱۰ء

(۱) عبداللہ خاں مہر کی شاعری از حسرت موہانی
(۲) مشاہدات زنداں " "
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) تنقید رسایل وکتب: اخبار مشرق گورکھپور
معجزۂ محبت (ناول، عربی سے اردو ترجمہ از اکبر علی
(۵) غزلیات آسی سکندرپوری، ضامن کنتوری،
رضوان مرادآبادی، سید مسعود افسر، بسمل موہانی
اٹل بہاری لعل دلریش علی گڑھ، ممتاز علی آہ
حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: بقیہ دیوان شاکر و
انتخاب دیوان اثر عظیم آبادی۔

شمارہ ۱۱ - نومبر ۱۹۱۰ء

(۱) مرزا محمد بیگ عاشق لکھنوی
(۲) امیر مینائی کا ابتدائی اور انتہائی کلام
از شوکت بلگرامی
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) مشاہدات زنداں از حسرت موہانی
(۵) تنقید رسایل وکتب: رسالہ اودلڈ بوائے
بنارس (ستمبر ۱۹۱۰ء) - قدیم ہندوستان
کی تہذیب از آر۔ سی۔ دت، مترجمہ
ولایت احمد
(۶) غزلیات وفا رامپوری، ساقی دہلوی،
عرش گیاوی، اختر مینائی، شوکت بلگرامی،
فطرت کلکتی، ابر شاہجہانپوری، بہار احمد آبادی

اخگر اجے گڑھی، دلگیر اکبر آبادی، حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: بقیہ دیوان اثر عظیم آبادی

شمارہ ۱۲ - دسمبر ۱۹۱۰ء

(۱) عبدالحیٔ تاباں از حسرت موہانی
(۲) قومیت اور خود داری از الطاف الرحمٰن قدوائی
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) مشاہدات زنداں
(۵) سرور جہاں آبادی کی بے وقت موت
(۶) تنقید رسایل وکتب: رسالہ عصمت دہلی
(ستمبر ۱۹۱۰ء)
(۷) غزلیات آسی سکندرپوری، وفا رامپوری،
رضا علی وحشت، عزیز لکھنوی، حبیب النبی نہال سہولت
ساقی دہلوی، قیس موہانی، شاہد موہانی، بسمل موہانی
حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: بقیہ دیوان اثر و مثنوی اسرار محبت

جلد ۱۲

شمارہ ۱ - جنوری ۱۹۱۱ء

(۱) حکیم غلام مولیٰ قلق دہلوی از اڈیٹر
(۲) مشاہدات زنداں (آخری قسط)
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) تنقید رسایل وکتب: مدینۂ نعت یعنی نعتیہ دیوان
حاذق موہانی، رسالہ زبان دہلی، دیوان حمید،
رسالہ ادیب لاہور (دسمبر ۱۹۱۰ء)، زمانہ کانپور
(جنوری ۱۹۱۱ء)
(۵) حصہ نظم: رباعیات وسلام شوکت بلگرامی۔
غزلیات آسی سکندرپوری، ثاقب اکبر آبادی
عزیز لکھنوی، بیخود موہانی، حبیب النبی صولت،
بیدل جھنجھانوی - حسرت موہانی
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: بقیہ مثنوی اسرار محبت

شمارہ ۲ - فروری ۱۹۱۱ء

(۱) تذکرۃ الشعرا سلسلہ حاتم از حسرت موہانی

(۲) نوح ناروی
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) تنقید رسایل وکتب: مکتوبات امیر مینائی،
مولفہ ثاقب اکبرآبادی، کلیات اسمٰعیل میرٹھی
(۵) حصۂ نظم: خمسۂ شوکت بلگرامی برغزل ثاقب اکبرآبادی
غزلیات بسمل موہانی، شوکت بلگرامی، صولت فلکی،
حفیظ غازیپوری، حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: مثنوی للمعۃ الشمس

شمارہ ۳ - مارچ ۱۹۱۱ء

(۱) شاگردان سودا از حسرت موہانی
(۲) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۳) بابو جوالا پرشاد برق مرحوم
(۴) غزلیات شاد عظیم آبادی، شفق عماد پوری،
عزیز لکھنوی، ثاقب اکبرآبادی، شوکت بلگرامی،
اعجاز لکھنوی، ہنر لکھنوی، حسرت موہانی
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: مثنوی للمعۃ الشمس

شمارہ ۴ - اپریل ۱۹۱۱ء

(۱) شاگردان قایم از حسرت موہانی
(۲) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۳) مکتوبات امیر و موازنۂ امیر و داغ
تنقید از حسرت موہانی
(۴) نامۂ اخگر از نواب شمشیر بہادر [illegible]
رئیس اتے گڑھ
(۵) غزلیات آسی سکندرپوری، عزیز لکھنوی،
صابر موہانی، اعجاز لکھنوی، شوکت بلگرامی،
حسرت موہانی، بسمل موہانی
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: مثنوی للمعۃ الشمس

شمارہ ۵ - مئی ۱۹۱۱ء

(۱) شاگردان مائل و شوق
(۲) بیاض حسرت موہانی
(۳) مکتوبات امیر مینائی ۲ تنقید از حسرت موہانی

(۴) تنقید رسایل وکتب: اخبار اسلامک فریٹرنٹی
ٹوکیو (اپریل ۱۹۱۱ء)، اخبار وکیل امرتسر۔
زمیندار لاہور (یکم مئی ۱۹۱۱ء)
(۵) غزلیات شمشاد لکھنوی، رضا علی وحشت،
شفق عماد پوری، اخگر اچھے گڑھی، بسمل موہانی
اعجاز لکھنوی، حسرت موہانی
(۶) نوید مقدم شاہی (نظم)، اسمٰعیل میرٹھی
ضمیمہ: غزلیات مشاعرہ علی گڑھ

شمارہ ۶ - جون ۱۹۱۱ء

(۱) ظہیر دہلوی از حسرت موہانی
(۲) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۳) تنقید رسایل وکتب: جام سرور از سرور جہان آبادی
کلام فیروزانہ حکیم فیروزالدین احمد فیروز،
اسٹار آف دی ایسٹرن، ملبورن، آسٹریلیا۔
(۴) مرحوم منشی امیر اللہ تسلیم
(۵) حصۂ نظم: غزلیات آسی سکندرپوری،
شمشاد لکھنوی، مضطر خیرآبادی، نادر علی برتر
محمدآبادی، ہجر شاہجہانپوری، شوکت بلگرامی،
بسمل موہانی، حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: انتخاب دیوان مولوی
سید علی حیدر نظم لکھنوی۔

شمارہ ۷ - جولائی ۱۹۱۱ء

(۱) تسلیم لکھنوی از حسرت موہانی
(۲) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۳) ادب الکاتب والشاعر از نظم طباطبائی
(۴) اڈیٹوریل نوٹس: جرمنی میں اسلام اور مصر۔
مصر میں لارڈ کچنر کا تقرر
(۵) تنقید رسایل وکتب: الفرائض،
مولفہ محبوب الرحمٰن۔ کلام منشی دین محمد فوق۔
(۶) حصۂ نظم: غزلیات عبدالعلیم آسی۔
وفا رامپوری، عزیز لکھنوی، شوکت بلگرامی،
محوی لکھنوی، بسمل موہانی، منگل سین بیدل

حسرت موہانی۔
قطعہ تاریخ وفات حضرت تسلیم لکھنوی
از صفدر مرزاپوری
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: انتخاب دیوان
سید علی حیدر نظم لکھنوی

شمارہ ۸ - اگست ۱۹۱۱ء

(۱) تسلیم کی شاعری از حسرت موہانی
(۲) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۳) ادب الکاتب والشعراء ۲
(۴) اڈیٹوریل نوٹس
(۵) رسید تنقید رسایل وکتب: دفتر خیال از تسلیم لکھنوی کا
نظم گہر سنج از شمشاد لکھنوی، خمخانۂ سرور
از سرور جہان آبادی، انشائے اردو: مجموعہ
خطوط بنام تیغ بھوپال از رسالہ الحجاب بھوپال
خون حسرت: مثنوی صبر رامپوری، اغلاط احسن
یعنی احسن مارہروی کی نظم "اردو لشکر" پر صبر
رامپوری اعتراضات۔
(۶) حصۂ نظم: غزلیات فطرت موہانی، صفی لکھنوی،
بیخود بدایونی، شوکت بلگرامی، الہم لکھنوی، محوی لکھنوی،
امام خاں نوشہروی، حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: انتخاب دیوان سید علی حیدر نظم لکھنوی کا

شمارہ ۹ - ستمبر ۱۹۱۱ء

(۱) تسلیم کی شاعری ۲ از حسرت موہانی
(۲) انتخاب بیاض محمد آصف موہانی
(۳) اردو زبان کے قدیم گلدستے از حسرت موہانی
(۴) تنقید رسایل وکتب: رسالہ تمدن دہلی،
راحت الحجاج، رسالہ ادیب، رسالہ قند پارسی
علی گڑھ
(۵) حکیم ہدایت الحسن موہانی رضوی کی وفات پر
تعزیتی نوٹ
(۶) بعد مدت کے فلک لایا دریا باد میں (نظم)
ثاقب اکبرآبادی

(۷) غزلیات صفی لکھنوی، کلیم لکھنوی، عرش گیاوی، شیدا رامپوری، بسمل موہانی، عبرت موہانی، حسرت موہانی۔
قطعہ سال وفات تسلیم لکھنوی از شفق عمادپوری
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: دیوان طاہر فرخ آباد(ی)

شمارہ ۱۰ - اکتوبر ۱۹۱۱ء

(۱) شاگردان تسلیم ۱ (شوق نیموی) از حسرت موہانی
(۲) اردو زبان کے قدیم گلدستے (گلکدۂ ریاض خیرآبادی)
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) شذرات: جنگ اٹلی و ٹرکی۔ بعض ہندو اخباروں کی شرارت اور بعض مسلمان اخباروں کی بے حمیتی۔ مسلمانان ہند کا طرز عمل
(۵) نوحہ وفات محمد عزیز خاں خلف حبیب الرحمن خاں شروانی از ثاقب اکبرآبادی
(۶) غزلیات آسی سکندرپوری، بیخود بدایونی، شوکت بلگرامی، توفیق حیدرآبادی، احمد حسین یزدانی، کلیم لکھنوی، فطرت موہانی، منگل سین ؟، حسرت موہانی۔
(۷) قطعہ سال وفات تسلیم لکھنوی از امام الدین طالب
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: انتخاب دیوان ملک الشعراء قاضی محمد صادق خاں اختر۔

شمارہ ۱۱ - نومبر ۱۹۱۱ء

(۱) شاگردان تسلیم ۲ (فخر الدین خیالی رائے بریلی) از حسرت موہانی
(۲) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۳) رسم پردہ اور اس کی حقیقت (ماخوذ از کتاب تحریر المراۃ قاسم امین بک مصری)
(۴) اردو زبان کے قدیم گلدستے (گلکدۂ ریاض)
(۵) شذرات مع تنقید رسائل کتب: مسلمانوں پر جنگ اٹلی و ٹرکی کا اثر۔ ثمر فصاحت: دیوان حسن بریلوی
(۶) غزل منشی نوبت رائے نظر (ماخوذ از رسالہ تمدن ستمبر ۱۹۱۱ء)
(۷) غزلیات وفا رامپوری، محشر لکھنوی، شوکت بلگرامی، شفق عمادپوری، بسمل موہانی، بسمل ہوشیارپوری، عنایت احمد رفعت، حسامی وارثی، امام خاں نوشہروی، حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: بقیہ انتخاب دیوان قاضی محمد صادق خاں اختر و انتخاب دیوان مشتاق لکھنوی

شمارہ ۱۲ - دسمبر ۱۹۱۱ء

(۱) شاگردان تسلیم ۳ (عرش گیاوی) از حسرت موہانی
(۲) ادب الکاتب والشاعر ۴ از نظم طباطبائی
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) دارجیلنگ کا پھول
(۵) مروجہ پردہ کا شرعی ثبوت (ماخوذ از رسالہ النجم لکھنو)
(۶) تنقید رسایل وکتب
(۷) حصہ نظم: سلام از اعجاز لکھنوی، غزلیات شاد عظیم آبادی، بیخود بدایونی، شوکت بلگرامی، شفق عمادپوری، ثاقب اکبرآبادی، فانی بدایونی، حسرت موہانی۔
قطعہ تاریخ وفات تسلیم لکھنوی، از محوی لکھنوی و قطعہ تاریخ انتقال بسمل موہانی از شہباز خاں عاصی
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: بقیہ انتخاب دیوان مشتاق لکھنوی

جلد ۱۳

شمارہ ۱ - جنوری ۱۹۱۲ء

(۱) حاذق رامپوری از اڈیٹر
(۲) ادب الکاتب والشاعر ۵ نظم طباطبائی
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) تنقید رسایل وکتب: رسالہ اردو جالندھر (دسمبر ۱۹۱۱ء)، رسالہ نظام المشائخ
(۵) اردو زبان کے قدیم گلدستے (گلدستۂ نتیجۂ سخن کلکتہ)
(۶) دنیائے اسلام اور دول یورپ۔ جنگ طرابلس اور مسلمانان ہند کا طرز عمل از اڈیٹر
(۷) رباعیات و سلام شوکت بلگرامی
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: انتخاب دیوان شاد عظیم آبادی

شمارہ ۲-۳ فروری - مارچ ۱۹۱۲ء

(۱) احسن مارہروی۔
(۲) ادب الکاتب والشاعر ۶ نظم طباطبائی
(۳) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۴) انتخاب غزلیات مشاعرہ علی گڑھ
(۵) اردو زبان کے قدیم گلدستے (نتیجۂ سخن کلکتہ)
(۶) تنقید رسایل وکتب: مسلم گزٹ لکھنو (جنوری ۱۹۱۲ء)
(۷) جنگ طرابلس کا نظارہ ایک عربی شاعر کی ...
(۸) مولوی عزیز مرزا مرحوم: مرثیہ از سید ہاشمی فریدآبادی
(۹) رباعیات شاد
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: بقیہ دیوان شاد۔ رسالہ اصلاح و ازاحۃ الاغلاط از شوق نیموی

شمارہ ۴ - اپریل ۱۹۱۲ء

(۱) بیخود بدایونی از اڈیٹر
(۲) ادب الکاتب والشاعر ۷ از نظم طباطبائی
(۳) ایک بہادر اپنے جوان بیٹے کی قبر پر از خود رفتہ (آیرش نظم سے ماخوذ)
(۴) اردو زبان کے قدیم گلدستے (نتیجۂ سخن۔ کلکتہ)
(۵) انتخاب بیاض حسرت
(۶) کھل اور بل، پیرنا اور تیرنا از شوق قدوائی
(۷) تنقید رسائل وکتب: تپ دق مؤلفہ میرزا علی حسین عروج سخن یعنی دیوان سید علی حسین ضمیم بلند شہری۔ رسالہ جہاد و ...۔
(۸) انگلستان، مصر اور جنگ طرابلس
(۹) روداد مشاعرہ مارہرہ مع انتخاب
ضمیمہ اردوئے معلّٰی: غزلیات مشاعرہ مارہرہ

شمارہ ۵ - مئی ۱۹۱۲ء

(۱) نسیم بھرتپوری۔
(۲) ادب الکاتب والشاعر ۸ نظم طباطبائی
(۳) اردو زبان کے قدیم گلدستے (پیام یار لکھنؤ)
(۴) مولوی آل حسن مرحوم موہانی
از حیات الحسن موہانی
(۵) انتخاب بیاض حسرت موہانی: رباعیات ابوسعید ابوالخیر
(۶) تنقید رسایل وکتب: اخبار مرہٹا پونا ۔ پولٹیکل قیدی، علامہ رشید رضا۔ مسٹر تلک
(۷) غزلیات تیمور بدایونی، بیباک شاہجہانپوری، شوکت بلگرامی، نوح ناروی۔ حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: انتخاب دیوان میر شیر علی افسوس

شمارہ ۶ - جون ۱۹۱۲ء

(۱) حسن بریلوی از اڈیٹر
(۲) جنگ طرابلس پر شاعرانہ خیالات
(۳) ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم (ماخوذ از البشیر اٹاوہ)
(۴) اردو زبان کے قدیم گلدستے (پیام یار لکھنؤ)
(۵) انتخاب تذکرہ خازن الشعرار
(۶) ادب الکاتب والشاعر ۹ از نظم طباطبائی
(۷) مثنوی گلدستۂ رنگیں در صنعت تجنیس
از سعادت یار خاں رنگین
(۸) رسید رسایل وکتب
(۹) غزلیات ناطق لکھنوی، امیر بدایونی، شوکت بلگرامی، دلیر مارہروی، مضطر دہلوی، وفا رامپوری، محشر لکھنوی، بسمل موہانی، حسرت موہانی
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: انتخاب دیوان میر نظام الدین ممنون

جلد ۱۴

شمارہ ۱-۲ جولائی - اگست ۱۹۱۲ء

(۱) صنعت مرادآبادی
(۲) انتخاب تذکرہ خازن الشعرار
(۳) تنقید شرح غالب از ناطق لکھنوی
(۴) ادب الکاتب والشاعر ۱۰ از نظم طباطبائی
(۵) انتخاب بیاض صابر موہانی مرحوم
(۶) اردو زبان کے قدیم گلدستے (پیام یار)
(۷) تنقید رسایل وکتب: اسلام اور عقلیت مولفہ محمد ظریف۔
نعتیہ کلام، مرتبہ محمد حسین حاذق، کلام فلک بالتقویٰ از منشی لال پند فلک۔
طبیب العاملہ مرتبہ عبدالحیٔ، زوال بغداد از عبدالحلیم شرر
اخبار المعین امرتسر۔ الہلال کلکتہ (۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء)
اخبار اسلامک فریٹرنٹی
(۸) غزلیات رضا علی وحشت، شوکت بلگرامی، محشر لکھنوی، وصف لکھنوی، نوح ناروی، عیش بریلوی، بسمل موہانی، حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: دیوان اشرف شاگرد مرزا ضیغم

شمارہ ۳ - ستمبر ۱۹۱۲ء

(۱) منشی بنواری لال شعلہ از حسرت موہانی
(۲) ادب الکاتب والشاعر ۱۱ از نظم طباطبائی
(۳) انتخاب تذکرہ خازن الشعرار
(۴) تنقید اسلام اور عقلیت مولفہ محمد ظریف
(۵) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۶) پولٹیکل نوٹ از اڈیٹر
(۷) رسید تنقید رسایل وکتب: زمانہ کانپور۔ دیوان بہار۔ بہارستان خیال نطق۔
تفہیم القواعد، مرتبہ حافظ جلال الدین۔
سوال وجواب قواعد اردو، مؤلفہ نثار علی بیگ
رسالہ مرقع عالم۔
غزلیات وصف لکھنوی، شوکت بلگرامی، ناز بدایونی، نوح ناروی، امیر بدایونی، عرش گیاوی، بسمل موہانی
حسرت موہانی، امام خاں نوشہروی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: برندرابن از شعلہ علی گڑھی

شمارہ ۴ - اکتوبر ۱۹۱۲ء

(۱) اڈیٹوریل نوٹس: خاتمہ جنگ طرابلس۔ اخبار وطن کی کوتاہ بینی۔
(۲) میاں سید حسین احمد بیباک شاہجہانپوری
(۳) ادب الکاتب والشاعر ۱۲ از نظم طباطبائی
(۴) تنقید اسلام اور عقلیت از محمد ظریف
(۵) تنقید شرح غالب از سید احمد ناطق لکھنوی
(۶) تنقید رسایل وکتب: معجز نما: دیوان معجز سہسوانی۔ رسالہ مرقع عالم ہردوئی۔
(۷) غزلیات عرش گیاوی، وصف لکھنوی اعجاز لکھنوی، شفق عماد پوری، نوح ناروی، احسن مارہروی، ساقی دہلوی، شوکت بلگرامی
حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: انتخاب کلیات ذکی مرادآبادی

شمارہ ۵ - نومبر ۱۹۱۲ء

(۱) انجمن ہلال احمر قسطنطنیہ۔
(۲) نواب احمد علی خاں رونق ٹونکی از حسرت موہانی
(۳) جنگ اور دول یورپ مع قصیدہ جنگی از عبدالحلیم آفندی (عربی اشعار مع اردو ترجمہ)
(۴) ادب الکاتب والشاعر ۱۳ از نظم طباطبائی
(۵) انتخاب تذکرہ خازن الشعرار از سید میر، حبان آملی الہ آبادی
(۶) عالم حقیقت از مولانا آزاد سبحانی
(۷) انتخاب بیاض سید اکبر حسن موہانی
(۸) تنقید رسایل وکتب: کلیات اکبر آبادی حصہ دوم بہار جوشش یعنی دیوان مہیشور پرشاد سنگھ، رسالہ مرقع شاہجہانپور (ستمبر ۱۹۱۲ء)، دیوان منشی سالک رام سالک۔
(۹) حصہ نظم: نظم فارسی از فاروق دیوانہ۔ غزلیات بیباک شاہجہانپوری، محشر لکھنوی، شوکت بلگرامی، بے نظیر شاہ، ناز بدایونی، وصف لکھنوی، عطا سہارنپوری، حسرت موہانی،
ضمیمہ اردوئے معلیٰ: بقیہ انتخاب کلیات ذکی مرادآبادی

شمارہ ۵-۶ دسمبر ۱۹۱۲ء

(۱) امداد انجمن ہلال احمر۔
(۲) مولوی عبدالرزاق شاکر
(۳) فریاد ایک عاشق مجبور کی زبان سے
از ثاقب اکبرآبادی
(۴) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۵) ادب الکاتب والشاعر ۱۴ نظم طباطبائی
(۶) تنقید رسایل وکتب : اخبار آزاد کانپور۔
(۱۱ دسمبر ۱۹۱۲ء) سیر دیہات از محمد اسلم ...
مسلم یونیورسٹی کے متعلق نواب وقار الملک کی رائے
یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ کے کئی شماروں میں
شایع ہوئی۔
(۷) غزلیات شاہجہاںپوری، بےنظیر شاہ وارثی،
ناز بدایونی، کیفی حیدرآبادی، عرش گیاوی،
محمدی جان صاحبہ لطیف، حسرت موہانی۔
ضمیمہ اردوئے معلیٰ : مجموعہ سلام ہائے فانی، محمد حسین ...

جلد ۱۵

شمارہ ۱- جنوری ۱۹۱۳ء

(۱) امداد انجمن ہلال احمر
(۲) نیر حسین تسکین از اڈیٹر
(۳) موت اور بقا از آزاد سبحانی
(۴) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۵) ادب الکاتب والشاعر ۱۵ نظم طباطبائی
(۶) اردو زبان کے قدیم گلدستے دفتر دعظم خیز
(گلدستۂ دہرم)
(۷) تنقید رسایل وکتب : رسالہ نقاد الرد
اخبار آزاد کانپور
(۸) بیخود بدایونی کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی نوٹ
(۹) حصہ نظم : ہوشیار (نظم) از فاروق دیوانہ
فقیر کی صدا (نظم) از فاروق دیوانہ - غزلیات
حسرت موہانی، محوی لکھنوی، محمدی جان لطیف
لکھنوی

(۱۰) نوٹس : مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا فیصلہ -
مسلم لیگ اور مسلمانوں کا سیاسی مستقبل، جنگ بلقان
ضمیمہ اردوئے معلیٰ : انتخاب دیوان جرأت

شمارہ ۲-۳ فروری - مارچ ۱۹۱۳ء

(۱) سرمایۂ اعانت عساکر عثمانیہ (فہرست چندہ)
(۲) دلیر مارہروی از احسن مارہروی
(۳) فتنۂ قسطنطنیہ (ترجمہ)
(۴) انور بے (ماخوذ از مسلم گزٹ)
(۵) ادب الکاتب والشاعر ۱۶ نظم طباطبائی
(۶) انتخاب بیاض حسرت موہانی
(۷) دول یورپ اور ترکی از مسٹر بانٹ
(۸) تنقید رسایل وکتب : رسالۃ الاسلام بایان
العلم کانپور (جنوری ۱۹۱۳ء)
(۹) میرن کار فرمانی (نظم) ہاشمی فریدآبادی
(۱۰) غزلیات عابد سہسوانی، نوح ناروی، بسمل موہانی
محمدی جان لطیف، عبدالصمد حسن موہانی، حسرت موہانی
(۱۱) علی گڑھ میں تحریک بائیکاٹ
(۱۲) سر جیمس مسٹن کی تقریر گورکھپور
ضمیمہ اردوئے معلیٰ متعلق فتوائے بائیکاٹ

شمارہ ۴- اپریل ۱۹۱۳ء

(۱) فہرست چندہ جنگ بلقان وبیفیت تمسکات عثمانی
(۲) طیش مارہروی از احسن مارہروی
(۳) مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے از احمد رضا خاں بریلوی
(۴) انجمن خدام حرمین کی مبارک تحریک
از شوکت علی
(۵) لفظ نم کی تحقیق از حضرت عیش امروہوی
(۶) انتخاب بیاض صابر موہانی
(۷) تنقید رسایل وکتب : رسالہ العصر لکھنو -
روزنامچۂ سیاحت مؤلفہ غلام الثقلین -
معرکۂ چکبست وشرر مولفہ مرزا محمد شفیع -
لغات جدیدہ از سید سلیمان ندوی -
خیالات عزیز از مولوی عزیز مرزا -

گلدستہ قرار یعنی دیوان قرار شاہجہاںپوری -
ملہم تاریخ، ملخصہ ومترجمہ تسلیم سہسوانی -
سالار القوانین - فلسفۂ علائیہ - کوک شاستر
مؤلفہ پیارے لال -
(۸) اڈیٹوریل نوٹس : علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا
مستقبل - گروکل کانگڑی کا سالانہ جلسہ -
مولانا شبلی کی کمزوری - کونسل کا مسلمان
نامزد شدہ ممبر - حجم اردوئے معلیٰ - خاتمہ
جنگ بلقان کے آثار -
(۹) حصہ نظم : ترانۂ رضا از محمد رضا صدیقی -
غزلیات ثاقب اکبرآبادی، عیش بریلوی -
حسرت موہانی -
ضمیمہ متعلق بہ تحریک مقاطع (استفسار اور
اس کا جواب)

شمارہ ۵-۶ مئی - جون ۱۹۱۳ء

(۱) فہرست چندہ امداد ترک
(۲) ہجر شاہجہاںپوری از حضرت رسا
(۳) لفظ نم کی تحقیق از نظم طباطبائی
(۴) انتخاب بیاض ثاقب اکبرآبادی
(۵) اردو پریس کا خاتمہ از حسرت موہانی
(۶) علی گڑھ سے سید ہاشمی صاحب کا اخراج
(۷) تنقید رسایل وکتب : رسالہ توحید میرٹھ
(۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء)
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء)
شیخ عبداللہ صاحب کا پمفلٹ، البلاغ - تحریک مقاطعہ
(۸) غزلیات نوح ناروی، شوکت بلگرامی،
قوی امروہوی، محمدی جان لطیف -
(۹) دستور العمل انجمن خدام کعبہ
ضمیمہ اردوئے معلیٰ : حیات تسلیم مکمل مع تصویر

جلد ۱۶

شمارہ ۱-۲ جنوری - فروری ۱۹۲۵ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : اردوئے معلیٰ کانپور -

رسالہ نشتر احمد آباد

(۲) ارباب سخن : معاصرین حسرت

(۳) صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی اسلامی میونسپلیاں

(۴) شجرۂ طیبہ

(۵) نکات سخن

(۶) انتخاب سخن : انتخاب دیوان شاہ حاتم

شمارہ ۳ - مارچ ۱۹۲۵ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : اردوئے معلٰی کانپور اودھ پنچ لکھنؤ، شحنۂ شریعت کانپور۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ۲۳-۱۹۲۲ء۔ مرزا غالب کی شاعری مولفہ محمد عسکری

(۲) ارباب سخن : وفا رامپوری

(۳) شجرۂ طیبہ

(۴) نکات سخن

(۵) انتخاب سخن : انتخاب دیوان رنگین و نثار شاگردان شاہ حاتم

شمارہ ۴ - اپریل ۱۹۲۵ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : فرائض غوثیہ مؤلفہ سلامت اللہ فرنگی محلی - رسالہ روحانیت گورکھپور گوہر نامہ از ثاقب اکبرآبادی

(۲) ارباب سخن : گستاخ رامپوری

(۳) شجرۂ طیبہ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ

(۴) نکات سخن

(۵) انتخاب دیوان نثار شاگرد حاتم

(۶) ملفوظ رزاقی ، از عبدالباری فرنگی محلی

شمارہ ۵ - ۶ مئی - جون ۱۹۲۵ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : تواریخ وصال مؤلفہ شاہ غلام جیلانی رزاقی ۔ الطاف الرحمٰن بتفسیر القرآن از عبدالباری۔ اثرستان ؛ دیوان اثر لکھنوی ۔ تلقین مذہب مصنفہ جے بہادر شاہ

(۲) تواریخ وصال مؤلفہ شاہ غلام جیلانی (اصل تصنیف کا ایک حصہ) رزاقی

(۳) نکات سخن

(۴) انتخاب سخن : انتخاب دیوان بیدار، وتاباں و ملا

(۵) ملفوظ رزاقی از عبدالباری فرنگی محلی

(۶) غزلیات بیباک شاہجہانپوری ، جلیل قدوائی ، وحیدالدین سلیم

شمارہ ۷ جولائی ۱۹۲۵ء

(۱) تخیل کے کرشمے (نظم)

(۲) تواریخ وصال از شاہ غلام جیلانی

(۳) نکات سخن

(۴) انتخاب سخن : دیوان (الٰہی بخش خاں) معروف نواب محمد یار خاں امیر (محمد یار خاں امیر رامپوری)

(۵) ملفوظات رزاقی از عبدالباری فرنگی محلی

شمارہ ۸ - ۹ - اگست - ستمبر ۱۹۲۵ء

(۱) غزلیات بیباک شاہجہانپوری، شاہ عطا کریم زاہدی ، درد کاکوروی ۔

(۲) خطبہ صدارت حسرت موہانی جلسہ تحفظ آثار متبرکہ حجاز منعقدہ لکھنؤ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۵ء

(۳) تواریخ وصال از غلام جیلانی رزاقی

(۴) ملفوظات رزاقی از عبدالباری فرنگی محلی

(۵) تنقید رسایل وکتب : تاریخ دریاباد۔ قاموس المشاہیر از نظامی بدایونی ، گل رعنا از عبدالحئی وغیرہ

(۶) انتخاب دیوان شاہ نصیر

شمارہ ۱۰ - ۱۱ - ۱۲ - اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۵ء

(۱) غزلیات بیباک شاہجہانپوری عطا کریم زاہدی، حسرت موہانی

(۲) خطبہ صدارت حسرت موہانی آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور

(۳) تواریخ وصال از غلام جیلانی رزاقی

(۴) تنقید رسایل وکتب : قیل وقال از محمد فاروق د تاریخ اندور، شاہان مالوہ از امیر احمد علوی ۔ روح تنقید از محی الدین قادری زور، نشاط روح از اصغر گونڈوی ۔ بحر ذخار مع اردو ترجمہ از مولانا وجیہ الدین۔

(۵) انتخاب دیوان حسرت موہانی حصہ پنجم و ششم

جلد ۱۷

شمارہ ۱-۲ جنوری - فروری ۱۹۲۶ء

(۱) غزلیات بیباک شاہجہانپوری ، شفیق صدیقی ، قیس عظیم آبادی ۔

(۲) حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی

(۳) تواریخ وصال از شاہ غلام جیلانی رزاقی

(۴) نکات سخن

(۵) تنقید رسایل وکتب : یادگار انیس از امیر احمد علوی، باطل شکن از شاہ سلیمان پھلواروی ، رحمت باری از شہید انصاری

(۶) انتخاب دیوان حسرت موہانی ۔ حصہ ہفتم

شمارہ ۳ - مارچ ۱۹۲۶ء

(۱) غزلیات بیباک شاہجہانپوری، قمر بدایونی ، ناقف امروہوی ۔

(۲) ذبیح چھپراموی

(۳) تواریخ وصال از غلام جیلانی رزاقی

(۴) چکبست لکھنوی

(۵) تنقید رسایل وکتب : تاریخ السلف مؤلفہ عبدالباری معنی اجمیری ۔ رسالہ حسن وعشق سہسرام

(۶) ضمیمہ : انتخاب دیوان بقا ، بیتاب دہلوی ، مسرت بریلوی، طالب رامپوری ۔

شمارہ ۴، ۵، ۶ - اپریل، مئی، جون ۱۹۲۶ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : اردوئے معلٰی کانپور ۔ سرمایۂ تسکین یعنی مجموعۂ کلام محمد یٰسین تسکین ۔ مناقب رزاقیہ از نظام الدین فرنگی محلی

ترجمہ صبغت اللہ شہید انصاری۔ رسایل متفرق
تلق بہ خلافت و کانگریس از مولوی سبحان اللہ۔
،انہ کانپور۔
، جلیست لکھنوی۔
، کمیونسٹ کانفرنس میں حسرت موہانی کا
خطبہ استقبالیہ
، دیوان حسرت ہشتم و نہم
، غزلیات بیباک شاہجہانپوری، نازش بدایونی،
شفیق جونپوری، نہال دہلوی۔

ارہ ۷ تا ۱۲ جولائی تا دسمبر ۱۹۲۶ء

تنقید رسایل و کتب۔
، ارباب سخن، نکات سخن و انتخاب سخن۔
، متذکات سخن
، حالات حسرت مکمل مع تصویر
، دیوان حسرت موہانی حصہ دہم
، غزلیات بیباک شاہجہانپوری، سرشار کسمنڈوی
حافظ بیتاب گڈھی

جلد ۱۸

ارہ ۱۔ جنوری ۱۹۲۷ء

تنقید رسایل و کتب: باقیات فانی یعنی از رنگ
بنی مجموعہ غزلیات جلال الدین اکبر، شنیت شکنتلا
اقبال در ماسحر۔ پس پردہ (مجموعہ مضامین)
ماحیدر دہلوی۔ تہذیب الاخلاق دیشنوی،
محمد کاظم حسین رحمتی۔
، ارباب سخن: سلاسل شعرائے اردو
، نکات سخن: معائب شاعری
، انتخاب سخن: انتخاب دیوان غضنفر، دیوان
سا، دیوان رقت، دیوان رنا۔
، غزلیات بیباک شاہجہانپوری، طپش مارہروی،
حسرت موہانی۔
فروری، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۲۷ء کے
پچے شائع نہیں ہوئے

شمارہ ۶۔ جون ۱۹۲۷ء

(۱) تنقید رسایل و کتب: اردوئے معلٰی کانپور۔
حفظ العلوم یعنی اردو انسائیکلوپیڈیا مؤلفہ
حفظ الرحمٰن منہاس لاہوری۔ سوانح شاد عظیم آبادی
مرتبہ قیس رضوی۔ گلشن حیات از قیس رضوی۔
حدیقہ نعت از یوسف طپش مارہروی۔
(۲) ارباب سخن: فہرست شعرائے اردو
(۳) معائب سخن
(۴) عیب تنافر از سید علی حیدر نظم طباطبائی
(۵) شاگردان راسخ دہلوی و مذاق بدایونی از
قمر بدایونی
(۶) غزلیات بیباک شاہجہانپوری، قمر بدایونی
(۷) انتخاب سخن: سلسلہ جرأت

شمارہ ۷، ۸، ۹ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۲۷ء

(۱) تنقید رسایل و کتب: رنگ زمانہ: محب دریابادی
کی نظموں کا مجموعہ۔ معیار التواریخ از اغلب موہانی
پنج رقعہ ولایت از شاہ محمد عزیز سفی پوری۔
مجموعۂ قصاید مومن مرتبہ ضیاء احمد بدایونی عقاید راحت
از غلام محمد شاہ راحت سرہدی۔
(۲) ارباب سخن: فہرست شعرائے دکن
(۳) معائب سخن۔
(۴) انتخاب دیوان جعفر علی حسرت۔
(۵) انتخاب دیوان جرأت
(۶) غزلیات بیباک شاہجہانپوری، قمر بدایونی۔
(۷) انتخاب سخن: انتخاب دیوان جلال، سائل،
شایق، نساخ و وحشت

شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۷ء

(۱) تنقید رسایل و کتب: سیرت باقی مولفہ عزیز حسن بقائی
پیام درا (نظم) از سید برکت علی شاہ۔ مادر ہند:
ترجمہ مدر انڈیا از خالدہ کے بیگ۔ شاما از کشن پرشاد کول
ہندوستان ہمارا از حفیظ جالندھری۔

برہمن دیوتا یا چھوت چھات از قدرت اللہ صدیقی۔
(۲) ارباب سخن۔
(۳) بقیہ دیوان جرأت

جلد ۱۹

شمارہ ۹ تا ۱۲ ستمبر تا دسمبر ۱۹۲۸ء

(۱) تنقید رسایل و کتب: پرواز خیال یعنی مجموعہ کلام
حمید لکھنوی۔ حکایات و احساسات از سجاد حیدر یلدرم
وقایع عالمگیر مرتبہ چودھری نبی احمد۔ رپورٹ
آل انڈیا مسلم کانفرنس دہلی منعقدہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء
و یکم جنوری ۱۹۲۹ء مرتبہ حفیظ الرحمٰن
(۲) معائب سخن
(۳) تلقدہ نہرو رپورٹ از شاہ بدر عالم
(۴) غزلیات نہال سیوہاروی، شفیق جونپوری،
کرم وارثی سنبھلی۔
(۵) انتخاب دواوین میر محمد حیات حسرت،
انعام اللہ خاں یقین، محمد باقر حزیں، خواجہ
کمال الدین شاعر، احسن اللہ خاں بیان مع غزلیات
مرزا مظہر جانجاناں۔

جلد ۲۰

شمارہ ۱۔۳ جنوری۔ مارچ ۱۹۲۹ء

(۱) تنقید رسایل و کتب: فیضان شوق از
شوق قدوائی۔ کلیات وفا از عبدالباری وفا۔
ہندوستان کے معاشرتی حالات (ازمنہ وسطیٰ)
از عبداللہ یوسف علی۔ حیات جلیل از مقبول احمد
مدنی
(۲) معائب سخن
(۳) غزلیات جدید
(۴) انتخاب دیوان ذوق، دیوان داغ
دیوان رسا، دیوان جگر مراد آبادی۔

شمارہ ۴۔ ۶۔ اپریل۔ جون ۱۹۲۹ء

(۱) تنقید رسایل و کتب: اسرار شریانیہ

از عبدالوہاب انصاری - شرح قصیدہ بُردہ ،
از نور عالم مطیر قادری
(۲) معائب سخن
(۳) غزلیات جدیدہ
(۴) انتخاب سخن : انتخاب دوادین فغاں، راسخ، رونق، صمیم، ندرت، نازاں، عزیز، محشر -

شمارہ ۷ - جولائی ۱۹۲۹ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : یورپ کا دستور حکومت از سید محمود شبیر - دنیا کا محسن از مرزا البشیر الدین -
ہندو شعرا در دربار رسول میں مرتبہ محفوظ الرحمٰن -
رپورٹ جمعیۃ اسلامیہ بغداد بابتہ ۱۹ - ۱۹۲۸ء -
اردو کے جدید رسالے : ادبی دنیا لاہور - مہر لکھنؤ - خضر راہ لکھنؤ - پروانہ دربھنگہ - سردش لاہور - مشاعرہ حیدرآباد - نوشیر کوئٹہ -
(۲) معائب سخن
(۳) انتخاب دیوان علی میاں کامل لکھنوی
(۴) غزلیات جدید

شمارہ ۸ - اگست ۱۹۲۹ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : اردوئے معلّٰی کانپور - انوارِ رزاقیہ مرتبہ الطاف الرحمٰن قدوانی -
سیر گل مؤلفہ جلیل قدوائی -
(۲) ارباب سخن : فہرست شعرائے اردو
(۳) انتخاب دیوان مسرور کاکوروی
(۴) غزلیات شفیق و نہال

شمارہ ۹ - ستمبر ۱۹۲۹ء

(۱) وزن رباعی غالب از عارف کانپوری
(۲) محاسن سخن
(۳) غزلیات جدید
(۴) انتخاب دیوان کامل لکھنوی

شمارہ ۱۰-۱۱- اکتوبر - نومبر ۱۹۱۹ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : اردوئے معلّٰی کانپور - برق تخیل از افسر امروہوی - تحفہ نماز از محمد ظفر - تفسیر قرآن از شایق احمد عثمانی
(۲) محاسن سخن
(۳) انتخاب دیوان جلال
(۴) غزلیات جگر مرادآبادی، حسرت موہانی

شمارہ ۱۲ - دسمبر ۱۹۲۹ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : کلیات عارف (فارسی) از خاقان حسین عارف دہلوی
روداد عمل لیگ مسلم پارٹی بنارس
(۲) معائب سخن از حسرت موہانی
(۳) دیوان علی میاں کامل لکھنوی
(۴) تضمین در نعت از حضرت نازش بدایونی

جلد ۲۱

شمارہ ۱ جنوری ۱۹۳۰ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : رسالہ ریل اسلام (REAL ISLAM) سنگاپور
علمی جنتری کانپور ۱۹۳۰ء - رسالہ جن لکھنؤ -
تاریخ عجیب یعنی سوانح عمری حضرت سلمان فارسی مولفہ شیر محمد
(۲) انتخاب دیوان نورالاسلام منتظر
(۳) غزلیات بیباک شاہجہانپوری، احسن مارہروی حسرت موہانی

شمارہ ۲-۳ فروری - مارچ ۱۹۳۰ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : خون کے آنسو مصنفہ منشی اشفاق حسین - خیرالبشر مرتبہ حکیم ایم اے زیدی مولود شریف مرتبہ سعیدہ سلطانہ - کائنات ادب مرتبہ حمید میرٹھی - بغاوت کردہ مولفہ منشی اشفاق حسین روزنامچہ مقدس یعنی سفرنامہ حاجی ابن علی -

(۲) محاسن سخن
(۳) انتخاب دیوان مجروح، سالک، حالی، زکی، اسمٰعیل، شعلہ، رشکی (سلسلۂ غالب)
(۴) ہنگام شام (نظم) حمید جالندھری

شمارہ ۴ - اپریل ۱۹۳۰ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : رسالہ چاند اردو الہ آباد ہمارے رسول از عبدالحیٔ فاروقی - چار یار از الیاس احمد مجیبی - تاریخ الامت حصہ ہفتم از اسلم جیراجپوری - انتخاب ودا از ثاقب کانپوری
(۲) محاسن سخن
(۳) انتخاب دیوان امیر و دیوان جلیل
(۴) غزلیات صفی لکھنوی، ندرت میرٹھی، ہادی مچھلی شہری، جگر مرادآبادی

شمارہ ۵ - مئی ۱۹۳۰ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : تذکرہ علمائے فرنگی محل از عنایت اللہ فرنگی محلی - حسرت الآفاق بوفاۃ مجمع الاخلاق از عنایت اللہ فرنگی محلی - پیمانۂ جنت از مولا بخش ہمدم - کلیات برہمن
(۲) محاسن سخن
(۳) انتخاب دیوان قایم چاندپوری، تنویر دہلوی، بہادر شاہ ظفر، شاداں -
(۴) تاج محل (نظم) از شفیق جونپوری -
(۵) غزلیات : ادن مچھلی شہری

شمارہ ۱۲ - دسمبر ۱۹۳۰ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : رسالہ الہادی کانپور (جون ۱۹۲۹ء)، آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ دسمبر ۱۹۲۸ء - اردو زبان وادب از سید ضامن علی خیالات مقبول جلد دوم مولفہ قاضی مقبول حسین
(۲) محاسن سخن
(۳) انتخاب دیوان برق و شاہد علی فانی
(۴) غزلیات حسرت موہانی - بیباک شاہجہانپوری -

جلد ۲۲

شمارہ ۱ جنوری ۱۹۳۱ء

(۱) تنقید رسایل وکتب: سہ ماہی ہندوستانی۔ الہ آباد۔ رسالہ ایوان گورکھپور۔ سبع ثانی یعنی مرزا دبیر کے سات بہترین مرثیوں کا مجموعہ۔ منتخبات ہندی کلام مرتبہ ... حسین۔
(۲) تذکرہ ارباب سخن: آباد عظیم آبادی و ابن نراین دربار لکھنوی۔
(۳) انتخاب دیوان بشن نراین ابر لکھنوی۔
(۴) انتخاب دیوان میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی۔

شمارہ ۲-۶ فروری جون ۱۹۳۱ء

(۱) تنقید رسایل وکتب: روح جذبات از اکبر حیدری۔ نیرنگ ادب از عبد الشہید معرکہ انتخاب ... از الطاف علی بریلوی۔ کلیات گوشہ نشین یعنی ملفوظات سید برکت علی شاہ۔ اردو املا از عبد الستار صدیقی
(۲) تذکرۂ ارباب سخن لبسلسلہ سابق
(۳) غزلیات مائل دہلوی، حسرت موہانی، شفیق عمادی جونپوری

شمارہ ۷-۸ جولائی۔ اگست ۱۹۳۱ء

(۱) تنقید رسایل وکتب: دیوان یقین۔ دیوان اثر دہلوی۔ مثنوی خواب وخیال۔ چمنستان شعرا مؤلفہ لچھمی نراین شفیق۔ حیاتِ مومن۔ از عرش گیاوی۔ سوانح امیر مینائی مؤلفہ حافظ جلیل حسن۔
(۲) تذکرہ ارباب سخن لبسلسلہ سابق
(۳) غزلیات مائل دہلوی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی
(۴) خطبۂ صدارت حسرت موہانی اجلاس جمعیۃ علمائے صوبۂ متحدہ الہ آباد ۸، ۹ اگست ۱۹۳۱ء
(۵) انتخاب دیوان اثر دہلوی
(۶) انتخاب دواوین میر شیر علی افسوس، امانت لکھنوی، لطافت لکھنوی، فصاحت لکھنوی - جاہ لکھنوی

شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۳۱ء

(۱) تنقید رسایل وکتب۔
(۲) مرزا مائل دہلوی
(۳) انتخاب دیوان واسطی سندیلوی، ماہر لکھنوی جوہر، افسوس، شوق قدوائی (شاگردان امیر)

شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۳۱ء

(۱) تنقید رسایل وکتب: آئینۂ ادبی۔ آنحضرت کا دربار۔ دیوان قمر بدایونی۔
(۲) انتخاب دیوان حفیظ جونپوری و گستاخ رامپوری
(۳) انتخاب دیوان مضطر خیر آبادی، بے نظیر شاہ وارثی مست بنارسی، صفدر رامپوری
(۴) غزلیات قمر بدایونی، راغب بدایونی

جلد ۲۳

شمارہ ۱ جنوری ۱۹۳۲ء

(۱) غزلیات ابو الشرف مجددی، حسرت موہانی۔
(۲) انتخاب دیوان قمر بدایونی
(۳) تنقید رسایل وکتب: فخر حجاز از عبد الماجد دریابادی۔ تاریخ ادبیات ایران مترجمہ سجاد حسین جلوۂ وارث از صفدر علی۔ یادگار شیون از مرزا شجاع شیون۔ گلزار عشاق از عبد الغفور خاں

شمارہ ۲-۳ فروری۔ مارچ ۱۹۳۲ء

(۱) تنقید رسایل وکتب: مے دو آتشہ از شوکت بلگرامی۔ مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب مترجمہ قاضی محمد حسین۔ بالقصد در تذکرہ مرتبہ محمد حسین۔ سمات الاخیار مؤلفہ آسی سکندرپوری
(۲) غزلیات راغب بدایونی، قمر بدایونی و فا گورکھپوری
(۳) نظم الحج مع غزل حسرت موہانی۔
(۴) انتخاب دواوین جلیل، شرف، حسرت اکبر دانا پوری، اکبر الہ آبادی۔

شمارہ ۴-۵ اپریل۔ نومبر ۱۹۳۲ء

(۱) تنقید رسایل وکتب: ریاست مترجمہ ذاکر حسین خاں۔ سکہ اور شرح تبادلہ مرتبہ محمد احمد کاظمی۔ مسلمانوں کے افلاس کا علاج از محمد احمد کاظمی۔ صبوحی از سائر نظامی۔ ید بیضا یعنی مجموعہ غزلیات مرزا بیضا خاں امرتسری۔ ہشت جنت از شفیق جونپوری
(۲) غزلیات نازش بدایونی، قمر بدایونی، حسرت موہانی
(۳) مثنوی نیرنگ خیال از مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی

شمارہ ۶- دسمبر ۱۹۳۲ء

(۱) غزلیات سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، حسرت موہانی
(۲) انتخاب دیوان میر حسن صاحبِ مثنوی۔
(۳) انتخاب دیوان شفیق جونپوری
(۴) تنقید رسایل وکتب: رسالہ اردوئے معلیٰ کانپور رسالہ حجاب مؤلفہ مولانا اشرف علی تھانوی۔ رپورٹ جمعیۃ علمائے بہار۔ ساوتر ناول، اردو ترجمہ

جلد ۲۴

شمارہ ۱ جنوری ۱۹۳۳ء

(۱) تنقید رسائل وکتب: دیوانۂ حجاز از ابو البشر مجددی۔ تحفۂ حرمین نوری یعنی سفرنامہ نور الحق الارکی ضروری معلومات متعلق حج، مرتبہ اسمٰعیل غزنوی احسن الانتخاب از محمد علی حیدر قلندری علوی
(۲) نوادر حسن از حسرت موہانی
(۳) ارباب سخن: تذکرۂ شیفتہ
(۴) بقیہ انتخاب دیوان حسن
(۵) انتخاب دیوان شیفتہ و اشرف

شمارہ ۲، ۳، ۴- فروری، مارچ، اپریل ۱۹۳۳ء

(۱) حدیقۂ معرفت از حسرت موہانی
(۲) الجواہر العبقریہ فی سلوک القادریہ (عربی متن مع اردو ترجمہ)

شمارہ ۵ ۔ مئی ۱۹۳۳ء

(۱) تنقید رسایل وکتب :
(۲) غزلیات حسرت موہانی ، نوح ناروی
(۳) انتخاب دیوان کیف لکھنوی ، آزل لکھنوی
(یہ فہرست مضامین نامکمل ہے)

شمارہ ۶ ۔ ۷ جولائی ۔ اگست ۱۹۳۳ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : رسالہ نگار لکھنؤ ۔ خوارق بادویہ ۔ ذوالفقار بدیع از سید کلب ؑ
(۲) نوادر سخن از حسرت موہانی
(۳) انتخاب دیوان نظم طباطبائی
(۴) فہرست غزلیات کلیات حسرت موہانی

جلد ۲۵

شمارہ ۱ ۔ ۳ جنوری ۔ مارچ ۱۹۳۴ء

(۱) آل انڈیا مشاعرہ الہ آباد منعقدہ ۱۱ فروری ۳۴ء
(۲) کتاب الحج باب دوم و سوم

شمارہ ۷ ستمبر ۱۹۳۴ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : نغمۂ دل از دل شاہجہانپوری حقیقت حج از منظور علی ۔ موج نسیم از نواب حسین نسیم ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ از سیتارام کوہلی ۔ سلسلہ کلیۃ القرآن از واحدہ خانم
(۲) نوادر سخن از حسرت موہانی
(۳) غزلیات مجذوب
(۴) آئینۂ حرم
(۵) انتخاب دیوان دل شاہجہانپوری ، وفا رامپوری ، گستاخ رامپوری ۔

جلد ۲۶

شمارہ ۸ ۔ ۱۲ ۔ اگست ۔ دسمبر ۱۹۳۵ء

(۱) سوشلزم اور مولانا ابوالکلام آزاد
(۲) اسلام اور سوشلزم از مولانا ابوالکلام آزاد
(۳) آئینۂ حرم حصہ سوم
(۴) انتخاب دیوان بحر لکھنوی ، سحر لکھنوی
(۵) جوہر آئینہ از اسمٰعیل غزنوی
(۶) معلومات حج ۔

جلد ۲۷

شمارہ ۷ ، ۸ ، ۹ جولائی ، اگست ، ستمبر ۱۹۳۶ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : مسئلہ فلسطین از محمد اشرف خلاصۂ کوائف ممالک غیر ۔ البصار العین بشہادت الحسین از لطیف الدین
(۲) مستقل ضمیمہ سیاسی اردوئے معلٰی ، ستمبر ۱۹۳۶ء
(۳) حوادث انتقال عرش گیاوی ، نازش بدایونی ، تولا بدایونی ۔
(۴) انتخاب دواوین خواجہ وزیر لکھنوی ، میر کو عرش نادر اکبر آبادی ، مہر لکھنوی ، آباد لکھنوی ۔

شمارہ ۱۱ ۔ نومبر ۱۹۳۶ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : کلیم عجم یعنی کلیات سیماب اکبر آبادی
(۲) انتخاب دیوان حبیب کنتوری
(۳) انتخاب دیوان قدر بلگرامی
(۴) قدیم غزلیات سیماب اکبر آبادی

جلد ۳۱

شمارہ ۱ ۔ ۴ جنوری ۔ جون ۱۹۴۰ء

(۱) تنقید رسایل وکتب : باغ دلکش معروف بہ نغز مسعود رسالہ ادیب لکھنؤ ۔
(۲) غزل جلیل
(۳) دیوان حسرت موہانی حصہ دوازدہم

بقیہ اے دیدہ ورو

اور میں اور روبی سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگے ہیں ـــــ ہاں ، ابھی تک دیکھ رہے ہیں ، بے خبر سے ، کہ ہم تو ان کے ہیں ۔

شرفو ، جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بارے میں باتیں کرنا بے سود ہے اور جو ہونا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے کمرے سے فوراً کسی خالی فیملی کوارٹر میں چلے آؤ ، چند روز میں ہی تم دونوں کی شادی ہو جائے گی ـــــ

اور روبی ۔ ہماری بیٹی لکھی پر آج سے صرف میرا اختیار ہے اور وہ میرے ہی ساتھ رہے گی ۔

امی اکیلی کیسے رہے گی بابا ؟

اکیلی نہیں رہے گی بیٹی ۔ تمہاری امی کے ساتھ شرفو جو ہوگا ۔

ارے ہاں ، یہ تو میں بھول ہی گئی ـــــ ہاں ، تمہارے ساتھ رہوں گی بابا ـــــ شرفو چاچا ، امی اداس ہو جائے تو مجھے بلا لیا کرو ۔

بابا اور لکھی مجھے باپ بیٹی ہی محسوس ہو رہے تھے ۔

شاید بابا اور روبی بھی ـــــ میں نے بھی سوچ کو واپس ذہن میں دھکا دیا ہے لیکن گرتے گرتے وہ پھر کھڑی ہو گئی ہے ـــــ لکھی اگر سچ مچ بابا کی بیٹی ہے تو کیا حرج ہے ؟ ـــــ ہاں ، کیا حرج ہے ؟ بیٹیاں تو سب کی ساجھی ہوتی ہیں ۔ بھولا نہ سہی ، بابا سہی ـــــ پر نہیں ، بابا تو ہم سب کا بابا بھی ہے ۔ وہ کسی کا عاشق یا شوہر نہیں ، صرف بابا ہے ۔

لکھی کو بازوؤں میں تھامے وہ ہم دونوں کو دعا دینے کے لیے ہمارے قریب آ کھڑا ہوا ہے اور بابا کی ـــــ نہیں ، بھولا کی بیٹی میرے بالوں میں انگلیاں ڈال کر کھیلنے لگی ہے ۔

جگ مگ جیو ! ـــــ خوش رہو !

میں بہت خوش ہوں اور روبی بھی ، اور مجھے یقین ہے کہ بھولا بھی سنے گا تو بہت خوش ہوگا ۔

مرتبہ: محمد ضیاء الدّین انصاری

نقشِ حسرت

اُردوئے معلّٰی نیز حسرت موہانی کی تصانیف اور ان کی شخصیت و فن پر کتب و مضامین کی فہرست۔

تصانیفِ حسرت

دیوانِ حسرت

حصّہ اوّل

(اس میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک کی غزلیں شامل ہیں) علی گڑھ، اُردو پریس ۱۹۱۴ء

حصّہ دوم

(اس میں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کی غزلیں شامل ہیں) علی گڑھ، اُردو پریس

حصّہ سوم

اکتوبر ۱۹۱۶ء سے جولائی ۱۹۱۷ء تک لکھنؤ، الناظر پریس ۱۹۱۷ء

حصّہ چہارم

مرتبہ بیگم حسرت موہانی (اگست ۱۹۱۷ء سے اپریل ۱۹۱۸ء تک) 〃 〃 ۱۹۱۸ء

حصّہ پنجم

مرتبہ بیگم حسرت موہانی (اپریل ۱۹۱۸ء سے اپریل ۱۹۲۲ء تک) 〃 〃 ۱۹۲۳ء

حصّہ ششم

مرتبہ بیگم حسرت موہانی (بزمانہ قید فرنگ ثالث بمقام بڑودا سینٹرل جیل) 〃 〃 ب ت

حصّہ ہفتم

مرتبہ بیگم حسرت موہانی (۲۲ ستمبر ۱۹۲۳ء تا ۳۰ ستمبر ۱۹۲۳ء) 〃 〃 ۱۹۲۳ء

حصّہ ہشتم

مرتبہ بیگم حسرت موہانی (اکتوبر ۱۹۲۳ء تا نومبر ۱۹۲۳ء) 〃 〃 ۱۹۲۳ء

● مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حصّہ نہم

مرتبہ بیگم حسرت موہانی (اواخر ۱۹۲۳ء تک) لکھنؤ، الناظر پریس ۱۹۲۴ء

حصّہ دہم

مرتبہ بیگم حسرت موہانی (آخر مارچ ۱۹۲۴ء تک) 〃 〃 ۱۹۲۴ء

حصّہ یازدہم

حصّہ دوازدہم

حصّہ سیزدہم لکھنؤ، ہمدم برقی پریس ۱۹۵۱ء

دیوانِ حسرت موہانی کانپور، رئیس المطابع ۱۹۳۰ء
(جس میں کلیاتِ حسرت، حصّہ اول، دوم، سوم، و چہارم کی غزلوں کا انتخاب ہے)

انتخاب دیوانِ حسرت موہانی لکھنؤ، الناظر پریس ب ت
(جس میں کلیاتِ حسرت حصّہ پنجم تا دہم کی غزلوں کا انتخاب ہے)

دیوانِ حسرت موہانی مکمل کانپور، مطبع قیومی ۱۹۴۲ء
مرتبہ بیگم حسرت موہانی

انتخاب دواوین کانپور، مرکنٹائل پریس ۱۹۲۲ء
مع انگریزی ترجمہ از رحم علی ہاشمی
مرتبہ بیگم حسرت موہانی

کلیاتِ حسرت موہانی حیدرآباد، انتظامی پریس ۱۹۴۳ء

کلیاتِ حسرت موہانی لاہور، شیخ غلام علی (طبع سوم) ۱۹۶۴ء
مع مقدمہ از جمال میاں فرنگی محلی

کلیاتِ حسرت دہلی، شفیق بک ڈپو ۱۹۷۷ء

شرح دیوانِ غالب علی گڑھ، اُردو پریس ۱۹۰۵ء

نوادرِ سخن کانپور، رئیس المطابع ۱۹۲۵ء

محاسنِ سخن 〃 〃 ۱۹۳۷ء

معائبِ سخن 〃 〃 ۱۹۳۷ء

متروکاتِ سخن 〃 〃 ب ت

نکاتِ سخن [illegible] ب ت

مشاہداتِ زنداں دہلی، اشتراکی پریس ب ت

رپورٹ انڈین نیشنل کانگریس علی گڑھ، احسن المطابع ب ت
اکیسواں اجلاس ۱۹۰۵ء

رپورٹ انڈین نیشنل کانگریس علی گڑھ، اُردو پریس ب ت

بائیسواں اجلاس

ارباب سخن (حصّہ اوّل و دوم)	کانپور رحیمی المطابع	۱۹۲۶ء
انتخاب دیوان اشرف	علی گڑھ اُردو پریس	۱۹۱۲ء
" " جرأت	" "	۱۹۱۲ء
" " حاتم	کانپور احمد المطابع	۱۹۲۵ء
" " مرزا جعفر علی حسرت	علی گڑھ مطبع احمدی	۱۹۰۴ء
" " سوز	علی گڑھ احسن المطابع	۱۹۰۵ء
" شیفتہ کامل (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی)	" "	۱۹۰۵ء
" " قائم	" "	۱۹۰۵ء
" " مصحفی	" "	۱۹۰۵ء
" " میر حسن	علی گڑھ اُردو پریس	ب ت
" " شاہ مبارک آبرو		

خطبۂ استقبالیہ کمیونسٹ پارٹی کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۵ء بمقام کانپور

(جائزہ - کانپور - حسرت نمبر ۱۹۷۵ء) ص ۱۰۹ - ۱۱۰

اندر سبھا امانت (تبصرہ)

(جائزہ - کانپور - حسرت نمبر ۱۹۷۵ء) ص ۱۱۱ - ۱۱۳

خطوط بنام نشاط النساء بیگم (۱۰ عدد)

نقوش - مکاتیب نمبر ج ۲ - نومبر ۱۹۵۷ء) ص ۶۰۷ - ۶۱۴

خط بنام مولوی بشیر الدین

نقوش - مکاتیب نمبر ج ۲ - نومبر ۱۹۵۷ء) ص ۶۱۴

خط بنام حاجی نور احمد

نقوش - خطوط نمبر ج ۱ - ۱۹۶۸ء) ص ۳۲۱

حسرت موہانی کے فن اور شخصیت پر کتب ومضامین

کتب

(۱) احمر لاری

حسرت موہانی - حیات اور کارنامے	لکھنؤ - نامی پریس ۱۹۷۳ء

(۲) اشتیاق اظہر و نصرت موہانی

مولانا حسرت موہانی (حصّہ اوّل)	کراچی - حسرت میموریل سوسائٹی ب ت

(۳) انصاری، اثر بن یحییٰ

	دھولیہ - عالیہ پبلیکیشنز ۱۹۷۷ء
حسرت موہانی - ایک سیاسی ڈائری	

(۴) بیگم حسرت موہانی

سفرنامۂ عراق	کانپور - رحیمی المطابع ۱۹۲۷ء

(۵) پیام - حبیب الرحمٰن

حسرت سیاستداں اور حسرت شاعر

(۶) عارف ہسوی

حالات حسرت	دہلی - انجمن اشاعت نظریات اسلام ب ت

(۷) عبدالشکور

حسرت موہانی	لکھنؤ - انوار بک ڈپو ۱۹۵۳ء

(۸) عبدالقوی دیسنوی

حسرت کی سیاسی زندگی - چند جھلکیاں	پٹنہ - حلقۂ احباب ب ت

(۹) قادری - عبداللہ ولی بخش (مرتب)

حسرت کی یادیں	الہ آباد - ادارہ تصنیف و تالیف مجیدیہ اسلامیہ کالج ۱۹۵۲ء

(۱۰) نعیمہ بیگم

حسرت موہانی کی کہانی نعیمہ کی زبانی	حیدر آباد (سندھ) سعید آرٹ پریس ب ت

(۱۱) یوسف حسین خاں

حسرت کی شاعری	نئی دہلی - مکتبہ جامعہ ۱۹۶۱ء

رسائل کے خصوصی شمارے

اُردو ادب (حسرت نمبر)

جلد ۲ - شمارہ ۲ (اکتوبر - دسمبر) ۱۹۵۱ء

مندرجات

(۱) حسرت کی عظمت

آل احمد سرور ص ۹ - ۲۳

نگار

نگار، لکھنؤ۔ (حسرت نمبر)
جلد ۶۱۔ شمارہ ۱-۲ (جنوری-فروری) ۱۹۵۲ء

مندرجات

آج کل نئی دہلی

جائزہ

جائزہ (ہفتہ وار) کانپور۔ حسرت موہانی نمبر (ستمبر ۱۹۷۵ء)

مندرجات

کچھ متفرق مضامین

(نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر)

(۵) بیدار عابد رضا — حسرت
(برہان۔ دہلی۔ اگست ۱۹۶۱ء) — ص ۱۱۳-۱۱۶

(۶) جلیل قدوائی — حسرت موہانی
(نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر ج ۱-۱۹۵۶ء) — ص ۱۷۴-۱۷۷

(۷) حبیب الرحمٰن لدھیانوی
مولانا حسرت موہانی سے میری پہلی ملاقات
(قومی آواز۔ لکھنؤ۔ ۹ر جولائی ۱۹۵۱ء) — ص ۲

(۸) خافی خاں (سجاد حیدر یلدرم)
حسرت موہانی ایک قدر دان کی نظر سے
(زمانہ۔ کانپور۔ دسمبر ۱۹۰۸ء) — ص ۲۹۲-۲۹۹

(۹) عباسی، قاضی محمد عدیل
حسرت موہانی
(نذر مقبول۔ مرتبہ خیر بہوروی ۱۹۷۰ء) — ص ۱-۱۹

بقیہ ملاحظات

ہوکر سامنے آئے گا۔

آج کل کی تنگ دامانی کے باعث بعض اہم مضمون اس شمارے میں شامل نہ ہو سکے۔ یہ اب اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوں گے۔ ادارہ ان مضمون نگار حضرات سے معذرت خواہ ہے۔

اس نمبر کی ترتیب و تیاری میں عتیق صدیقی صاحب نے جو معاونت فرمائی اس کے لیے ادارہ ان کا ممنون و شکر گزار ہے۔

تصحیح جناب منظر شہاب صاحب کی غزل (مطبوعہ جون ۱۹۸۱ء) کے مطلع کا مصرع اولیٰ غلط شائع ہوگیا تھا۔ صحیح مطلع اس طرح ہے:

وہ زخمِ تیغ ستم جو حنا حنا سا تھا
اسی سے درد کا لمحہ رنگا رنگا سا تھا

بقیہ بیگم حسرت موہانی

(۲۲)

از کانپور ۳۰ر شوال ۱۳۴۱ھ [۱۴ر جون ۱۹۲۳ء]

خارجاً معلوم ہوا کہ غالباً مولانا کا اب حیدر آباد سندھ جیل میں تبادلہ کر دیا گیا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ یرودا جیل سے دریافت کیا ہے۔ مگر جواب ندارد۔ خیر خدا مالک ہے۔

(۲۳)

۲۰ر جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ [۲۸ر جنوری ۱۹۲۴ء] بنگلہ سیٹھ چھوٹانی پونا

مولانا کی تاکید ہے کہ جب تک میں نہ کہوں (یہاں سے) نہ جانا۔ دوسرے یہاں میں نے سیف الرسول (وارڈر) کی اپیل ہائی کورٹ میں وکیل بیرسٹروں کی رائے سے ۲۲ر دسمبر کو بمبئی ہائی کورٹ میں دائر کرادی ہے۔ ممکن ہے اس پر دفعہ ۱۶۱ رشوت والی اڑادی جائے تو مولانا کو بھی اس سے فائدہ ہوگا۔ رشوت قصہ بالکل لغو جھوٹ سراسر خلاف قاعدہ و قانون چلایا گیا ہے۔ ابھی تاریخ پیشی نہیں معلوم ہوئی غالباً ۶ر فروری کو ہوگی۔ اگر فیصلہ ٹھیک ہوا تو مجسٹریٹ کی صریح بے ایمانی کا راز کھل جائے گا۔ خیر۔ علاج برابر کر رہی ہوں — ●

بقیہ حسرت موہانی کے سیاسی رجحانات

حسرت کا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نام نہاد غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ملک کے سامنے مکمل آزادی کے آدرش کی شمع ہندو مسلمان اور تمام طبقوں کے لیے روشن کردی۔ وہ آزادی کے جذبے کو اپنی جان اور اپنے آرام سے کہیں زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اس کے لیے کسی قسم کی قربانی سے کبھی گریز نہ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی پرورش اس تخیل کی مخالفانہ بلکہ معاندانہ فضا میں پائی تھی۔ مگر وہ اپنے راستے پر برابر قائم رہے۔ اور اس کے لیے انھوں نے جیسی جیسی تکلیفیں اٹھائیں وہ تقریباً لاثانی ہیں۔ مسلم لیگی ان کے خلاف ہوگئے۔ خلافتی ان سے کنی کاٹنے لگے مگر وہ مردِ میدان آخر دم تک اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۱۸ء کی یوپی پولیٹیکل کانفرنس میں جو سیتاپور میں منعقد ہوئی تھی۔ اس پر کافی مباحثہ رہا تھا کہ ان کے قید پر کوئی ریزولیوشن پاس کیا جائے یا نہیں۔ اس لیے کہ مشکل سے کوئی اس پر آمادہ تھا کہ کھلے اجلاس میں اس کی تحریک کرے لیکن حسرت کسی طرح کے ہمدردانہ ریزولیوشنوں سے بالکل مستغنی تھے۔ وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کا کردار ان کی ہمت، ان کا استقلال یہ ایسی صفات ہیں کہ ان سے آج بھی ہم سبق لے سکتے ہیں:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما ●

"بیگم حسرت موہانی"

حسرت موہانی نے بیگم حسرت کی وفات کے بعد اردوئے معلی میں ایک طویل نوٹ مندرجہ بالا عنوان سے لکھا تھا جس کے ضروری اقتباسات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

نشاط النساء بیگم نام، خلف حافظ سید شبیر حسن موہانی اُن کی مان اصل قصبہ موہان توابع لکھنؤ، نیشا پوان خاندانِ سادات سے تھے... حسرت کے والد سید اظہر حسن کے بھن سید، منصور النساء بیگم حسرت کے والد سید شبیر حسن کی زوجہ تھیں...

۸ / اپریل ۱۹۳۷ء مطابق ۲۵ محرم ۱۲۵۶ھ ٹھیک گیارہ بجے دن کے وقت بیگم حسرت مکروہات دنیا سے آزاد ہو کر باطمینان واصل بحق ہو گئیں...

خدا گواہ ہے کہ راقم کے اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ ایثار و انکسار، حیا و غیرت، فہم و فراست، جرأت و صداقت، عزم و ہمت، وفا و سخا، حسنِ عقیدت، صدقِ نیت و خلوص عبادت، صحت مذاق، پاکی و پاکیزگی اور سب سے بڑھ کر عشقِ رسول اور محبت حضرتِ حق کے لحاظ سے شاید مسلمان عورتوں بلکہ مردوں میں بھی، آج ہندستان میں کم ایسے افراد ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرت سے بہتر تو کیا، ان کے برابر بھی قرار دے سکیں...

راقم کو بیگم حسرت کی جدائی سب سے زیادہ اس خیال سے شاق ہے کہ اب کوئی اس کی کوتاہیوں پر ملامت کرنے والا اور اس کی خامیوں پر زجر و توبیخ کرنے والا نہ رہا۔ ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر باقی کل باتوں میں بیگم اس سے [حسرت سے] بدرجہا بہتر تھیں۔ اس لیے انہیں ہر قسم کی تنبیہ کا حق تھا، جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا۔

حسرت کا نام آتے ہی ہمارا ذہن غیر شعوری طور پر بیگم حسرت کی طرف منتقل ہوتا ہے جو حسرت کی شریکِ زندگی ہی نہیں بلکہ شریکِ سیاست بھی تھیں۔ حسرت پر لکھنے والوں نے ان کا ذکر ضروری سمجھا ہے، اور ان کے خیال میں حسرت کی زندگی خصوصاً سیاسی زندگی کی، تعمیر و تشکیل میں بیگم حسرت نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ خود حسرت نے مشاہداتِ زنداں میں ممنونیت کے ساتھ ان کے ایثار و قربانی کو سراہنے کے علاوہ فخر کے ساتھ ان کے عزم و استقلال کو خراج پیش کیا ہے۔

حسرت کو اپنی پہلی یک سالہ قید و بند (۱۹۰۸ء) کی زندگی میں جن بے پناہ ذہنی و جسمانی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کی تفصیل مشاہدات زنداں سے معلوم ہو جاتی ہے، لیکن اسی دوران میں بیگم حسرت پر جو گزری ہوگی اس کا اجمالی حال بھی ہمیں نہیں معلوم ہوتا لیکن حسرت کے دوسرے دورۂ زنداں (۱۹۱۶) کے دوران میں بیگم حسرت کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا، ان کی ایک جھلک ان خطوط میں نظر آتی ہے جو حسرت ہی کے مقدمہ کے سلسلے میں انھوں نے اپنے اور حسرت کے مرشد زادے مولانا عبد الباری کو لکھے تھے۔ ان خطوط کا یہ پہلو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ ان کی وساطت سے بیگم حسرت کی کس مپرسی کا علم ہونے کے علاوہ ہمیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے عام سماجی و سیاسی معاشرے میں دفاعیت کی حد تک بزدلی کارفرما ہو گئی تھی۔ بعض بیرسٹروں نے جو حسرت کے دوست بھی تھے اور آگے چل کر ملک کی قومی زندگی میں نمایاں ہوئے، حسرت کے مقدمے کی مثل کو ہاتھ لگانے سے گریز کیا ایک صاحب نے تو صاف معذرت کر لی۔ اور دوسروں نے لیت و لعل سے کام لیا۔ اس تاریک ماحول میں روشنی کی صرف ایک کرن مولانا ابو الکلام آزاد کی ذات میں نظر آتی ہے جنھوں نے خود نظر بند ہونے کے باوجود، کلکتے سے ایک بیرسٹر کا انتظام کیا اور فیس وغیرہ خود ادا کی، جس نے جھانسی جا کر حسرت کے مقدمے کی پیروی کی۔

مولانا عبد الباری کے نام بیگم حسرت کے طویل خطوط

کے اقتباسات اور قید تاریخ اس طرح پیش کیے جارہے ہیں، جس سے اہم واقعات کا اجمالی نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

آخر میں حسرت کی تیسری اور آخری قید و بند سے متعلق بھی چند خطوط کے اقتباسات ضمناً درج کیے گئے ہیں۔

(ع۔ ص)

(۱)

۱۴ اپریل ۱۶ء

... میں نہایت رنج کے ساتھ عرض کرتی ہوں کہ کل دوپہر کو یکایک پولیس نے حسرت کو گرفتار کرکے جیل میں بھیج دیا۔ بعد کو مکان و دکان کی تلاشی ہوئی۔ لیکن اللہ کے فضل سے کچھ نکلا ہی نہیں، کیا نکلتا۔ پھر بھی وہ بہت سے ردی خطوط، مکان سے دوکان سے، اسی قسم کے تجارتی کاغذات کچھ معمولی تصویریں محمد علی کی آزادی، انور پاشا کی، میرے پاس تصویریں بہت تھیں [وہ بھی لے گئے]

اب یہ نہیں معلوم کہ گرفتاری کس وجہ سے ہوئی۔ آیا نظربند ہیں، یا کوئی خدانخواستہ مقدمہ ہوگا یا کیا، کچھ نہیں معلوم طبیعت حد درجہ پریشان [ہے] خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ دوکان کی [جو] مالی حالت ہے وہ ظاہر ہے۔

افواہیں طرح طرح کی سننے میں آتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ لکھنؤ کے جلسے میں ڈاکٹر ضیاء الدین کی شرارت ہے انھوں نے گرفتار کرا دیا۔ کوئی کچھ کوئی کچھ۔ بہرحال دیکھیے خدا کیا دکھاتا ہے۔ ... میں روز حسرت سے جیل میں ملنے جاتی ہوں کچھ دیر تک مختلف بات چیت کرکے واپس آتی ہوں۔

(۲)

۱۹ اپریل ۱۶ء از علی گڑھ

آج میں حسب معمول صبح کو حسرت سے ملنے گئی وہاں معلوم ہوا کہ وہ سات بجے صبح کو کہیں باہر خفیہ طور پر بھیج دیئے گئے ابھی نہیں بتایا جائے گا کل بتایا جائے گا۔

(۳)

۲۲ اپریل

سات روز تک وہ جیل میں رکھے گئے ۱۹ کو حسب معمول صبح کو میں ملنے گئی معلوم ہوا کہ وہ کہیں موٹر میں بیٹھ کے گئے ـــــ بہت پوچھا، سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا، کسی نے نہ بتایا کہاں گئے۔ دوسرے روز کلکٹر سے دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہ للت پور بھیج دیے گئے۔ اب وہیں رکھے جائیں گے۔ میں نے خط وغیرہ کے لیے پوچھا کہا، ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ دیکھیے کیا ہونا ہے۔

(۴)

۲۳ اپریل

حسرت کو کیا کرنا چاہیے۔ للت پور میں بے جرم، بے خطا رہنا چاہیے یا خدانخواستہ جیل میں زندگی گذارنا چاہیے۔ بہرحال پریشانی ہے اور رہیں ہوں، خدا پر بھروسہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ دعا فرمایئے حسرت کو اس بلائے بے درماں سے نجات ملے۔ خیریت سے گھر آئیں۔ آمین۔

(۵)

۲۵ اپریل ۱۶ء از علی گڑھ

تسلیم فدویانہ قبول کیجیے۔ معین الحسن حسرت کے پاس سے شب کو آئے۔ حسرت کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ کل سے سلسلہ وار سورۃ انفال کی آیتوں پر عمل ہے۔

والدہ نعیمہ

(۶)

۲۷ اپریل، از علی گڑھ

آج حسرت کا بھی خط آیا۔ لکھا ہے کہ حکم آیا کہ ان کو قید سے آزاد کر دیا، چناں چہ میں شہر میں ہوں اور درخواست دی ہے کہ مزید غور کرنے کے لیے اگر گورنمنٹ مجھ کو مہلت دے تو اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ مجھ کو وہ لکھنؤ یا الہ آباد دو ایک روز کے لیے بھیج دے۔ میں وہاں اپنے دوستوں اور قانونی مشیروں کی رائے حاصل کرسکوں اگر یہ درخواست منظور ہوگئی تو شاید کوئی صورت فیصلے کی نکل آئے۔ اگر منظور نہیں ہوگی تو یقیناً پھر مقدمہ حکم عدولی چلایا جائے گا۔ جب تک میں یہاں کے مجسٹریٹ کی رعایت سے آزاد رہوں گا اگر موافق جواب نہ آئے گا تو انکار تو کر ہی چکا ہوں

کل محمد علی صاحب کا بھی خط آیا۔ اور لوگوں کی بھی یہی رائے ہے۔ حضرت خدا کرے راضی ہوجائیں ورنہ مصیبت تو ہے۔

(۷)

[۲۷ اپریل کے حسرت کے خط کا خلاصہ]

بغیر اظہار جرم و موقع تردید کسی کو سزا دینا صریحاً ظلم ہے۔ اس لیے ایسے حکم کا بغیر چون و چرا منظور کر لینا بجائے خود ایک گناہ ہے جس کے ارتکاب کی مذہب اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس سے ظلم کو قوت پہونچتی ہے۔ میں نے اسی بنا پر اس حکم کے ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اب گورنمنٹ کیا کرے گی اس کا حال کل پرسوں تک معلوم ہوجائیگا

حسرت اپنے دھن کے پکے اور استقلال کے مضبوط ہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے۔ اسی پر بھروسہ ہے۔ خدا حسرت کی ہمت اور حوصلے کو بلند کرے اور جلد کامیاب کرے آمین۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اگر خدانہ کرے قید ہوئے تو مجھے بھی صبر کرنا چاہیے اور خدا سے دعا کرنا چاہیے کہ مجھے اتنی ہمت، اپنی قدرت کاملہ سے عطا کرے کہ کسی صورت سے میں بھی ظالموں سے، حسرت کے ساتھ بے جا ظلم کرنے کا انتقام لے سکوں۔ چاہے مجھے بھی قید پھانسی کیوں نہ ہوجائے۔ خدا سے دعا کروں گی کہ ان کافروں کو تباہ، برباد، فنا کر دے۔

(۸)

۲۹ اپریل ۱۶ء

کل حسرت کے دو خط اور آئے۔ ...

لکھا ہے کہ... "تم نے لکھا کہ نظربندی کو قبول کرلینا

چاہیے۔ بظاہر یہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں نے قرآن مجید سے ہدایت طلب کی تو اتفاق سے سورۂ انفال کی تلاوت کا سب سے پہلے اتفاق ہوا۔ اس سورۃ کے پڑھنے کے بعد میرا دل مضبوط ہو گیا اور میں نے عہد کر لیا کہ ظلم کے سامنے کبھی عاجزی سے سر نہ جھکاؤں گا کیونکہ ایسا کرنا گویا ظلم کی تائید کرنا ہے... گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ انشاء اللہ آخر میں ہم کو کامیابی نصیب ہوگی۔

اب اپنے معاملے کے نسبت معلوم کرو کہ میں مرکز ہرگز گورنمنٹ کے حکم کو تسلیم نہ کروں گا مقدمہ ہونے دو۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں خوب خوب جواب دوں گا۔ اس کے بعد اگر قید ہی ہونا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اُفوّضُ امری الی اللہ واللہ علیٰ کل شیٍٔ قدیر۔ میں نے چونکہ حکم سے انکار علی گڑھ ہی میں کر دیا تھا اس لیے مقدمہ غالباً وہیں ہوگا۔ دو چار روز میں اس کے متعلق جواب آجائے گا اس وقت حال معلوم ہوگا۔

میں نے ایک غزل راہ میں لکھی تھی۔ اس کی نقل تم کو بھی بھیجتا ہوں: ؎

سر یہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو
دانش جنت ہے بے دانشی شوق کا نام
لوگ دیوانہ نہ سمجھیں ترے دیوانے کو
بھول جاؤں میں انھیں ہو نہیں سکتا ناصح
"آگ لگ جائیو" ظالم ترے سمجھانے کو
دیکھ لیں شمع کو تاثیر وفا کے منکر
جل بجھی خود بھی، جلایا تھا جو پروانے کو
برق کا قول مجھے یاد ہے اب تک حسرت
زندگی کہتے ہیں دنیا سے گزر جانے کو

(۹)

۴ مئی ۱۹۱۶ء از علی گڑھ

حسرت کے پاس سے پرسوں خط آیا تھا [ابوالکلام کو] لکھا ہے کہ [مولانا عبدالباری و مولانا ابوالکلام کے خطوط پہنچے لیکن افسوس ہے کہ یہ مشورہ دونوں صاحبوں کا غلط ہے۔ کیونکہ قرآن صاف کہتا ہے (آل عمران پارہ ۴) فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ۔

تازہ غزل حسرت موہانی نوشتہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۶ء مقام للت پور)

ڈرے کیا قہر دشمن سے بھلا دل
قوی ہے وعدۂ حق سے مرا دل
سہارا کیا نہیں کافی تمہارا
نہ ڈھونڈے اب کسی کا آسرا دل
لگا دو آگ غدر مصلحت کو
کہ ہے بیزار اس شے سے مرا دل
لڑا کر آنکھ اس جان جہاں سے
نہ ہوگا اب کسی سے آشنا دل
نہ انکار تو نادانوں سے نبھڑا ہے
ترے غم کو نہ کیوں کر دے دعا دل
ترے دور محبت کی بدولت
ہوا ہے منزل صدق و صفا دل
بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی امید ہے میری، بڑا دل

ولہ

قوی دل، شادماں دل، باصفا دل
ترے عاشق نے بھی پایا ہے کیا دل
جفا کاری ہے تسلیم ستم بھی
نہ ہوگا تابع جور و جفا دل
غلط ہے قول عقل مصلحت کوش
نہ اس جانب کرے گا اعتنا دل
نہ مانوں گا نصیحت میں کسی کی
کہ ناصح سب سے بہتر ہے میرا دل
توانائے صداقت ہے تو حسرت
نہ ہوگا پیروِ باطل ترا دل

حسرت ابھی اسی حالت سے ہیں۔ گورنمنٹ کے دیے ہوئے مکان میں رہنے سے انکار کر دیا ہے۔ دن کو کسی اور مکان میں اور شب کو جیل میں سوتے ہیں۔ دیکھیے کیا حکم آتا ہے۔؟

(۱۰)

۵ مئی ۱۹۱۶ء

حسرت کا کل خط آیا لکھا تھا کہ ایک حکم اور آیا نظربندی کے متعلق کہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا۔ مگر اس حکم کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے وظائف سرکاری مد خیرات سے دیے جاتے ہیں۔ محمد علی صاحب و شوکت علی صاحب کو جو وظیفہ ملتا ہے وہ بھی اسی مد سے ملتا ہے انھوں نے اسے منظور کر لیا۔ کیونکہ وہ منظور کرسکتے تھے مگر میں نہیں کر سکتا تھا کیونکہ سادات کے لیے مد خیرات یا مد زکوٰۃ سے قبول کرنا حرام ہے چنانچہ میں نے اسی حکم پر یہی لکھ کر واپس کر دیا کہ قواعد مذہبی کی رو سے میں کسی قسم کا وظیفہ نہیں لے سکتا۔

آج بھی خط آیا۔ لکھا ہے کہ میں نے اپنے خرچ سے ایک تار بھی دیا اور دو درخواستیں بھیجیں کسی کا اب تک جواب نہیں آیا آج یعنی ۵ مئی کو میں نے مجسٹریٹ للت پور کو لکھا ہے کہ کل شام تک یعنی ۶ مئی تک مجھے جواب تار کے ذریعہ منگوا دیجیے۔ ورنہ میں شام تک للت پور سے چلا جاؤں گا چنانچہ حدود [للت پور] کے باہر وہ شاید مجسٹریٹ کے حکم سے گرفتار کر لیے جائیں اور غالباً مقدمہ چلایا جائے، یا دیکھیے کیا ہو۔ وہاں خدا خواستہ ہیضہ ہے اس لیے اور بھی طبیعت پریشان ہے خدا اپنی حفاظت میں رکھے۔

(۱۱)

۳ مئی ۱۹۱۶ء از علی گڑھ دفتر اردو

اخبارات سے نیز لکھنؤ ۱۸ شعبان کے "ہمدم" سے حسرت کے واقعات رہائی سے اطلاع ہو گئی۔ جیل سے رہائی پر نظربندی کا حکم تو نہیں دیا گیا لیکن چونکہ کچھ شرطیں ابھی اور باقی تھیں اس لیے ان کے فیصلے تک حسرت علی گڑھ نہ آئیں گے ضلع میرٹھ ہی میں رہیں گے۔ مگر اپنی

نوٹس سے۔ الحمدللہ کہ اب تک تو حسرت کی مرضی کے مطابق کارروائی۔ یعنی ۱۲ کو جو تار حسرت کی طرف سے گورنمنٹ کو دیا گیا تھا کہ اگر نظر بندی کا نوٹس حسرت کو دیا گیا تو پھر اس [کو قبول کرنے] سے انکار کریں گے اس لیے بہتر ہے کہ نہ دیا جائے وغیرہ وغیرہ چنانچہ گورنمنٹ نے حسرت کو جواب دیا کہ "نوٹس نظر بندی منسوخ کر دیا گیا" اب دوسرا مرحلہ علی گڑھ آنے کا باقی ہے۔ دیکھیے میموریل وغیرہ بھیجنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ اب جو مرضی خدا کی ہو اگر علی گڑھ نہ بھیجا تو وہی پہلی کی سی صورت پھر قائم [رہے گی] یعنی مقدمہ ہوگا اور اس کا نتیجہ پھر کیا ہو خدا کو معلوم۔ مجھے میموریل وغیرہ کا انتظام تار وغیرہ بھجوانا اور پھر شبرات کے سبب جلد مکان واپس ہونا تھا اس لیے صرف حسرت کے پاس کٹھور جو میرٹھ سے ۱۸ میل دور ہے صرف ۲۲ مئی کو دن بھر اور رات بھر رہ کر ۲۳ کی صبح کو واپس ہوگئی حسرت کمزور بے حد ہو گئے ہیں اب ان کا وزن ۱۱۲ پونڈ رہ گیا ہو۔ شروع میں ۱۵۵ پونڈ تھا اللہ تعالٰے رحم فرمائے۔

(۱۱)

۵ جون ۱۶ء از علی گڑھ

خواجہ مجید صاحب نے ایک مدت سے بہ امید رکھ کر کل میرے دریافت کرنے پر صاف جواب دے دیا کہ "مناسب یہی ہے کہ آپ مجھ سے کوئی خدمت نہ لیں۔"

(۱۲)

۲۳ فروری ۱۸ء از علی گڑھ دفتر اردوئے معلّٰی

حسرت کا جیل میرٹھ سے آج حسب ذیل [خط] آیا:

آج ۱۱ بجے دن کے قریب سپرنٹنڈنٹ پولیس میرٹھ ایک اور انگریز کے ساتھ آئے اور کہا کہ گورنمنٹ تم کو رہا کرنا چاہتی ہے مگر اس شرط پر کہ مقام کٹھور ضلع میرٹھ کے کسی بنگلے میں جو لب سڑک ہے۔ نظر بندی کے جملہ قیود کے ساتھ رہنا منظور کرو۔ ان قیود کی ایک نقل بھی مجھ کو دی گاڑی بھی ہمراہ لائے تھے کہ اگر میں چاہوں تو اس پر کٹھور چلا جاؤں۔ مگر میں نے اس کو منظور نہ کیا۔ اور انگریزی میں ایک تحریر لکھ کر واپس کر دی جس کی نقل بغرض اطلاع روانہ کرتا ہوں میری یہ تحریر غالباً گورنمنٹ کے پاس روانہ کی جائے گی۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ بظاہر کچھ امید نہیں معلوم ہوتی بلکہ اندیشہ ہے کہ کہیں دوبارہ عدول حکمی کا مقدمہ نہ قائم کیا جائے خیر جو کچھ ہو۔ میں تو اب اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ تم بھی صبر کرو (اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللہ اِنَّ اللہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَاد)

مولوی عبدالباری صاحب قبلہ کو خط لکھنا تو میرا اسلام اور سب حال لکھ دینا اور لکھ دینا کہ میں نے اس موقع پر طرز عمل اختیار کیا ہے اس میں میری خودرائی یا ضد کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ بلکہ بقول حافظ رح ؎

بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم
کہ من دل شدہ ایں رہ نہ ز خود می گویم

انگریزی تحریر کی نقل یہ ہے۔

میں اب بھی اپنے ۱۶ء کے اعلان پر ثابت قدم ہوں۔ اور میرا ضمیر اب بھی مجھے قانون تحفظ ہند کے کسی حکم کی پابندی کی اجازت نہیں دیتا در آں حالیکہ وہ مجھے کسی نامعلوم اور نامحدود جرم کے لیے سزا دینے کا جویاں ہے جس کی بابت مجھے یقین ہے کہ میں نے نہیں کیا۔ اور یہ کہ وہ مجھ کو حفاظت اور بریت کی کوشش کا بھی موقع نہیں دیتا۔ بہر حال میں یہ کہنا پسند کروں گا کہ اگر میری رہائی بغیر کسی شرط کے ہوگی تو میں جو کچھ گورنمنٹ مجھ سے کرانا چاہے یا محض افسروں کے وہمی شکوک کو رفع کرنے کے لیے نہ کرنا چاہے میں بخوشی تیار ہوں۔

سید افضل الحسن حسرت
۲۰ فروری ۱۸ء ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ

دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ آج ایڈیٹر ہندوستانی [کشن پرشاد] کول کا خط آیا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب نے مسٹن سے مل کر خاص طور پر حسرت کی رہائی کا ذکر کیا جس پر مسٹن نے وعدہ کیا کہ اب بقید قید مولینا کی مسترد کر دی جائے گی اور علی گڑھ میں رہنے کی اجازت دے دی جائے گی اگرچہ نگرانی رہے گی اور مکان بھی علی گڑھ میں رہنے کے لیے تجویز ہو رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر واقعات موجودہ تو اس کے خلاف ثابت ہو رہے ہیں۔

(۱۳)

۲۱ جون ۱۹۱۶ء از علی گڑھ دفتر اردوئے معلّٰی

آج حسرت کا جھانسی سے خط آیا... کہ اپیل حسرت نے خود ہی بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل دائر کر دی پہلی جولائی کو پیشی مقرر ہے۔ خاموش نہیں رہا جاتا چونکہ فطرت انسانی انقلاب پسند واقع ہوئی ہے اس لیے کوشش کچھ نہ کچھ ہوتی ہی رہے گی۔ باقی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ تو ہی ہے۔ جو اس کی مرضی ہوگی وہ ہو کے ہی رہے گا۔

(۱۴)

۲۴ جون ۱۹۱۶ء از علی گڑھ دفتر اردوئے معلّٰی

آج حسرت کا خط جیل سے آیا لکھا ہے کہ میں نے اس کی بھی درخواست دی تھی کہ عدالت میں خود پیروی کر سکوں تاکہ میرے وکیل کو مجھ سے مدد پہنچے وغیرہ۔ یہ درخواست منظور ہو گئی۔ اب اگر ظہور احمد صاحب بیرسٹر الہ آباد چلے جائیں گے تو اچھا ہے۔ زادرہ بھیج دیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے وعدہ کیا تھا پیشی میں جانے کا۔ ورنہ وہ [حسرت] خود پیروی مقدمہ کریں گے۔ ممکن ہے کوئی وکیل جھانسی کا بھی ہو جائے۔

میں نے ایک تار ابوالکلام کو دیا تھا

انھوں نے کلکتہ سے کسی بیرسٹر کو ستو روپے فیس وغیرہ کے دے کر جھانسی بھیج دیا ہے۔ اگر پہلی جولائی تک وہ بیرسٹر وہاں مقیم رہ کر پیروی مقدمہ کرے تو اچھا ہے (ویسے) میں نے (محض) احتیاطاً ردولی شریف سے سید افضال حسین صاحب کو جھانسی حسرت کے پاس بھیج دیا تھا ۱۵ جون کو۔ تاکہ ۲۳ جون تک وہاں اپیل دائر کرنے کا کوئی انتظام کریں۔ چنانچہ ان سے غالباً حسرت کو کچھ مدد ملے گی۔ باقی اللہ مددگار ہے۔

(۱۵)

۲۷ جون ۱۹۱۶ء از علی گڑھ

دفتر اردوئے معلیٰ۔

دوستوں کو حسرت سے شکایت ناحق ہے وہ غریب تو اب جیل میں ہیں۔ کسی کچھ کہتے سنتے نہیں جس کا کوئی پرسان حال نہیں ہونا اس کا ... گار اللہ تعالے تو ہونا ہی ہے۔ چنانچہ میری ... کوشش کی یا نہ کی خدا کے فضل و کرم سے حسرت کی اپیل بغیر کسی وکیل، بیرسٹر کے منظور ہو گئی اور پیشی پہلی جولائی کو مقرر ہے اگر کوئی پیشی کے دن گیا تو گیا ورنہ جہاں اب تک خود ہی کیا کرایا ہے یہ مرحلہ بھی طے کریں گے خواہ نتیجہ کچھ ہی ہو۔

(۱۶)

۱۶ء از علی گڑھ دفتر اردوئے معلیٰ

کل حسرت کا جیل سے خط آیا۔ وہ اپنے حال میں خوش ہیں۔

(۱۷)

۲۶ نومبر ۱۶ء از علی گڑھ

میں پھر دوبارہ ۷ نومبر کو آگرہ گئی اور میموریل روانہ کرایا اور ۷ محرم کو دفعتاً جیل الہ آباد میں جیلر نے حسرت کے ساتھ خلاف قاعدہ سختیاں کیں۔ یعنے ان کا سامان ضروری، لوٹا، جوتا، وغیرہ وغیرہ لے لیا گیا۔ قواعد جیل بھی حسرت نے دیکھا ہے جس کی رو سے جھانسی جیل میں اور اب تک الہ آباد میں ان چیزوں کے رکھنے کے مجاز تھے

مگر جیلر نے صاف کہہ دیا کہ میں سختی کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ شاید خفیہ پولیس رپورٹ کردے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے قیدی کے ساتھ رعایت کی تو میری نوکری جاتی رہے گی۔ حالانکہ اس نے کوئی رعایت بہ جز سختی کے نہ کی تھی کھانا بھی وہی جوار، باجرہ مٹی ملی ہوئی ترکاری جو درد گردہ کی وجہ سے حسرت کے لیے سخت مضر ہے چنانچہ حسرت نے بھی عہد کر لیا کہ ۷ محرم سے جھگڑا شروع ہوا ہے اگر جیلر یزیدی پر آمادہ ہے تو میں بھی الحمدللہ پیروی حسین کے لیے اچھی طرح تیار ہوں، نتیجہ خواہ کچھ ہو۔ اور روزہ رکھنا شروع کیا برائے نام روزہ صحیح ہونے کے خیال سے پانی پیتے رہے۔ پانچ روز تک ۱۱ محرم تک مطلق کچھ نہ کھایا۔ یہ واقعات مجھے ایک الہ آبادی صاحب سے معلوم ہوئے تھے۔

(۱۸)

۱۸ مئی ۱۷ء ۲۶ رجب ۱۳۳۵ھ

از علی گڑھ دفتر اردوئے معلیٰ

حسرت بدستور جیل فیض آباد میں ہیں۔ مگر صحت کی خرابی کا سلسلہ نہیں دور ہونا میں نے دہلی سے حکیم اجمل صاحب سے دوائی بھی بھجوائی جس کا استعمال کرتے ہیں مگر پیٹ کی خرابی کی شکایتیں نہیں دور ہوتیں حالانکہ روزے بھی برابر اب تک رکھے جاتے ہیں میں نے کئی بار لکھا بھی کہ اب اس عہد کو ترک کر دو۔ گرمیاں ہیں طبیعت اچھی نہیں۔ جواب یہ لکھا کہ تم میرے روزے کا حال وغیرہ نہ لکھا کرو اور جس کو لکھا ہے ان کو بھی لکھ دو کہ کسی اور سے تذکرہ نہ کریں۔

تسخیر بغداد کا ماتم نہایت جگر سوز ہے۔ دیکھیے کب اس انقلاب کا دور کر کے [خدا] ہمارے مایوس دلوں کو شادمانی سے پر کرتا ہے۔

(۱۹)

۱۲ جون ۱۶ء از علی گڑھ، دفتر تذکرۃ الشعرار

آج الہ آباد سے ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے نقل کو مع اپنے بتائے ہوئے وجوہات اپیل مجھے واپس کر دیے کہ آپ جلد کسی عزیز کو بھیج کر اپیل دائر کرا دیجیے۔ اب میں سخت پریشان ہوں کہ کیا کروں۔ الہ آباد میں ظہور احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے روح الحسن بھائی سے پختہ وعدہ کیا تھا کہ پیروی کرونگا۔ ان کو بھی میں نے روزانہ خط لکھے کوئی جواب نہیں آیا۔ مجبوراً آج ناصر الحسن اپنے چھوٹے بھائی کو جو دوکان میں رہتے ہیں الہ آباد ظہور احمد کے پاس مع نقل وغیرہ بھیجا ہے۔ اگر وہ چلے گئے تو اچھا ہے۔

(۲۰)

۱۵ جون ۱۶ء پنج شنبہ از علی گڑھ

آج صبح ناصر الحسن الہ آباد سے واپس آئے ظہور احمد بیرسٹر نے نقل تحریر مع وجوہات اپیل حسرت کے پاس ڈسٹرکٹ جیل جھانسی بھیج دی ہے کہ وہ وہاں اپیل دائر کرا دیں۔ اب حسرت غریب وہاں کیا کر سکتے ہیں ڈاکٹر [ ] اور بیرسٹروں کی رائے ہے کہ اپیل میں فیصلہ کلکٹر جھانسی کا منسوخ ہوگا اور پھر سے تحقیقات ہوگی آزادی ہوگی۔ غنیمت تھا مگر افسوس ہے کہ کوئی وکیل، بیرسٹر جھانسی تک جانے کے لیے تیار نہیں ... کیسی مجبوری اور افسوس کا مقام ہے۔

دیکھیے حسرت اب کیا کرتے ہیں وہاں ڈاکٹر صاحب نے بھی جواب دے دیا کہ مجبور ہوں حالانکہ انھوں نے پہلے وعدہ کیا تھا۔ خیر خواجہ مجید صاحب کا کوئی ہرج نہ تھا اگر اپیل دائر کرانے کے لیے جھانسی ... خیر کوئی ہماری مصیبت ... نہ شریک ہو اللہ کی مرضی کچھ ایسی ہی ہے دو سال قید برداشت کریں گے کیا کیا جائے

(۲۱)

۴ جون ۱۶ء از علی گڑھ

کل جیل سے حسرت کا خط آیا۔

(بقیہ ص ۸۵ پر)

نئی کتابیں

حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری

مؤلف اثر بن یحییٰ انصاری
تقطیع $\frac{18 \times 22}{8}$ ، صفحات ۳۰۰
قیمت (مجلد) ۲۰ روپے
ناشر: عالیہ پبلی کیشنز، بیت الاخر، مولانا آزاد روڈ، دھولیہ (مہاراشٹر)۔

حسرت موہانی نے سیاست کے علاوہ شعر و ادب کے میدانوں میں بھی اپنے واضح نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کے شاعرانہ مرتبے اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کے موضوع پر مضامین کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ بات ان کی سیاسی زندگی کے باب میں نہیں کہی جا سکتی، جسے مستقل کتاب کا موضوع اب تک نہیں بنایا گیا ہے۔

آج سے ۶۴ یا ۶۵ سال قبل پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے دوران میں بیشتر مسلمان رہنماؤں کی طرح حسرت کو بھی قید و بند کی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔ ان کی رہائی سے سال ڈیڑھ سال پہلے غالباً ۱۹۱۸ء میں مرکزی انجمن اعانت نظربندان اسلام (دہلی) کی تحریک پر عارف ہسوی نے ایک مختصر سی کتاب 'حیاتِ حسرت' کے نام سے لکھی تھی۔ متذکرہ انجمن ہی اس کی ناشر بھی تھی۔ بعد میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شایع ہوا اور پھر حسرت نے اسے بالاقساط اُردوئے معلّٰی میں بھی چھاپا۔ حسرت پر لکھی جانے والی یہی پہلی کتاب تھی، جو اب نایاب ہونے کی حد تک کم یاب ہے۔ تبصرہ نگار کی نظر سے بھی اس کے اقتباسات ہی گذرے ہیں۔

حسرت کی زندگی کے آخری زمانے میں پرنسپل عبدالشکور نے 'حسرت موہانی' کے عنوان سے ایک مختصر سی کتاب لکھی، جو خاصی مقبول ہوئی۔ راقم نے اس کا چوتھا اڈیشن دیکھا ہے جو حسرت کی وفات کے دوسرے سال ۵۳ء کے اواخر یا ۱۹۵۴ء کے اوائل میں چھپا تھا۔ دوسرے کتابچوں اور مضامین کی طرح اس میں بھی حسرت کی سیاسی زندگی کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد ہماری یونیورسٹیوں کے شعبہ اُردو میں جس کثرت سے ڈاکٹریٹ کے مقالے لکھے گئے ہیں اس کے پیشِ نظر یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ حسرت کو بھی ایک سے زیادہ یونیورسٹیوں میں موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہو۔ لیکن جہاں تک راقم کا علم ہے اب تک ایک ہی تحقیقی مقالہ چھپ کر سامنے آیا۔ یہ ڈاکٹر احمد لاری کا تھیسس ہے، جس میں حسرت کی زندگی کے اور پہلوؤں کے علاوہ ان کی سیاسی زندگی کے بارے میں بھی سیر حاصل معلومات فراہم کی گئی ہے۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ حسرت کی سیاسی زندگی پر جتنا مواد اس مقالے میں یکجا کر دیا گیا ہے، وہ کسی اور جگہ نہیں ملتا۔

اثر بن یحییٰ انصاری کی زیرِ تبصرہ کتاب 'حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری' جب بازار میں آئی تو اس نے ہر اُس شخص کو اپنی طرف متوجہ کیا جسے حسرت کی سیاسی زندگی سے، یا ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں حسرت کے رول سے دلچسپی ہے۔ لیکن کتاب کے نام کو دیکھ کر اس کے داخلی مواد کے متعلق جو توقعات پیدا ہوتی ہیں، ان کی آسودگی کا اس میں بہت کم سر و سامان ہے۔ مثلاً کتاب کے نام سے گمان ہوتا ہے کہ اس کے اندراجات حسرت کی ان ڈائریوں پر مبنی ہوں گے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کراچی اور دہلی کے دو اصحاب کے قبضے میں ہیں۔ یا مؤلف نے حسرت کی سیاسی زندگی کے واقعات بقید تاریخ قلم بند کیے ہوں گے۔ لیکن کتاب میں یہ دونوں صورتیں ناپید ہیں۔

اس کتاب کا کینوس اس سے کہیں زیادہ وسیع و عریض ہے، جتنا اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ حقیقتاً یہ حسرت کی نہیں بلکہ ہندوستان کے جدوجہد آزادی کے ایک دَور کی ڈائری ہے، جس میں حسرت کا نام بھی کہیں کہیں برسبیل تذکرہ آگیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مؤلف نے اس کا نام 'حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری' رکھ کر کتاب کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

کتاب میں حسن عباس فطرت کی 'تقریظ' بھی شامل کی گئی ہے۔ کتاب کے نام اور اس کے داخلی مواد میں جو بُعد ہے۔ تقریظ نگار نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ اثر بن یحییٰ انصاری نے "حسرت موہانی کو مرکز جان کر ایک ایسا دائرہ کھینچا ہے، جس میں ۱۸۷۵ء[1] سے ۱۹۴۷ء تک کا متلاطم دَور آ جاتا ہے۔" اسی ضمن میں انھوں نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ "شاید کہیں کہیں قاری کو اس کتاب میں بے ربطی کا جھٹکا بھی لگے۔ اس لیے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کتاب [حسرت یا] آزادیٔ ہند کی سوانح حیات بھی نہیں ہے۔ مؤلف نے انھیں واقعات کو لیا ہے جو قوم کی تشکیل نو میں اہمیت رکھتے ہیں۔" (ص ۷)۔

تاریخ کی کتابوں میں واقعات کی، نیز تاریخوں کی، غلطیوں کا در آنا بڑی حد تک ناگزیر سا ہے۔ حسرت موہانی — ایک سیاسی ڈائری بھی اس کلیے سے مستثنا نہیں ہے۔ تاہم اس کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی کہ کتاب دلچسپ ہے اور مؤلف نے واقعات کی تلاش میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ اور کاغذ بھی نفیس استعمال کیا گیا ہے۔ حسرت کی ایک دیدہ زیب سی تصویر بھی کتاب کی زینت ہے۔

(عتیق صدیقی)

---

[1] ۱۸۷۵ء کی تخصیص یہ ہے کہ مؤلف کی تحقیق کے مطابق حسرت کا سال پیدائش "۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۵ھ" ہے۔

اتر پردیش اُردو اکادمی کی طرف سے

ترقی اُردو بیورو کی انعام یافتہ کتابیں

1- کلیاتِ ذوق

مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی

مرتب نے ہر ممکن تحقیق کے ساتھ اس میں ذوق کے مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل تمام تر کلام کو یکجا کر دیا ہے۔

ڈیمائی سائز ــــ صفحات ــــ 496

قیمت: 20.50 روپے۔

2- کتاب کی تاریخ

شایاں قدوائی

ابتدائی تحریر سے لے کر آج تک کتاب کی بنیادی کے تکنیکی ارتقار کی دلچسپ داستان کے علاوہ جدید ہندوستان میں کتابوں کی صنعت اور ان کی عالمی تنظیم سے متعلق معلومات اِس کتاب میں فراہم کی گئی ہیں۔

ڈیمائی سائز ــــ صفحات ــــ 280

قیمت: 13.50 روپے۔

3- دانتے

زیڈ اے عثمانی

مشہورِ عالم اطالوی شاعر کے سوانح حیات و پس منظر اور تصنیفات پر بحث کرتے ہوئے اطالوی ادب کے ماہر پروفیسر عثمانی نے دانتے کی آفاقیت اور ہمہ گیری کے اسباب بیان کیے ہیں۔ ہر لائبریری میں اور ادب کے ہر طالب علم کے پاس اِس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز ــــ صفحات ــــ 192

قیمت: 8.50 روپے۔

4- ہندوستانی گاؤں

مصنف: شیاما چرن دوبے

مترجم: عبدالقادر عادی

ملک کے مختلف حصّوں کے دیہی عوام کے سماجی، معاشی، رہن سہن اور سیاسی زندگی کے ڈھانچے نیز اُن کے مسائل کے ذریعے ہمارے تمدن کے مختلف نمونوں اور اُن کی تنظیم کے نسبتاً غیر معروف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ڈیمائی سائز ــــ صفحات ــــ 256

قیمت: 12.30 روپے۔

5- نورتن کہانیاں

شمیم احمد

اِس کتاب میں دبستانِ لکھنؤ کے اولین نثری اسلوب کی کہانیوں کو بچوں کے لیے آسان اور عام فہم زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔

ڈیمائی سائز ــــ صفحات ــــ 192

قیمت 6.50 روپے۔

دو تازہ کتابیں

درسِ بلاغت

شائقینِ ادب اور بی۔ اے کے طلبا کے لیے علومِ بلاغت پر اس جامع کتاب میں بلاغت کی نوعیت، علم بیان، علم بدیع، صنائع معنوی و لفظی، عروض، اصولی مباحث اور تقطیع کے طریقوں، بحور، قافیہ، اقسامِ نظم و نثر اور موجودہ عہد میں اِن علوم کی اہمیت اور معنویت واضح کی گئی ہے۔ ڈیمائی سائز ــــ صفحات ــــ 192

قیمت: -/7 روپے۔

وضع اصطلاحات

سیّد وحید الدین سلیم

ایک عرصہ کے بعد اس اہم اور بنیادی کتاب کی تجدیدی اشاعت ایک نہایت اہم ضرورت کو پورا کرتی، اصطلاح سازی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اِس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کتاب کا متن 1921ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے ــــ ڈیمائی سائز صفحات ــــ 318 ــــ قیمت ــــ 12.80 روپے۔

6- تعلیم ہندوستان کے مُسلم عہدِ حکومت میں ــــ ایس ایم جعفر

مترجم: سعید انصاری

پندرہ ابواب پر مشتمل اِس کتاب میں مصنف نے ہندوستان میں مُسلم عہدِ تاریخ کے دوران نظامِ تعلیم اور تعلیمی سرگرمیوں کے اہم ثقافتی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ سعید انصاری نے اِس کا ترجمہ آسان سلیس اور رواں اردو میں کیا ہے۔ ڈیمائی سائز ــــ صفحات ــــ 176 ــــ قیمت: 8.25 روپے

7- تیمارداری

حسین فاروقی

نرسنگ یا تیمارداری کی ضرورت اسپتالوں کے علاوہ گھروں میں بھی ہوتی ہے۔ مریض کی بہتر طور پر دیکھ بھال اُس کے جلد صحتیاب ہونے میں معاون ہوتی ہے 27 ابواب پر مشتمل فنِ تیمارداری پر یہ کتاب ہر گھر میں ہونی ضروری ہے۔ کتاب کے آخر میں سادہ اور آسان زبان میں طبی اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے۔

ڈیمائی سائز۔ صفحات: 256 ــ

قیمت 12.30 روپے

8- بھارت کی لوک کتھائیں

محمد قاسم صدیقی

لوک کتھائیں انسانیت کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں مگر امتدادِ زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان میں نئی معنویت کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ آج بھی ان کی دلکشی میں کمی نہیں آئی۔ بچوں کے لیے دلچسپ تحفہ۔

ڈیمائی سائز۔ صفحات ــ 232 قیمت: 12.30 روپے

نوٹ:۔ ہمارا سرکاری رسالہ ... کتابوں اور دیگر معلومات کے لیے لکھیں۔

شعبۂ فروخت و نمائش، ترقی اُردو بیورو، وزارتِ تعلیم و ثقافت، حکومتِ ہند، ویسٹ بلاک 8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110022

davp 81/57

شاہد میر



نام شاہد میر۔ ولادت ۱۰ر فروری ۱۹۴۹ء کو سرونج میں ہوئی۔ بانسواڑہ گورنمنٹ کالج میں شعبۂ نباتیات کے صدر ہیں۔ ایک شعری مجموعہ "سورج سے دوروں تک" زیرِ ترتیب ہے۔

ایک عرصہ ہو گیا تھا اندر کے سفر، باہر کے سفر، پانیوں کے سفر، اندھیرے کے سفر کے بارے میں پڑھتے پڑھتے لیکن جب بھی اس خوسفر شاعر کا کلام پڑھا تو ماسوائے شعریت وہاں ہر چیز موجود پائی۔

اس سے بھی بہت پہلے شاعر کے کلام میں شعری محاسن کم اور سماجی شعور کی تلاش زیادہ کی جاتی تھی۔ بیچ میں جزیروں اور صحراؤں کی جو بھرمار رہی اس کی گنتی بھی یاد نہیں۔ شاہد میر کی ان غزلوں کو دیکھ کر ایک حیرت انگیز خوشی محسوس ہوئی کہ نہیں ہمارا شعری ادب ایسا بھی بے آب و گیاہ صحرا نہیں، نخلستان ہے جو بگولا صفت "ناقدوں" کے وجود کے باوجود بے وجود نہیں ہوا۔

شاہد میر ایک اچھے شاعر ہیں۔ اس کا مُنہ بولتا ثبوت ان تین غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ احساسات کی شدّت اور قوتِ اظہار کا تیکھاپن نیز لہجے کا نیاپن ادب کے کسی بھی سنجیدہ اور مخلص اسٹوڈنٹ کو چونکائے گا کسی اجلبی اور سرے سے ناواقف شاعر کا شعر اگر آپ کے مُنہ سے بے ساختہ واہ نکلوا دے تو اس میں آپ کی سخن فہمی نہیں، بلکہ شاعر کی قوتِ سخن گوئی زیادہ لائقِ تحسین ہے کہ اچھے شاعر کو اچھے سخن فہم نہ ملیں تو وہ بُرے شعر نہیں کہنے لگے گا۔ (من موہن تلخ)

وہ اک چُپ چُپ سا پیکر بولتا ہے
مِرے شعروں میں ڈھل کر بولتا ہے
ہر اک قطرے کے اندر بولتا ہے
خلاؤں میں سمندر بولتا ہے
عجب فنکار صورت ہے وہ چہرہ
کئی خانوں میں بٹ کر بولتا ہے
تمہارا قرب پاکر دل جو دھڑکا
یقیں آیا کہ پتھر بولتا ہے
سِتم پیشہ ہواؤں کی کہانی
مِرا پامال چھپّر بولتا ہے
مِلن کی ساعتیں نزدیک آئیں
مُنڈیروں پر کبوتر بولتا ہے
گھریں بادل تو اُن آنکھوں میں اکثر
کوئی پیاسا سمندر بولتا ہے
مُسلسل گنگناتی ہیں فضائیں
وہ اپنے مُنہ سے پَل بھر بولتا ہے
مکیں اوڑھے ہیں خاموشی کی چادر
مگر جلتا ہوا گھر بولتا ہے
جہاں حُکمِ زباں بندی ہے نافذ
وہیں شاہد مُکرّر بولتا ہے



● گورنمنٹ کالج، بانسواڑہ (راجستھان) ۳۲۷۰۰۱

ہولے ہولے چھیڑ رہی ہے بھولے بسرے ساز ہوا
سبز بنوں سے آج نجھے پھر دیتی ہے آواز ہوا
بستی میں کر آئی جا کر کتنے ہی در باز ہوا
ڈھونڈ رہی ہے شاید کوئی بچھڑا ہوا دم ساز ہوا
میرے بدن کی خاک اُٹھاتے صحرا صحرا پھرتی ہے
مٹی کے تودے کے اب تک اُٹھا رہی ہے ناز ہوا
تجھ سے پہلے بستی بستی تیرے سُرخ گلابوں کے
صحنِ چمن کو یاد ہیں تیرے دئے ہوئے اعزاز ہوا
انتشار کے سوا بتاؤ کیا ہوگا اس کا انجام
اپنی کہانی کا بن جائے جب حرفِ "آغاز" ہوا
کونا کونا مہکا ہوا ہے جواں جسم کی خوشبو سے
میرے گھر میں کھول رہی ہے اُس کے گھر کے راز ہوا

نئے سورج اُجالوں سے نہ اب محروم کر مجھ کو
ہوا ہوں کن اندھیروں میں نہاں معلوم کر مجھ کو
شجر نے لہلہاکر اور ہوا نے چوم کر مجھ کو
تیری آمد کے افسانے سُنائے جھُوم کر مجھ کو
سُلگتا لفظ ہوں اب بلد بے مفہوم کر مجھ کو
چھپا دے سرد تحریروں میں او معدوم کر مجھ کو
زمانے بھر میں بکھرے ہی حاصل جو نہیں پایا
مِلا جو تجربہ خود اپنے اندر گھوم کر مجھ کو
یہ منظر ڈوبتے سورج کا آ کر مجھ سے کہتا ہے
میں تیری ذات کا اک انگ ہوں منظوم کر مجھ کو
مِرے اندر خزاؤں کی گھُٹن کم ہو نہیں پاتی
گزر جاتے ہیں تازہ کار موسم چُوم کر مجھ کو
توازن لوٹ آیا ہے پھر آتی جاتی سانسوں میں
پلا کر ایک قطرہ زندگی مسموم کر مجھ کو
رہے سایہ فگن برفان آلودہ شجر ہر دم
دِکھا کر یہ ہرے منظر نہ اب مغموم کر مجھ کو
شکستہ خال و خط ہیں منتظر تیری نگاہوں کے
میں اک بھُولی ہوئی تہذیب ہوں معلوم کر مجھ کو

جوگندر پال

(مسلسل ناول)

اے دیدہ ورو

(باب ۳)*

شرفو

ہمارے اندھوں کے گھر کی بنائی ہوئی بانس کی ٹوکریاں سارے شہر میں مشہور ہیں اور گھر میں ٹوکریاں بنانے والوں میں مَیں۔ مَیں جب نیا نیا یہاں آیا تو سچے ماموں کی ٹوکریوں کی بڑی دھاک تھی۔ ماموں کو ماموں اس لیے کہا جاتا تھا کہ بات بات پر وہ اپنی بہن کا ذکر لے بیٹھتا تھا ـــــ سچے! تم سب میری اسی بہن کی اولاد ہو اور میں تمہارا ماموں ہوں ـــــ سچے! ـــــ میری ماں کا کوئی بھائی نہ تھا مگر سچے ماموں سے مل کر مجھے یقین ہوگیا کہ میری پیدائش سے پہلے جب ماں کا نیا نیا بیاہ ہوا ہوگا اور وہ میکے کی یاد میں اداس ہوکر اپنے ویرے کے گیت گاتی ہوگی تو اُسے اپنے خیالوں میں دور سے سچے ماموں ہی آتا ہوا دکھائی دیتا ہوگا۔

ماموں، تم ماموں تو سب کے ہو پر میرے اصلی ماموں ہو۔

یہ بات ہے بھانجے، تو میں بھی تمہیں اپنے بدن کی پوریں کاٹ کاٹ کے ٹوکریاں بنانا سکھاؤں گا۔

سچے ماموں نے مجھے راہ پر لگا کر دم لیا۔

ایک بات یاد رکھو بھانجے، بُنتی کرتے ہوئے بانس کی چکنائی کو اپنی انگلیوں پر سوکھنے مت دو۔ پھانکیں گیلی گیلی ہی جُڑ جائیں تو ایک قالب ہوکر جی پڑتی ہیں ـــــ سچے! ـــــ ٹوکریاں بنانے والے کا کام ٹوکریاں بناتے چلے جانا نہیں، بلکہ ایک ایک ٹوکری کو جنم دینا ہے۔

اسے سچے ماموں کا فیض کہیے کہ میری انگلیاں ٹوکریوں کی بُنتی کرتے ہوئے دس چشمی ہوجاتی ہیں۔ پہلے جب میری انگلیوں نے دیکھنا شروع کیا تو خوشی سے اندھی ہوکر بانس کی تند پھانکوں سے اپنا آپ کو لہولہو کر لیتیں اور میرے ہونٹوں پر کوئی بھولا ہوا لوک گیت بے اختیار اپنے آپ کو گانے لگتا جیسے کوئی چشمہ درونِ ارض پتھریلے رقبوں میں بھٹک بھٹک کر وہیں سے پھوٹ پڑتا ہے جہاں مٹی بھربھری ہو۔ انگلیاں میری اب بھی دیکھتی ہیں لیکن یہ سارے سال دیکھنے کی عادی ہوکر اب خودکار سی ہوگئی ہیں، گویا دیکھے بغیر دیکھتی جا رہی ہوں۔ اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ آنکھوں والے بھی نظر کے عادی ہوتے ہوتے ہماری مانند اندھے ہو جاتے ہوں گے ـــــ دیکھنے کی کوئی خاص بات ہو تو دیکھیں، ورنہ دیکھ ہی تو رہے ہیں ـــــ لیکن اس حالت میں بھی مَیں کئی بار ٹھٹک کر رہ جاتا ہوں۔ میری خودکار انگلیاں نامعلوم کس دھیان میں کسی ادھوری ٹوکری کو بن رہی ہوتی ہیں کہ بانس کی کوئی بے چین پھانک خواہ مخواہ دوسری پھانکوں میں الجھ جاتی ہے اور میری ساری انگلیاں ہڑبڑا کر اُس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں ـــــ شریر کہیں کی!

تو کیا کرتی؟ مَیں نے اتنی بار تم میں سے ایک ایک کو بلایا مگر کوئی سر ہی نہیں اٹھاتی۔

بولو، کیا کہنا ہے؟

کچھ کہنا ہی ہو تو بولا جاتا ہے؟ بس باتیں کرو۔

بانس آپ تو بانس کا بانس ہوتا ہے بھانجے پر اُس کی قاشیں بڑی نٹ کھٹ ہوتی ہیں سچے! ـــــ اُن کی سج دھج دیکھنی ہو تو اُن سے پیار کیے جاؤ۔

اُن دنوں میری انگلیاں اُن کی ادھوری صورت پر ہی ریجھ ریجھ کر انہیں بُننا بھول جاتی تھیں۔

رُک کیوں گئیں؟ مجھے ایسے ہی چھوڑ دیا تو بِکے ہوئے آم راہگیروں کے پاؤں تلے گر گر رُند جائیں گے ـــــ میری انگلیاں تھوڑی سی اور بُنتی کرکے پھر رک جائیں اور اُس پر نظریں جمالیتیں ـــــ اتنی محبت سے مجھے بنا رہی ہو، کل وَل میں بِک جاؤں گی تو مجھے یاد رکھوگی؟ ـــــ اُن دنوں

---

* آج کل بہ غور دیکھا تو پتہ چلا کہ (ناول "اے دیدہ ورو") دوسرے باب کو پہلے باب کا ہی حصّہ بنا کر پیش کر دیا ہے (ملاحظہ صفحہ گیارہ پر آخر سے ساتویں سطر)۔ نیا باب خیال کی ایک الگ سطح سے شروع ہوتا ہے اس لیے یہاں (۲) مارک کرکے اسے شروع کرنا چاہیے تھا۔ اِن دو بابوں کے مل جانے سے اِس مقام پر قاری کے ذہن میں ـــــ ہنگامی طور پر ہی سہی ـــــ ذرا کنفیوژن سا پیدا ہوا ہوگا۔ اگر آئندہ قسط میں اِس امر کی وضاحت کر دیں تو بہت اچھا رہے گا۔

(جوگندر پال)

اپنی بناتی ہوتی ٹوکریاں میرے ذہن سے ہفتوں مہینوں نہ نکلتی تھیں ـــــ اُس کا سر ذرا بڑا تھا تو کیا ہوا؟ ناک نقشے کی کتنی تیکھی تھی!ـــــ اور وہ بھی پٹھان کی پٹھان تھی پر اُس گجراتی بنیئے کے ہاتھوں ٹکوں کے بھاؤ بک گئی۔ کوئی کابل کا سردار لے جاتا تو اُس کا مُنہ ہر وقت میووں سے بھرے رکھتا ـــــ اور وہ چھوٹی سی میم صاحب! کتنی پیاری نکل آئی تھی! جی چاہتا تھا اُسے اُسی کے کندھوں پر لٹکا دیا جائے ـــــ

مگر یہ اُن دنوں کی باتیں ہیں۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا جا رہا ہوں میری محبتیں چھوٹی ہوتی جا رہی ہیں اور مجھے اُن کے چھوٹا ہوتے جانے پر بڑی شرمندگی ہے۔ شاید میری شرمندگی کے باعث ہی بانس کی پوریں ابھی تک میرا ساتھ دئے جا رہی ہیں، ورنہ بانس کی ذات ہیں، کیوں بخشیں گی؟ـــــ اس وقت بھی میری انگلیوں نے ایک ٹوکری کو پورا کر کے بے خیالی میں ایک طرف ڈال دینا چاہا ہے کہ اُس کی بالائی گولائی سے ایک ـــــ کھلنڈری سی پھانک باہر نکل کے انہیں چبھ گئی ہے۔

سی ـــــ ی ـــــ ی!

سی سی کیا؟ دیکھو چبھی ہوں تو میں بھی تھوڑی سی ٹوٹ گئی ہوں۔

میری انگلیاں اپنا درد بھول کر اُس کے ٹوٹے ہوئے حصّے کو سہلانے لگی ہیں۔

چلو چھوڑو مجھے۔ ابھی ابھی اِس طرح ایک طرف ڈالے دے رہے تھے، جیسے مجھ سے کچھ لینا دینا ہی نہیں۔

میں نے مسکرا کر اُس سے نامعلوم کیا کہنا چاہا ہے کہ مجھے بابا کے چپڑاسی کی آواز سنائی دی ہے۔

ٹوکری سے باتیں کر رہے ہو شرفو؟ چلو تمہیں بابا نے یاد کیا ہے۔

کیوں؟ـــــ مجھے الجھن ہونے لگی ہے کہ بابا نے کیوں بلا بھیجا ہے۔ عام طور پر وہ کسی کو آفس میں نہیں بلاتا۔ کوئی کام ہو تو اِدھر اُدھر کہیں ملاقات پر دو تین جملوں میں ہی ساری بات کہہ دیتا ہے۔ ہم میں سے کوئی کبھی سارا قصّہ کھول کر بیٹھ جاتا ہے تو وہ فوراً اُسے ٹوک دیتا ہے ـــــ فالتو باتیں مت کرو۔ تاکہ جو سمجھانا چاہتے ہو صاف سمجھا سکو۔

مجھے بابا سے کچھ کہنا ہو ـــــ بابا کے پچھلے جنم دن پر بھولا نے اپنی تقریر میں کہا تھا ـــــ ـــــ تو اُس کی ہدایت کے مطابق میں جی ہی جی میں اپنی فالتو باتوں کو چھانٹنا شروع کر دیتا ہوں اور چھانٹتے چھانٹتے میری ساری بات ہی چھنٹ جاتی ہے۔

اسی لیے تمہیں سمجھنے میں مجھے ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی ـــــ بابا نے اسے مُسکرا کر جواب دیا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے کسی کا کوئی پہلو بابا سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ شیرو کو ناک میں انگلی ڈالے رکھنے کی عادت ہے؛ پیشوا پہیلیاں بُوجھتے بُوجھتے کپڑے سینا بھول جاتا ہے، رتنے سے زبردستی نہ کی جائے تو ساری عمر نہ نہائے۔ پانی سے اتنا ڈرتا ہے گویا کھلے نل کے نیچے بیٹھتے ہی ڈوب جائے گا، مینس میں ماش کی دال پکی ہو تو رتی اتنا کھا لیتی ہے کہ دوسرے دن پیٹ کی خرابی سے پڑی رہے ـــــ مجھے اندیشہ ہے اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ رونی ہمارا اندھوں کا گھر چھوڑ کے کیوں گئی۔ اُس کے جانے کے کئی روز بعد بابا نے مجھ سے پوچھا تھا ـــــ

رونی تم سے اتنی ناراض کیوں تھی شرفو؟

نہیں بابا، ناراض تو نہیں تھی۔

تو کیا خوش تھی؟

نہیں،

تو پھر کیسے کہتے ہو، ناراض نہ تھی؟

ہاں، بابا، ناراض ہی تھی۔

میں نے سوچا، بابا سے کیا پردہ؟ اُسے ساری کہانی سنائے دیتا ہوں۔

نہیں، بیٹے، کہانی وانی چھوڑو۔ بس وہ لوٹ آئے تو اس سے شادی کر لو۔

مگر بابا نے اپنی ساری عمر کنوارہ رہ کر بتا دی ہے۔

میرے سب سے بڑے بچے کی عمر پچپن سے بھی اوپر ہے ـــــ ہمارا پچپن سالہ جندرو کاکا بابا کو اپنا حوالہ دیتے ہوئے پاکر بڑی معصومیت سے ہنسنے لگتا ہے اور ناسمجھ بچہ سا ہی معلوم ہوتا ہے ـــــ شادی کر لوں گا تو اوروں کو چھوڑو، تم میری اولاد ہی میرا مذاق اُڑاؤ گی۔

بابا واقعی ہم سب بچوں کا باپ ہے۔ ہماری طرح اندھا ہے لیکن ایک ایک پر پوری نگاہ رکھتا ہے۔ ہمارے اندھوں کے گھر میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو اور گھر کے برآمدوں میں اُس کی چھڑی اور قدموں کی مانوس آواز سن کر ہم جہاں بھی ہوں، جو کچھ بھی کر رہے ہوں، رحمتوں کی اِس آواز کو اپنے دلوں میں بسا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اس آواز سے ہمیں اپنی کھوئی سمتوں کی خبر ہونے لگتی ہے ـــــ ہمارا بابا ہماری بینائی ہے۔ جو اوروں کو نظر عطا کرتا ہے اُسے خود آپ کیوں کر نہ دکھائی دیتا ہوگا۔ اُس کی چال بے دھڑک ہے کہ کوئی سوچ ہی نہیں سکتا وہ اندھا ہے۔

بابا، کیا تمہاری کوئی تیسری آنکھ ہے؟

پہلے دو آنکھیں ہوں تو پھر تیسری کا ذکر جائز ہوتا ہے۔

پھر تم دیکھ کیسے لیتے ہو بابا؟

آنکھیں نہ ہوں تو اُسی وقت دکھائی دیتا ہے جب ہم آنکھوں کو بالکل بھول جائیں۔

بابا نے اندھیرے کو ہی اپنی نظر کا وسیلہ

بنالیا ہے۔ ۔ ۔

بابا کا آفس اب زیادہ دور نہیں۔ بائیں طرف جنرل ایجوکیشن کے کاریڈار سے گزر کر میں اسپورٹس کاریڈار میں داخل ہو جاؤں گا اور وہاں سے ذرا ہی آگے بابا کا دفتر ہے۔

مجھے بدستور الجھن ہو رہی ہے کہ ایسی کونسی بات ہے جس کے لیے بابا نے خاص طور پر دفتر میں بلایا ہے ——— شاید کہیں سے ٹوکریوں کا کوئی بہت بڑا آرڈر آگیا ہو ——— نہیں، ایسے ہوتا تو بابا اپنے کسی راؤنڈ میں ہی مجھے ضروری ہدایتیں دے دیتا ——— تو پھر ——— پھر ہو سکتا ہے رونی لوٹ آئی ہو ——— میں ہنسنے لگا ہوں ——— رونی کو گئے ہوئے پانچ برس ہونے کو آ رہے ہیں، اب کہاں لوٹے گی؟ ——— جب وہ گئی تھی تو میں نے چپکے سے اُس کے نام اپنے کمرے کی کھڑکی کے قریب ہارسنگار کا پودا لگا دیا تھا۔ اُس دن سے اُسے باقاعدہ پانی دے رہا ہوں۔ اُس پودے کی جڑیں اب اتنی نیچے اتر گئی ہیں کہ وہ ایک چھوٹا سا درخت بن کے وہیں بس گیا ہے اور بسے بسے پھولوں سے لدا رہتا ہے اور پھولوں کی خوشبو سے بے سدھ ہو کر میں کئی بار رات کے آخری پہر کمرے سے نکل کر درخت کے پاس چلا آتا ہوں اور آس پاس ڈوبتی ہوئی کثیر خوشبوؤں میں لمبے لمبے بے چین سانس بھرنے لگتا ہوں اور میرے لمس سے یا لمس کے خوف سے پھول خاموشی سے جھڑتے رہتے ہیں ——— رونی جہاں بھی ہے ہارسنگار کے اس درخت کی مانند اُس کی جڑیں بھی وہیں دھنس چکی ہوں گی، اس کے خوشبو آمیز جھونکے بھی اُسی کے آس پاس ڈوب جاتے ہوں گے ——— اب وہ یہاں کیسے آسکتی ہے؟ ——— لیکن کیا پتہ؟ ——— کیا پتہ، وہ واقعی آگئی ہو؟ ——— اور اُس نے بابا سے کہا ہو، بابا، مجھے شرفو سے شادی کرنا ہے! ———

رونی! ——— رونی۔ مجھے بھی اپنے بدن کے ایک ایک مسام سے نکل کر تمہارے بڑھے ہوئے ہاتھ تھام لینا ہیں ——— میں آرہا ہوں رونی! ——— میں آرہا ہوں! ——— تم یہاں تھیں تو میں نے ناحق اپنے آپ کو روکے رکھا۔ در اصل اُس وقت بھی میں تمہارا انتظار کر رہا تھا ——— بہت اچھا کیا جو آگئیں ——— میں آرہا ہوں! ———

شرفو! ——— فو! ——— مجھے کون پکار رہا ہے ——— شرفو! ——— نہیں، بھولا، اس وقت میں نہیں رک سکتا۔ ——— دیکھو ضد کرو گے تو تمہارا فالتو کھاتی میں چھلانگ لگا دے گا ——— میں آرہا ہوں رونی! ———

میں اسپورٹس کاریڈار میں داخل ہو گیا ہوں

ارے او شرفو!

یہ تو واقعی اپنا بھولا ہے ——— کیوں بھولا، کیا بات ہے؟ ——— نہیں، رونی، بھولا سے مت ڈرو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا ——— نہیں نہیں بھولا، تم جاؤ ——— ہاں، بابا سے مل کے آتا ہوں ———

اسپورٹس کاریڈار بھی پیچھے رہ گیا ہے اور ———

نہیں بھولا، تم جاؤ ——— بابا نے جلدی آنے کو کہا ہے ———

مجھے ہلکی سی ٹھوکر لگی ہے ——— آہستہ شرفو! ——— میں نے اپنے آپ سے کہا ہے لیکن اپنی نصیحت پر دھیان دیے بغیر ویسے ہی چلتا جا رہا ہوں اور ——— اور بے حد خوش ہوں اور انگلیوں کو خالی خولی ہلاتے ہوئے رونی کی سی ایک ٹوکری بنا رہا ہوں اور ——— اور میں دیکھ تو نہیں رہا مگر مجھے دیکھنے کا سا احساس ہو رہا ہے، یا لگ رہا ہے پل دو پل میں دیکھنے لگوں گا ——— بابا کے آفس میں میری آنکھیں میرا انتظار کر رہی ہیں ——— میں نے اپنے دونوں ہونٹ گول کر کے سیٹی بجانا چاہا ہے ——— ار ——— ر ——— را ——— میں نے سیٹی کی آواز کو بے سود روکنے کی کوشش کی ہے ——— میں بابا کے دفتر کے دروازے پر کھڑا ہوں اور میرا دل اچانک اس خوف سے بھرنے لگا ہے کہ رونی شاید نہ آئی ہو۔ اتنے سال بیت جانے کے بعد وہ اچانک کہاں سے وارد ہو جائے گی؟ ——— بابا کو یوں ہی سا کوئی کام ہو گا ——— یوں ہی سا کام کیا؟ ——— لمس کے خوف سے ہارسنگار کے پھول جھڑ جھڑ کر گر رہے ہیں ———

آجاؤ شرفو!

رونی کی آواز اندر سے آئی ہے ——— نہیں، یہ آواز بابا ہی کی تھی لیکن بابا کے دفتر میں داخل ہو کر میری اندھی آنکھوں نے سب سے پہلے رونی کو ہی دیکھا ہے۔ میں نے رونی سے کچھ کہا ہے نہ رونی نے مجھ سے۔ آہستہ آہستہ اُس کے قریب آکے میں نے اُس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیے ہیں اور اس نے میری طرف، اور ہم دونوں کے ہاتھ آپس میں بندھے ہوئے بے اختیار باتیں کرنے لگے ہیں، وارفتہ شوق سے ایک دوسرے کو سننے لگے ہیں۔

یہ کون ہے امی؟

بابا کی گود سے کسی بچی کی بھولی سی آواز سن کر مجھے گویا بھولا کی بالی عمر کی دور دھیا صدا سننے کا احساس ہوا ہے۔

یہ ہمارا شرفو ہے لکھی۔ اس سے تمہاری امی کی شادی ہو گی۔

ننھی منی لڑکی خوشیاں سے تالیاں بجانے لگی ہے ——— آؤ بابا، تم اور میں بھی شادی کر لیں۔

نہیں لکھی، جب تم پڑھ لکھ کر بڑی ہو جاؤ گی تو میں تمہاری شادی کے لیے بڑا اچھا آدمی ڈھونڈ کے لاؤں گا۔

تم بھی تو بڑے اچھے آدمی ہو بابا۔

بھولا کی طرح لکھی بھی کتنی ہوشیار اور باتونی ہے!

بابا لکھی کو بازوؤں میں اٹھا کر کھڑا ہو گیا ہے

(بقیہ صفحہ ۸۰ پر)

[illegible] سے [illegible]



ہندوستان کے [illegible]

اسلام آ[illegible] تشریف لے گئے [illegible]

[illegible]



Regd. No. D (DN) 103
R.N. 948/57

Licensed (D) - 50 to post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi.



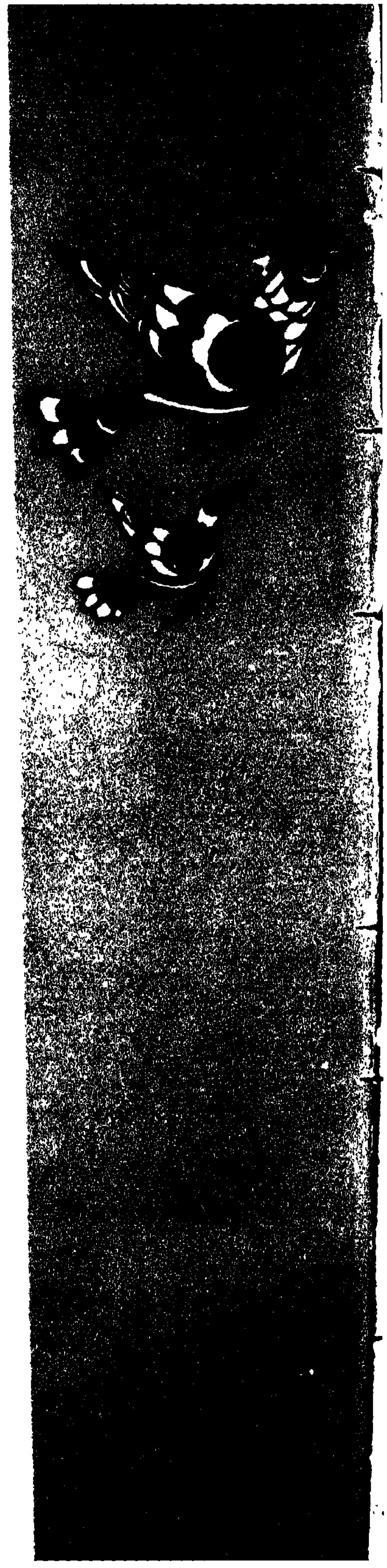
وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اسلامی ممالک کے سفیروں اور دہلی کے عمائدین کو افطار کی دعوت دی۔ (اوپر) شریمتی اندرا گاندھی چند غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ (نیچے) شریمتی اندرا گاندھی عمائدین دہلی کے ساتھ۔ وسط میں بیگم عابدہ احمد ہیں۔



ضمیمہ

آجکل

اگست ۱۹۸۱ء



ترتیب

■ ایڈیٹر: راج نرائن راز
■ اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
■ سب ایڈیٹر: وشوناتھ درستہ



ہاں، میں بھی چل سکتا ہوں

یہ سائیکل بھی کچھ کم مزے کی نہیں



۱۹۸۱ء کا سال پوری دُنیا میں معذور بچّوں کے سال کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہر ملک اپنی جگہ ایسی کوشش کرے جن سے معذور بچّوں اور افراد کو سماجی زندگی میں بحال کیا جا سکے۔

ہمارے ملک میں ایسے تربیتی نصابات ہیں جن سے معذور بچّے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ جسمانی معذوری ڈاکٹری علاج سے دور کی جا سکتی ہے اور مصنوعی اعضا کی مدد سے معذور بچّے زندگی میں تندرست بچّوں کی طرح ہنسی خوشی لکھ پڑھ اور کام کاج کر سکتے ہیں۔ معذور بچّوں کو ورزش کے خاص طریقوں سے چلنے پھرنے کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔

راج نرائن راز

آزادی کا مطلب

کیا آپ نے کبھی سوچا: آزادی کا مطلب کیا ہے؟ ہاں! کبھی سوچا ہوگا۔ لیکن آج اس بارے میں ہم آپ مل جل کر سوچیں گے۔ شاید کوئی اچھا نتیجہ نکلے۔

بات ایک چٹکلے سے شروع کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چٹکلہ آپ کا سنا ہوا ہو۔ لیکن آپ نے اسے اس طرح نہیں سنا ہوگا۔ ہاں تو چٹکلہ ہے: ایک ننھا اپنے والد سے بولا "ابا جی! ہمیں ڈھول لے دو۔"

ابا جی نے سیدھا بلکہ ٹکا سا جواب دیا۔ "ننھے تم وقت بے وقت ڈھول بجا کر ناک میں دم کر دوگے۔"

یہ سن کر ننھے نے اپنی معصوم سی آنکھیں مٹکائیں۔ ایک بار کندھے سکیڑے۔ پھر بولا "نہیں ابا جی۔ میں بالکل پریشان نہیں کروں گا۔ میں ڈھول رات میں بجایا کروں گا، جب سب سو جائیں گے۔"

ننھے کے اس جواب پر اس کے ابا جی مسکرا دیئے۔ لیکن ننھے کو ڈھول نہیں ملا۔ ننھے کو ڈھول بجانے کی بھی آزادی نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ پوچھیں گے: آخر آزادی کا مطلب کیا ہے؟ تھوڑے اور آسان سے لفظوں میں جواب ہے: کوئی کام اپنی خوشی اور مرضی کے مطابق کرنا۔ اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے: اس ننھے کی چھوٹی سی خوشی کو اس کے ابا جی نے کیوں پورا نہیں کیا۔ اور ننھے کو ڈھول کیوں نہیں لے دیا۔ ذرا سوچ بچار کریں تو معلوم ہوگا کہ ننھے کو اس کی سادگی کی وجہ سے ڈھول نہیں ملا۔ وہ یہ بھول گیا کہ رات میں ڈھول بجانے کا مطلب کیا ہے؟ وہ یہ بھی بھول گیا کہ رات میں ڈھول بجانے کی آزادی گھر اور پاس پڑوس والوں کی نیند حرام کر دے گی۔ ذرا سوچیں تو! اگر وہ یہ کہتا کہ وہ صرف دن میں ڈھول بجائے گا۔ یا یہ کہ صرف ایک آدھ گھنٹہ ڈھول بجا کر دل بہلائے گا، تو شاید اس کے ابا جی نے اس کو ڈھول خرید دیا ہوتا۔ ڈھول بجانے کی آزادی پر روک کیوں لگی؟ اس لیے کہ اس کے ابا جی نے سوچا: ننھے کی آزادی گھر اور پڑوس والوں کی نیند حرام کر دے گی۔ ان کے لیے تکلیف کا باعث بنے گی۔

ڈھول بجانے کی بات دوسری ہے۔ لیکن کچھ ایسی یا اس سے ملتی جلتی صورت آپ نے پاس پڑوس کے گھر میں اور شاید کبھی اپنے گھر میں بھی دیکھی ہوگی۔ ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ بڑی اونچی آواز میں بج رہا ہے۔ اچھے اچھے گانے آ رہے ہیں۔ کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ لیکن گانوں کی اونچی آواز آپ کے ساتھ ساتھ کسی اور کے کانوں میں بھی پڑ رہی ہے۔ کیا وہ بھی گانا سن کر خوش ہو رہا ہے۔ یا صرف پریشان ہو رہا ہے؟ سوچیں تو پڑوسی کا بیٹا امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ لیکن پڑھ نہیں پا رہا۔ آپ کے کانوں میں رس گھولنے والے گانے اس کی پڑھائی میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ کبھی سوچا کہ پڑوسی جو بہت دنوں سے بیمار ہے، اس پر گانوں کے شور کا کیا اثر ہوگا؟ ظاہر ہے، دن ہو یا رات۔ پڑوسی کا بیٹا اور بیمار پڑوسی دونوں گانوں کے شور سے بہت پریشان ہوں گے۔ ایسے میں آپ کی خوشی تکلیف کا باعث بنے گی۔ آپ کو یاد ہے نا! ننھے کو اس کے ابا جی نے کیوں ڈھول لے کر نہیں دیا تھا۔ ایسے میں اچھا ہوگا اگر آپ ریڈیو کی آواز کم کر دیں، تاکہ صرف آپ کو سنائی دے۔

تو پہلی بات یہ ہوئی کہ ایک شخص کی آزادی یعنی خوشی، کسی قسم کی تکلیف کا باعث بن کر کسی دوسرے کی آزادی یا خوشی میں رکاوٹ نہ بنے۔

آیئے، اسی بات کو ایک اور مثال سے سمجھیں۔ مثال کیا ہے۔ ایک کہانی ہے۔ یہ کہانی روم کے بادشاہ نیرو کے بارے میں ہے۔ کہتے ہیں، نیرو کو بانسری بجانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار اسے خیال آیا: اگر شہر میں آگ لگ جائے، شہریوں میں بھاگ دوڑ مچ جائے، آگ کی پیلی اور لال لپٹیں آسمان سے باتیں کریں تو ایسے میں بانسری بجانے میں بڑا مزا آئے

● ایڈیٹر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

گا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے حکم دیا: سارے شہر کو آگ لگادی جائے۔ اور شہر کو آگ لگا دی گئی۔ لوگوں میں شور مچ گیا۔ آگ کی لپٹیں اونچی اونچی اٹھتی رہیں۔ نیرو چین سے بانسری بجاتا رہا۔ سارا شہر جل کر راکھ ہو گیا۔ کتنے لوگ مرے، کتنے بے گھر ہو گئے۔ لیکن نیرو کی خوشی پوری ہوئی۔ کیا اسے ایسی من مانی آزادی ملنی چاہئے تھی؟

خیر، یہ بات گذرے ہوئے زمانے کی ہے۔ تب بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ ہمارا آپ کا زمانہ عوام کا یعنی عام لوگوں کا ہے۔ اب ہمارے آپ کے چنے ہوئے لوگ حکومت چلاتے ہیں۔ پھر ہماری دنیا بہت بڑی ہے، اتنے سارے لوگ ہیں۔ ہر شخص کا، ہر دوسرے شخص سے کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ چاہے وہ رشتہ سماجی ہو، تہذیبی ہو یا کاروباری ہو۔ ایسی جڑی اور گتھی ہوئی دنیا میں ایک شخص کی آزادی کسی دوسرے شخص کی آزادی میں رکاوٹ نہ ڈالے گی۔ اس کے لیے دکھ تکلیف کا باعث نہ بنے گی، یہ کیسے مان لیں۔

ہاں یوں تو معاملہ کچھ ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے، لیکن کچھ زیادہ ٹیڑھا نہیں۔ اگر ہم ایک بات سمجھ لیں تو یہ مشکل آسان ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ اپنی آزادی کا مطلب اس بات کا خیال رکھنا بھی ہے کہ اس سے دوسروں کی آزادی میں حرج یا رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی آزادی بغیر روک یا پابندی کے نہیں ہو سکتی۔ آزادی اور پابندی کی حدیں بڑی گڈمڈ ہیں۔ پابندی کی حد کہاں ختم ہوتی ہے؟ آزادی کی حد کہاں شروع ہوتی ہے؟ اس بارے میں کوئی بات طے نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس کا فیصلہ حالات کو سامنے رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور اس پر بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہو۔

ہم نے بات ننھے کے [illegible] شروع کی تھی۔ آیئے اس کو بڑھائیں۔ ننھے نے یا یوں کہیں کہ اس کے ابا جی نے پاؤں گھر سے باہر نکالا۔ جی میں سمائی کہ بائیں طرف نہیں، بلکہ سڑک کے دائیں طرف چلیں گے۔ اس لیے کہ بائیں طرف تو سبھی چلتے ہیں۔ پھر آزادی کا مطلب کیا ہوا؟ ننھے کے ابا جی سڑک کے دائیں کنارے چلنے لگے۔ سامنے سے پوں پوں، پیں پیں کرتی ہوئی موٹر گاڑیاں اور اسکوٹر چلے آرہے ہیں۔ کبھی کوئی گاڑی سائیں سے ان کے بائیں سے گزر جاتی ہے۔ کبھی کوئی اسکوٹر پھٹ پھٹ کرتا ہوا دائیں سے نکل جاتا ہے۔ اور انہیں اپنے آپ کو بچانا مشکل ہوا جا رہا ہے۔ دوسرے ہی پل میں انہیں معلوم ہو گیا کہ سڑک کے دائیں کنارے چلنے کی آزادی کا کیا مطلب ہے؟ انہیں معلوم ہو گیا کہ دائیں طرف چلنا حادثے کو دعوت دینا ہے۔ یہی نہیں، اس سے گاڑیوں کے آنے جانے میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے چنانچہ وہ فوراً بائیں کو ہو گئے۔

آپ نے دیکھا: سڑک کے دائیں کنارے چلنے کی آزادی جہاں دوسروں کے لیے مشکل کا سبب بنی، وہاں وہ خود ان کے لیے بھی مصیبت بن سکتی تھی۔

تو دوسری موٹی بات یہ ہوئی کہ آزادی ہر حال میں قاعدے قانون کی پابند ہوتی ہے۔

اب ننھے کے ابا جی کے سر میں یہ دھن سمائی کہ وہ تقریر کی آزادی سے کام لیں گے۔ پھر کیا تھا، ننھے کے ابا جی جوش میں آکر معلوم نہیں کیا کیا بولنے لگے۔ شاید سوچا ہوگا: باتوں کے پیسے نہیں لگتے۔ وہ الٹی سیدھی بے پر کی اڑا رہے تھے کہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ بس پھر کیا تھا۔ پولیس نے ننھے کے ابا جی کو دھر لیا۔ بیچارے تقریر کی بےجا اور بجا آزادی کا فرق نہیں جانتے تھے۔ سڑک کے دائیں کنارے چلنے کی آزادی کی طرح تقریر کی بےجا آزادی کے نتیجے میں لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ اور یہی ہوا۔ یعنی پولیس نے انہیں دھر لیا۔

ننھے کے ابا جی کو ایک شہری ہونے کے ناتے یہ آزادی ہے کہ وہ اپنی مرضی کا کام دھندہ کریں لیکن وہ چوری چکاری کو دھندہ نہیں بنا سکتے۔ اس لیے کہ چور اچکوں کی جگہ جیل میں ہوتی ہے۔ مال اسمگل نہیں کر سکتے کہ یہ غیر قانونی ہے۔ اسی طرح مال میں ملاوٹ نہیں کر سکتے۔ بلیک مارکیٹ یعنی کالا دھندہ نہیں کر سکتے۔ مال کو بےجا طریقے پر اکٹھا نہیں کر سکتے۔ ہاں، قاعدے قانون کے اندر رہ کر وہ کوئی دھندہ بھی کر سکتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہوئی کہ ہر شخص قاعدے قانون کے اندر رہ کر، قاعدے قانون کی پابندی کر کے اپنی آزادی سے کام لے سکتا ہے۔ پابندی قانون کی ہو، یا اخلاقی، سماجی قاعدوں کی۔ آزادی کی حد اسی سے مقرر ہوتی ہے۔

اب سو باتوں کی ایک بات۔ اپنی آزادی کا مطلب ہے، دوسروں کی آزادی کا خیال، احترام کرنا۔ یہ احترام ہی پابندی کی حد ہے۔ اور کوئی بھی آزادی پابندی کے بغیر پوری نہیں، بالکل ایسے ہی جیسے دن رات کے بغیر پورا نہیں یہی قدرت کا قانون ہے۔

سکندر ضمیر

"برسات آگئی ہے"

گھر گھر کے آ گئے ہیں پھر کالے کالے بادل
لہرا اُٹھا فضا میں ٹھنڈی ہوا کا آنچل

تپتی ہوئی زمیں کے تن پر پڑا ہے پانی
جھرنوں میں، ندیوں میں، آنے لگی جوانی

جنگل ہرا بھرا ہے، پھل پھول ہنس رہے ہیں
یعنی خوشی کے بادل سب پر برس رہے ہیں

پتّوں پہ شبنمی سے موتی جڑے ہوئے ہیں
پھر جھیل کے کنارے بگلے کھڑے ہوئے ہیں

کھیتوں میں سبز فصلیں جو سر اُٹھا رہی ہیں
آنکھیں کسان کی بھی اب جگمگا رہی ہیں

مٹّی کی سوندھی خوشبو کیسی بھلی لگے ہے
ہر بالیوں سے اپنی دھرتی سجی لگے ہے

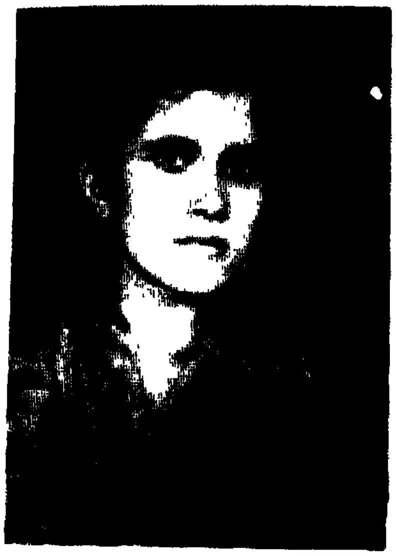
پکنک منا رہے ہیں، پکنک منانے والے
آئینہ بن گئے ہیں تالاب، جھیل، نالے

بجلی چمک رہی ہے، رِم جھم پھُوار بھی ہے
پھولوں پہ رنگ بھی ہے، دیکھو نکھار بھی ہے

ہر چیز کہہ رہی ہے برسات آگئی ہے
شہروں پہ، بستیوں پر، گاؤں پہ چھا گئی ہے

• معرفت رامائن ہاؤس، آزاد مارکیٹ، بھوپال (ایم پی)

نعیمہ قمر



چھبیس سال کا لو

ابھی ابھی وہ لوسی کو ڈاکٹر سے شاک لگوا کر آئی تھی۔ ماں بیٹی دونوں کے چہروں پر کرب کے آثار تھے۔ لوسی شاک کے کرب میں مبتلا تھی اور صبوحی لوسی کے کرب میں۔ ڈاکٹر نے بہت ڈھارس بندھائی تھی لیکن یہ ڈھارس تو وہ شروع سے دیتا آرہا تھا۔ پہاڑ جیسے چھ مہینے کٹ گئے۔ لیکن حالت جُوں کی تُوں رہی۔ بال برابر بہتر نہ ہوئی۔ پھر یقین کیسا اور کس بات کا۔

کمرے کی بوجھل فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اس کی بے چین نگاہیں خلا میں ایک جگہ رُک گئیں۔ وہاں ایک امرود کا درخت تھا۔ یہ وہی پیڑ تھا جس کی شاخوں پر وہ بندر کی طرح اِدھر اُدھر اُچکتی پُھدکتی رہتی تھی...... لیکن...... !

کیا لوسی کبھی اس کی شاخوں پر اُچک کھیل سکے گی؟

کیا کوئی اس کے ساتھ کھیلنا پسند کرے گا؟

● معرفت ایم۔ قیوم خاں، معروف گنج، گیا (بہار)

ماضی کی کتاب کے پریشان ورق اس کی آنکھوں کے سامنے کُھلنے لگے۔ کوئی پندرہ سال قبل کے دن یاد آنے لگے۔

رضیہ امرود کے اسی پیڑ کے نیچے بیٹھا کرتی تھی۔ اس کا باپ، مالی تھا۔ وہ جب کام پر آتا، رضیہ کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر ساتھ لے آتا۔ پیڑ کے نیچے بوریاں ڈال کر اسے بٹھا دیتا۔ رضیہ آتے ہی اس کی کھڑکی پر نگاہیں ٹکا دیتی۔ اُسے بھی تو رضیہ کا انتظار رہتا تھا۔ اس لمبی چوڑی کوٹھی میں دوسرا کوئی اس کا ہم جولی نہیں تھا۔ وہ اس کے پاس چلی آتی۔ وہ رضیہ کو سنڈریلا اور پری ماں کی کہانی سُناتی "جب سنڈریلا کی دونوں سوتیلی بہنیں شاہزادے کے گھر گئیں تو سنڈریلا رونے لگی۔ اسی وقت اس نے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہاں پری ماں کھڑی تھی۔ پری ماں نے اُسے خوبصورت چمکیلے کپڑے دیئے۔ اس کے بالوں میں پھول سج گئے۔ اس کے گلے میں ہیرے کا ہار پڑ گیا اور اس کے پاؤں میں شیشے کے جوتے چمکنے لگے۔ سنڈریلا سونے کی گاڑی میں بیٹھ کر محل میں چلی گئی۔"

رضیہ پُر امید ہو کر اس سے پوچھتی "صبوحی! کیا کبھی پری ماں آکر میرے پاؤں اچھے کر دے گی؟"

"کیوں نہیں؟ پری ماں کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے؟"

شام کے وقت رضیہ کو باپ اسی طرح کندھوں پر بٹھا کر واپس گھر لے جاتا۔ رضیہ رات میں اکثر پری ماں کے خواب دیکھتی۔ پری ماں آئی ہے۔ اس نے اپنی جادو کی چھڑی گھمائی ہے اور اس کے پیروں میں طاقت لوٹ آئی ہے۔ اور وہ صبوحی کے ساتھ باغ میں آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔

نیند ٹوٹتی تو وہ اپنے ناکارہ سوکھی لکڑی جیسے پیروں کو دیکھ کر رو پڑتی۔ وہ اپنے خواب کا حال صبوحی سے کہتی۔ صبوحی کوئی دوسری کہانی سُنا کر اُسے پھر ڈھارس بندھاتی۔ اُمید کی جوت پھر جل اُٹھتی۔

صبوحی کے والدین جب اپنی اکلوتی بیٹی کو اس گنوار، اپاہج لڑکی کے پاس دیکھتے تو انھیں

بڑی کوفت ہوتی۔ وہ صبوحی کو کسی بہانے سے بلا لیتے اور اکیلے میں سمجھاتے کہ اس اپاہج لڑکی سے اس کی دوستی ان کے خاندانی وقار سے گری ہوئی بات ہے۔ صبوحی کے دل پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ اُسے جیسے ہی موقع ملتا، وہ دوڑ کر رضیہ کے پاس چلی جاتی۔ صبوحی کو قریب پاکر رضیہ نہال ہو جاتی۔ اسے محسوس ہوتا، اُس کی مُردہ ٹانگوں میں پھر سے جان آ گئی ہے۔

صبوحی کی ماں نے اُسے پلاسٹک کی ایک نہایت خوبصورت گُڑیا لادی۔ وہ کافی بڑی گُڑیا تھی اور چابی گھمانے سے رقص کرتی تھی۔ اسے سلام کرتی اور جاکر ایک جگہ شاہانہ انداز میں بیٹھ جاتی تھی۔ صبوحی بہت دیر تک گُڑیا سے کھیلتی رہی۔ جیسے ہی اس نے دیکھا کہ رضیہ کا باپ اُسے امرود کے پیڑ کے نیچے بٹھا رہا ہے، وہ گُڑیا لے کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے رضیہ کو گُڑیا کے کرتب دکھائے۔ دونوں خوشی سے پاگل ہو رہی تھیں۔

رضیہ گُڑیا کے پیروں کو دیکھتی اور پھر اپنے پیروں کو۔ شاید کسی دن اُسے بھی وہ اسپرنگ مل جائے جس سے بے جان چیز بھی چلنے پھرنے لگتی ہے۔

صبوحی کی ماں نے دیکھا کہ گُڑیا بھی صبوحی کو رضیہ سے ملنے سے باز نہیں رکھ پائی تو اس نے رضیہ کے باپ کو بُلایا اور کہا "دیکھو کچھ دنوں کے لیے رضیہ کو کہیں اور بھیج دو۔"

"لیکن مالکن ___ ؟ دُنیا میں اس کا ہے کون ؟"

"کم از کم کچھ دنوں کے لیے اُسے یہاں نہ لاؤ، صبوحی خراب ہو رہی ہے۔"

دوسرے دن مالی آیا تو رضیہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ صبوحی نے کئی بار اپنی کھڑکی سے باہر جھانکا لیکن پیڑ کے نیچے وہ نظر نہیں آئی۔ وہ اپنی گُڑیا سے کھیلنے میں مصروف ہو گئی۔ اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ صبوحی رفتہ رفتہ گُڑیا میں کھو گئی۔ اب رضیہ کے آنے نہ آنے کا احساس بھی جاتا رہا تھا۔

اُدھر رضیہ کا بُرا حال تھا۔ وہ جب تک گھر پر رہتی، صبوحی کے لیے پریشان رہتی۔ روتی رہتی۔ اپنے باپ سے پُوچھتی "کیا صبوحی مجھے ڈھونڈ رہی تھی ؟"

باپ اُلجھن میں پڑ جاتا۔ وہ اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کہتا "ہاں وہ تمہارے بارے میں پُوچھ رہی تھی۔"

رضیہ نے ضد کی اور باپ کو مجبور ہو کر اسے ساتھ لے جانا پڑا۔ امرود کے پیڑ کے نیچے بیٹھتے ہی اُس نے صبوحی کے کمرے کی جانب دیکھا۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسی جانب دیکھتی رہی۔ کھڑکی کُھلی تو اس نے محسوس کیا، صبوحی اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس نے ہاتھوں سے اشارہ کیا۔ جب وہ نہیں آئی تو اُس نے آواز دی۔ اس کی پُکار اس لمبی چوڑی کوٹھی میں گُم ہو کر رہ گئی۔

صبوحی اسکول جا رہی تھی کہ رضیہ کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے صبوحی کو پُکارا۔ صبوحی نے اس کی جانب دیکھا اور پھر سیدھی اسکول چلی گئی۔ وہ اسکول کے راستے پر نظر جمائے انتظار کرتی رہی۔ چار بجے جب دوسرے بچے اسکول سے گھر واپس ہو رہے تھے، وہ پھاٹک پر نظریں گاڑے انتظار کرنے لگی۔ صبوحی کو دیکھتے ہی اس نے آواز دی۔ صبوحی نے پلٹ کر دیکھا اور کندھے جھٹکائے۔ "میں اب تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔ اب میں اپنی گُڑیا کے ساتھ کھیلتی ہوں۔"

رضیہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ چلّانے لگی "بابا، بابا مجھے گھر لے چلو۔"

باپ گھبرایا ہوا دوڑتا ہوا آیا کہ آخر کیا ماجرا ہے ؟ "کیوں بیٹا، کیا ہوا ؟"

"بابا مجھے گھر لے چلو" رضیہ نے بڑی دھیمی آواز میں کہا، جیسے اس کا حلق خشک ہو رہا ہو۔

"لیکن ابھی تو شام نہیں ہوئی۔ کام بیچ میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں ؟"

"نہیں بابا، مجھے جلدی گھر لے چلو، مجھے جلدی گھر لے چلو۔"

باپ نے دیکھا اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے۔ وہ بُری طرح کانپ رہی ہے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اس کی اپنی آنکھیں ڈبڈبا آئیں بڑے بوجھل دل کے ساتھ اس نے رضیہ کو کندھوں پر بٹھایا اور گھر لے آیا۔

اور صبوحی کا یہ پہلا بچّہ تھا۔ ایک دن کھیلتے کھیلتے لوسی نے کہا، اس کی داہنی ٹانگ میں شل ہو گئی ہے۔ صبوحی نے سمجھا زیادہ کھیلنے کا اثر ہوگا۔ گرم پانی سے دھو دیا۔ یہی کیفیت دوسرے دن بھی ایسی بلکہ کچھ شدید ہو گئی۔ آخر ڈاکٹر کو دکھایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ٹانگ سُوکھتی گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا۔ اسے پولیو ہو گیا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ ٹانگ بالکل مفلوج ہو گئی۔

اب اس کے ساتھ کھیلنے والے بچّے اسے چھوڑ کر چلے جاتے۔ وہ لنگڑاتی ہوئی ان کے پیچھے بھاگتی،

لیکن کچھ ہی دُور جاکر بیٹھ جاتی۔ وہ سوچنے لگی!
—— یہ دوسروں کے بچّے ہیں۔ ہوسکتا ہے کل لوسی کے اپنے بھائی بہن بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کریں۔

صبوحی کو رضیہ یاد آئی۔ اور اچانک وہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ اس کے والدین نے اُسے گڑیا کیوں لاکر دی تھی۔ رضیہ میں اس کی دلچسپی کو کم کرنے کے لیے . . . اور وہ کامیاب ہوئے۔ اس نے رضیہ کو بُھلا دیا تھا۔ اس کی پُکار کو ٹھکرا دیا تھا۔

اس دن جو اُداسی رضیہ کی آنکھوں میں اُتر آئی تھی، وہی اداسی اس کی اپنی لوسی کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

وہ دوڑتی ہوئی رضیہ کے گھر گئی۔ دروازہ کھٹکھٹاتے ہی اللہ بخش باہر نکل آیا۔ وہ بالکل بوڑھا ہوچکا تھا۔ کئی برس ہوتے اس نے کام پر آنا بھی بند کردیا تھا۔ اس نے غور کے ساتھ صبوحی کو دیکھا۔ پہچانتے ہوئے بولا "کہیے سرکار، آپ نے کیسے تکلیف کی؟"

"مجھے رضیہ سے کام ہے۔ رضیہ کہاں ہے؟"

"رضیہ ——۔" اللہ بخش نے حیرانی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر بے شمار چھوٹی بڑی آڑی ترچھی لکیریں اُبھر آئی تھیں آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ وہ سکتے کے عالم میں تھا۔

"جلدی کرو اللہ بخش! میرا رضیہ سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے سرکار! لیکن آپ اس سے

(بقیہ صہ ۱۹ پر)

ماہ رُخ عشرت

دُنیا کی چند خاص چیزیں

۱۔ سب سے بڑا سمندری جہاز۔ کوئن الزابیتھ (انگلینڈ)

۲۔ سب سے بڑا اور گہرا سمندر۔ پیسفک اوشن

۳۔ سب سے بڑا پارک۔ یلو اسٹون نیشنل پارک (امریکہ)

۴۔ سب سے بڑا عجائب گھر۔ برٹش میوزیم (لندن)

۵۔ سب سے زیادہ اونچا درخت جائنٹ اسکوایا ٹری کیلی فورنیا ۳۹۴ فٹ

۶۔ سب سے بڑا ریگستان صحارا (افریقہ)

۷۔ سب سے بڑا دریا۔ امیزن (ساؤتھ امریکہ)

۸۔ سب سے بڑا براعظم۔ ایشیا

۹۔ سب سے چھوٹا براعظم۔ آسٹریلیا

۱۰۔ سب سے اونچا مینار۔ ایفل ٹاور (پیرس) ۹۸۴ فٹ

۱۱۔ سب سے بڑا شہر۔ لندن

۱۲۔ سب سے بڑی لائبریری۔ نیشنل لائبریری (روس) ۷،۰۹۰،۰۰۰ کتابیں

۱۳۔ سب سے لمبا ریلوے پلیٹ فارم۔ سون پور (ہندوستان) ۲،۴۱۵ فٹ

۱۴۔ سب سے بڑا گھنٹہ۔ بال اف ماسکو (روس) وزن ۲۰۰ ٹن

● ڈاکخانہ مارہرہ شریف (ضلع ایٹہ) یو.پی

احمد جمال پاشا

لیٹ لطیف

بہت دنوں کی بات ہے۔ چھوٹا ناگپور کی ایک پہاڑی پر ایک چھوٹے سے صاف ستھرے مکان میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام لطیف تھا۔ وہ اپنی دادی اماں کے ساتھ رہتا تھا۔

لطیف دل کا اچھا مگر کام چور اور کاہل تھا۔ اتنا کاہل کہ کبھی پہاڑی کے نیچے اس ڈر سے نہیں جاتا تھا کہ پھر اسے اوپر بھی آنا پڑے گا۔

اس کی دادی اُسے چڑانے کے لیے لطیف کے بجائے لیٹ لطیف کہا کرتی تھی۔ وہ اس کی کاہلی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ لیکن لطیف جواب میں صرف مسکرا دیتا۔ سختی کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ دادی اسے کام کا آدمی نہ بنا سکی۔ اس کے پاس پھٹا پرانا لباس تھا، جس میں بے شمار پیوند لگے ہوتے تھے۔

ایک رات، دادی نے لیٹ لطیف کو بہت برا بھلا کہا۔ پھر بولی "رات کا کھانا میں نے کھا لیا ہے۔ شب بخیر!" لطیف کو کھانا دیئے بغیر دادی گہری نیند سو گئی۔

لیٹ لطیف نے، نہ کھانا پکانے کے بارے میں غور کیا اور نہ بھوک کے بارے میں کچھ سوچا۔

دوسرے دن صبح دادی نے کام پر جانے سے پہلے کہا: "لیٹ لطیف! کاہل! کام چور لڑکے! اگر تم دن میں محنت مزدوری کرنے نہ گئے تو تمہیں رات کو بھی بھوکا رہنا پڑے گا۔"

رات کو دادی نے لیٹ لطیف کو بتایا کہ رات کا کھانا اس نے کھا لیا ہے۔ اور سو گئی۔ لیٹ لطیف نے کمر بند کو پیٹ پر خوب کس کر باندھا اور سو گیا۔ صبح دادی پھر کام پر چلی گئی۔ رات کو وہ کھانا کھا کر سونے کے لیے لیٹی تو لیٹ لطیف نے کراہتے ہوئے کہا: "دادی میں بھوکا ہوں"——

دادی نے دانت پیستے ہوئے کہا: "میں سست ہوں۔ میں اتنی کاہل ہوں کہ چاول تک نہیں پکا سکی۔ لیٹ لطیف! تم بہت خراب لڑکے ہو! گندے لڑکے! تمہارے کپڑوں میں اب اور پیوند لگانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اتنی سستی ہے کہ میں پیوند تک نہیں لگا سکتی۔ لیکن اتنی کاہل بھی نہیں کہ تمہارے جیسے سست لڑکے سے کام نہ لے سکوں! تم گھر سے نکل جاؤ! جب تک تم محنت مزدوری نہ کرنے لگو گے۔ میں نہ تمہیں کھانا دوں گی، نہ کپڑا! خبردار! جو گھر میں دوبارہ گھسنے کی کوشش کی۔"

دادی نے اس کی تنبیہ والی پرانی جوتی اٹھائی۔ پہلی جوتی ایسی جم کر پڑی کہ لطیف اچھل کر بھاگا۔ دادی نے دوڑانا شروع کیا۔ دوسری جوتی سخت تھی۔ اس نے پڑوس کے باغ میں چھپنے کی کوشش کی لیکن دادی سر پر تھی۔ تڑا تڑ سر پر جوتیاں پڑنے لگیں۔ لطیف تیزی کے ساتھ پہاڑی سے نیچے کی طرف بھاگا۔ تھکا ٹوٹا، پریشان، ایک طرف پڑ کر سو رہا۔

صبح تڑکے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے ہمیشہ سے زیادہ پیٹ خالی محسوس کیا۔ لیٹے لیٹے سوچنے لگا: "پھر اب کیا کیا جائے ——؟" اچانک ایک مہین اور میٹھی آواز نے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

"سلام! لیٹ لطیف! پڑے پڑے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

لیٹ لطیف — "کچھ بھی نہیں ——!"

"ہوں! حسب معمول کچھ بھی نہیں لیکن میں نے ابھی جو کچھ دیکھا ہے۔ اس کے مطابق میرا خیال ہے۔ تم کچھ کام کرنے لگو گے۔ تم میں اتنی سستی ہے کہ تمہارے لیے پہاڑی پر چڑھنا اور گھر تک جانا مشکل ہے۔ اور اگر تم چلے بھی گئے تو تمہاری دادی تمہیں پھر مار پیٹ کر نیچے بھگا دے گی۔ تم اتنے کاہل ہو کہ اپنے آپ کو پٹنے تک سے نہیں بچا سکتے۔ مگر یہاں تم ہمیشہ پڑے نہیں رہ سکتے۔ اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟" لیٹ لطیف نے ایک

پوسٹ آفس سیوان، ضلع سیوان (بہار)

آنکھ تھوڑی سی کھولنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔
"نہ میرا کوئی ارادہ ہے۔ نہ کوئی پروا!"
آنکھ کھلتے ہی مارے حیرت کے لطیف اٹھ بیٹھا۔ اس کے سامنے ایک بالشتیا کھڑا ہوا تھا۔ لمبی سی داڑھی، چمکتی ہوئی ذہین ہری ہری آنکھیں۔ گلاب جیسے سُرخ و سپید گال۔ اس کے ہاتھ میں ایک سارنگی تھی۔ اس کے قد کے برابر وہ بہت زور سے اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"تم بھوکے ہونا؟"
بہت غور کرنے کے بعد لطیف نے کہا "ہوں!"
بالشتیا بولا "کیا تم اتنا بھی نہیں کما سکتے کہ اپنا پیٹ بھر سکو۔؟"
لیٹ لطیف "نہیں! نہ میں نے کبھی کوئی کام کیا۔ نہ کرنا چاہتا ہوں۔ نہ یہ جانتا ہوں کہ محنت مزدوری کیسے کی جاتی ہے؟ ـــ"
اور پھر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ بالشتیے نے کہا۔
"لیٹ لطیف مجھے تمہاری شیروانی بہت پسند ہے۔ اس سے میں ایک بہترین جوڑا بنا لوں گا۔ اس کے بدلے میں میں بغیر کام کے بہترین کھانا کھانے کی ترکیب تمہیں بتا دوں گا۔ لیٹ لطیف نے بالشتیے کو شیروانی دے دی۔ بالشتیے نے شیروانی تہہ کرکے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ لو میری سارنگی۔ پہلی بار جب تم اسے بجاؤ گے تو تمہیں بہترین کھانا ملے گا۔ دوسری بار اس کے بجانے سے تم جیل جانے سے بچ جاؤ گے۔ تیسری بار ہمیشہ کے لیے تمہاری کاہلی ختم ہو جائے گی اور تم کام کے آدمی ہو جاؤ گے۔" یہ کہہ کر بالشتیا غائب ہو گیا۔ لطیف نے بھوک سے تنگ آکر سارنگی بجانے کی کوشش کی۔ ساز کے چھیڑتے ہی سارنگی خود بخود بجنے لگی۔

تُن تُن۔ تُن تُن۔ تُن تُن۔ تُن تُن
سارنگی رے سارنگی لطیفوا کو کھانا کھلاؤ

ایک بڑھیا دونوں ہاتھوں میں دو ٹوکریاں لیے بازار جا رہی تھی۔ ٹوکریوں میں انڈے، توس اور مکھن کی ٹکیاں تھیں۔ ناشتے کے لذیذ سامان سے بھری ہوئی ٹوکریاں۔ سارنگی کا نغمہ سنتے ہی بوڑھی عورت مارے خوشی کے ناچنے لگی۔ سارنگی کے نغمے تیز ہوتے گئے۔ بڑھیا دھما دھم کودنے لگی۔ انڈے ٹوٹ ٹوٹ کر آملیٹ بنتے گئے۔ آملیٹ میں مکھن کی ٹکیاں ملتی گئیں آملیٹ توس میں مل کر سینڈوچ بنتے گئے۔ سینڈوچ اچھل اچھل کر لیٹ لطیف کے منہ میں گھسنے لگے۔ سارنگی کا نغمہ تیز تر ہوتا گیا:

تُن تُن۔ تُن تُن۔ تُن تُن۔ تُن تُن
سارنگی رے سارنگی لطیفوا کو کھانا کھلاؤ

بڑھیا لٹو کی طرح ہوا میں ناچ رہی تھی۔
لیٹ لطیف کا پیٹ بُری طرح پھول چکا تھا۔ مگر منہ میں انڈے، مکھن اور توس گھستے چلے جا رہے تھے۔ سارنگی کا نغمہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ بڑھیا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کا دوپٹہ ہوا میں اُڑ گیا تھا۔ جوتیاں دور گری تھیں۔ موزے پھٹ گئے تھے۔ وہ ناچتے ہوئے چلا رہی تھی۔
"خدا کے لیے اسے روکو! اسے روکو"
لیٹ لطیف کا پیٹ پھول کر کُپّا ہو چکا تھا اور اب پھٹنے کے قریب تھا۔ آخر ایک کاہل مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سارنگی رکھ دی۔ بوڑھی عورت دور جا کر گری۔ وہ زمین پر پڑی ہانپ رہی تھی۔ جب اس کے جسم کی تھرتھراہٹ ختم ہوئی، سانس قابو میں آئی اور اُس نے اپنی خالی ٹوکریاں۔ ٹوٹے انڈوں کے چھلکے مکھن کی ٹکیوں کے خالی کاغذ دیکھے تو وہ غصّہ سے چلائی۔
"چور لڑکے! تم میرے سارے انڈے، توس اور مکھن کھا گئے۔ ابھی میں قاضی سے شکایت کرکے تمہیں جیل بھجواتی ہوں۔"
لیٹ لطیف نے بلا معاملے کی نزاکت پر غور کیے۔ انڈے، مکھن اور توس میں سینڈوچ کا آملیٹ کا آخری ٹکڑا بوڑھی عورت کو پیش کرتے ہوئے کہا۔
"بڑی بی! کھائیے! اتنا مزیدار آملیٹ شاید ہی زندگی میں آپ نے کھایا، یا بیچا ہوگا؟"
بوڑھی عورت کا پارہ چڑھ گیا اور وہ چلانے لگی۔
"چور! چور! ہائے میں لُٹ گئی! پکڑو! پکڑو!"
منڈی جانے والے کسان جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے "آخر معاملہ کیا ہے؟"
لیٹ لطیف پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔ بڑھیا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس نے کسانوں کو بتایا کہ اس لڑکے نے کسی طرح سارنگی بجا کر اس کا سارا بکری کا ناشتے کا سامان کھالیا۔ کسانوں نے جب ٹوٹے ہوئے انڈوں کے چھلکے، مکھن کی ٹکیوں کے خالی کاغذ دیکھے۔ پھر انہیں لیٹ لطیف کے پاس انڈے، مکھن اور توس پڑے دکھائی دیئے تو انہیں بوڑھی عورت کی باتوں پر یقین آگیا۔ انہوں نے لطیف کو پکڑ کر اٹھایا اور چلاتے ہوئے

لے چلے۔

"ہم چور کو قاضی کے پاس لے جا رہے ہیں۔ تاکہ اسے جیل میں بند کر دیا جائے — !"

یہ سب کچھ اسے بہت بُرا لگ رہا تھا۔ جیل لے جانے کی سُن کر اُسے بالشتیے کی بات یاد آگئی۔

"سارنگی کا دوسرا نغمہ تمہیں جیل جانے سے بچا دے گا — !"

لیٹ لطیف نے ہاتھ چھڑا کر سارنگی بجانا شروع کر دی۔ سارنگی کے پُرمسرّت نغموں کے ساتھ ہی غصّے سے بھرے ہوئے کسانوں کے سر ہلنے لگے، پاؤں تھرکنے لگے۔ اور وہ ہاتھوں سے تالیاں بجانے لگے۔ وہ سارنگی بجاتا ہوا، اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ بوڑھی عورت اس کے پیچھے پیچھے ناچتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اچھلتے، کودتے پھرکی کی طرح ناچتے ہوئے کسان چلّا رہے تھے۔

"اسے روکو! خدا کے لیے بند کرو!"

پہاڑی پر سارنگی کے نغمات تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔

سارنگی رے سارنگی! سارنگی رے سارنگی
لیٹ لطیف جیل نہ جانے پائے!

کسانوں کے کپڑے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ ان کی ٹوپیاں لُڑھکتی ہوئی پہاڑی کے نیچے پہنچ گئیں۔ وہ پھرکی کی طرح ناچتے ہوئے رحم کی اپیلیں کر رہے تھے۔ وہ چلّا رہے تھے۔

"خدا کے لیے رُکو! سارنگی بجانا بند کرو!"

سارنگی نے جواب دیا۔

"اُچھلتے رہو! ناچتے رہو! لُڑھکتے رہو!"

آخر وہ ناچتے ہوئے ایک ایک کر کے پہاڑی پر سے لُڑھکتے ہوئے نیچے گرنا شروع ہو گئے۔

بوڑھی عورت جیسے زمین پر گری کسی نے اسے پکارا۔ اُس نے ہانپتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو اسے بالشتیے نے تیزی سے گردن ہلاتے ہوئے ایک اشرفیوں کی تھیلی اُس کے ہاتھ میں تھما دی اور غائب ہو گیا۔ کسانوں نے دوبارہ پہاڑی پر چڑھنے کی ہمّت نہیں کی۔

لیٹ لطیف بڑی کاہلی کے ساتھ سارنگی لیے گھر میں داخل ہوا۔ دادی کھانا پکا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ غصّے سے بے قابو ہو گئی اور چیخنے لگی۔

"ارے تم! لیٹ لطیف! کاہل، سست، کام چور، نوالہ حاضر۔ تمہیں اس لیے گھر سے نکالا تھا کہ تم جا کر محنت مزدوری کرو! اس ناچنے گانے کا میں ابھی تمہیں مزا چکھاتی ہوں۔!" دادی نے سارنگی چھین لی۔ اسے وہ آگ میں جھونکنے جا رہی تھی کہ اُسے خیال آیا۔ "لاؤ ذرا اسے میں بھی تو بجا کر دیکھوں — ؟"

اس نے سارنگی کے ساز کو چھیڑا۔ سارنگی میں سے حسین ترین پُرمسرّت نغمے نکلنے لگے۔

سارنگی رے سارنگی! سارنگی رے سارنگی
لیٹ لطیف اب تم میرے لیے ناچو ناچو!

لیٹ لطیف کا سر تیزی سے ہلنے لگا۔ پیر تھرکنے لگا۔ پلکیں اور بھوئیں تھرکنے لگیں۔ انگلیاں ناچنے لگیں۔ پلنگ پر سے کُود کر باورچی خانے کے چاروں طرف ناچتے ہوئے۔ وہ چلّایا۔

"اسے روکو! اسے بند کرو!"

سارنگی میں سے آواز آئی —

کودو! کودو! میرے لیٹ لطیف!
ناچو رے ناچو! میرے لیٹ لطیف!

لیٹ لطیف نے تیزی سے اُچھلنا، کودنا، تھرکنا اور ناچنا شروع کر دیا۔ وہ اُچھلتا، کودتا اور ناچتا رہا۔ وہ پاگلوں کی طرح ناچ رہا تھا۔ اس کے جسم کا رواں رواں کھل گیا ہے۔ اس کی کاہلی ختم ہو چکی تھی۔ وہ سانس لینے کے لیے رُکنا چاہتا تھا لیکن سارنگی بج رہی تھی۔ وہ ناچے جا رہا تھا۔ ناچتے ناچتے وہ پلنگ پر پہنچ گیا۔ اچھلنے میں اس کا سر اب چھت سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے اپنے بازو لہرائے۔ اپنے پیروں کو اچھالا۔ اس کا کرتا تار تار ہو گیا۔ اس کے جوتے اڑ گئے۔ اس کے پاجامے کی دھجیاں بکھر گئیں اس کے موزے کمرے کے باہر جا رہے۔ لیکن وہ ناچتا گیا، ناچتا گیا۔ سارنگی کے نغمات تیز تر ہوتے گئے:

سارنگی رے سارنگی! سارنگی رے سارنگی
لیٹ لطیف! میرے لیے ناچو!

آگے پیچھے۔ اوپر نیچے، اِدھر اُدھر وہ سر سے پیر تک تھرکتا، ناچتا رہا۔ سانس لینے، دم لینے اور رحم کے لیے بار بار وہ اپیل کرتا رہا۔ لیکن اس کی دادی نے کوئی توجہ نہ کی۔ اب بھی سارنگی بجاتی چلی جا رہی تھی۔ لیٹ لطیف ناچنے میں چلّا رہا تھا:

"دادی! اسے رکھ دو! دادی اسے خدا کے واسطے رکھ دو!"

سارنگی رے سارنگی! سارنگی رے سارنگی
اس وقت تک مجھے بجاتی رہو بجاتی رہو!
جب لطیف کی ساری کاہلی ختم ہو جائے!

لیٹ لطیف اوپر نیچے، ناچتا، کانپتا، لُڑھکتا، اچھلتا اور کودتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ چلانے لگا۔

(بقیہ ص ۱۶ پر)

صباؔ نقوی

دُعا

یارب مری دُعا کو رنگینیٔ اثر دے
دامانِ آرزو کو حُسنِ کرم سے بھر دے

ماں باپ کا ہو جس سے دُنیا میں نام روشن
وہ شوق وہ طلب دے، وہ علم وہ ہنر دے

دُنیا میں رہ کے پالے جو راز آخرت کا
وہ قلب مُطمئن دے، وہ چشم معتبر دے

پروردگار تجھ کو رحمت کا واسطہ ہے
منزل کو جس سے پاؤں، وہ ہمت سفر دے

احساس کے چمن میں، تازہ بہار آئے
میں شاخِ بے ثمر ہوں، تُو دولتِ ثمر دے

ایمان کی تجلّی، سینے میں جگمگائے
مِٹ جائے کُفر جس سے، وہ سوز وہ جگر دے

اِس گُلشن جہاں میں، وہ طرزِ زندگی ہو
جس پر صباؔ گُلوں کی خوشبو نثار کر دے

● آڈیٹ آفیسر، مکان نمبر ۱۰۶۰، آزاد نگر، اررِیہ کورٹ، ضلع پورنیہ (بہار)

رینوں رے

سیّارے

صبح سویرے جب امّی جگنو کو جگانے آئیں تو وہ سوتے میں بڑبڑا رہا تھا۔

"وہ چھوٹا گیند جیسا گولا — اور وہ پیلا پیلا ستارا!"

امّی بولیں: "میاں اب اُٹھ بیٹھو۔ یہ کس پیلے تارے کی باتیں کر رہے ہو؟"

جگنو نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن وہ حیران اور کھویا کھویا سا معلوم ہو رہا تھا۔

ابّا جی نے پوچھا: "میاں کیسا پیلا تارا دیکھا ہے تم نے؟"

جگنو بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "او، ہو۔ یہ بات ہے۔ میں سپنا دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا: میں، نیلو اور اجے آسمان میں اونچے، بہت اونچے اُڑ رہے ہیں۔ وہاں بہت سارے تارے ہیں۔ ہم نے دیکھا چھوٹے گیند جیسا ایک گولا ہے۔ ایک پیلا ستارا ہے۔ وہ گیند جیسا گولا ایک دائرے میں اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ اور بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے تارے ہیں۔"

ابّا جی بولے: "اچھا اچھا، تو جگنو میاں خواب میں خلاء کی سیر کر رہے تھے۔ خوب! لیکن میاں شاید تمہیں معلوم نہیں کہ وہ چھوٹے گیند جیسا گولا ہے کیا؟ وہ ہماری زمین ہے۔ اور وہ پیلا سا تارا سورج ہے۔ اور یہ کہ ہماری زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن بات بس یہیں تو ختم نہیں ہوتی۔ خیر، تم اُٹھو، نہا دھو کر ناشتہ کر لو۔ پھر میں تمہیں تاروں اور سیّاروں کے بارے میں کچھ باتیں اور بتاؤں گا۔"

جگنو جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ لپک کر ضروریات سے فارغ ہوا۔ دانت صاف کیے۔ پھر نہایا۔ اور کپڑے بدل کر فوراً ناشتے کی میز پر آ بیٹھا۔ ناشتہ کر چکا تو ابّا جی کے اِرد گِرد گھومنے لگا۔ وہ تاروں اور سیّاروں کے بارے میں اور باتیں جاننے کے لیے بڑا بے چین ہو رہا تھا۔ اُسے ابّا جی کے آگے پیچھے ہوتے دیکھ کر نیلو نے بھی اسکول کا کام چھوڑ دیا۔ اتنے میں اجے بھی اُچھلتا کودتا ان کے ساتھ آ ملا۔ وہ دونوں جان گئے تھے کہ ابّا جی کوئی خاص بات بتانے والے ہیں۔

بچّوں کو اس طرح آس پاس دیکھ کر ابّا جی ان کی بے چینی کا سبب بھانپ گئے۔ بولے: "آؤ، آؤ، آؤ، مجھے یاد ہے۔ میں نے یہ زمین و سورج وغیرہ کے بارے میں بعض باتیں بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ لو، سنو۔"

"جگنو، تم نے خواب میں خلاء کی سیر کرتے ہوئے چھوٹی گیند جیسا جو گولا یعنی کرّہ دیکھا، وہ ہماری زمین ہے۔ اور جیسا کہ میں نے تمہیں صبح کو بتایا تھا، وہ چھوٹا سا پیلا تارا سورج ہے۔ وہ خلاء میں تو ننّھی سی گیند جتنا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن وہ ہے بہت بڑا۔ سوچو تو ہماری زمین کتنی بڑی ہے۔ کتنا بڑا اس کا گھیرا ہے۔ لیکن شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ سورج کا گھیرا ہماری زمین کے گھیرے سے ۹ر۱ گنا زیادہ ہے۔ یہ آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار چھ سو میل ہے۔ ہماری زمین ایک سیّارہ ہے۔"

اجے نے سوال پوچھا: "ابّا جی، سیّارہ کیا ہوتا ہے؟"

ابّا جی نے جواب دیا: "سورج کے گرد گھومنے والے یہ چھوٹے بڑے گولے یعنی جرمِ فلکی کو سیّارہ کہتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی سیّارہ سورج سے بڑا نہیں۔ زمین کی طرح دوسرے سارے سیّارے بھی سورج کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔"

نیلو کسی سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اچانک

● ۲۹/۳۰ ایسٹ پٹیل نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

بول اٹھی "دوسرے اور کتنے سیارے ہیں؟"

ابّاجی بولے "زمین کے علاوہ آٹھ اور بڑے سیارے ہیں"

ایکا ایکی جگنو بول اٹھا "ابّاجی! ہمیں ان کے نام بتائیے۔"

ابّاجی نے جواب دیا "یہ عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری، زحل، یورے نس، نپ چون اور پلوٹو ہیں۔ یہ سیارے سورج سے مختلف دوریوں پر واقع ہیں۔ سورج کے سب سے قریب واقع سیارہ عطارد ہے اور سب سے دور پلوٹو ہے۔"

ابّاجی کو خاموش پاکر نیلو نے پوچھا "ابّاجی کیا ایسے سیارے بھی ہیں جو ان بڑے سیاروں کے گرد گھومتے ہیں؟"

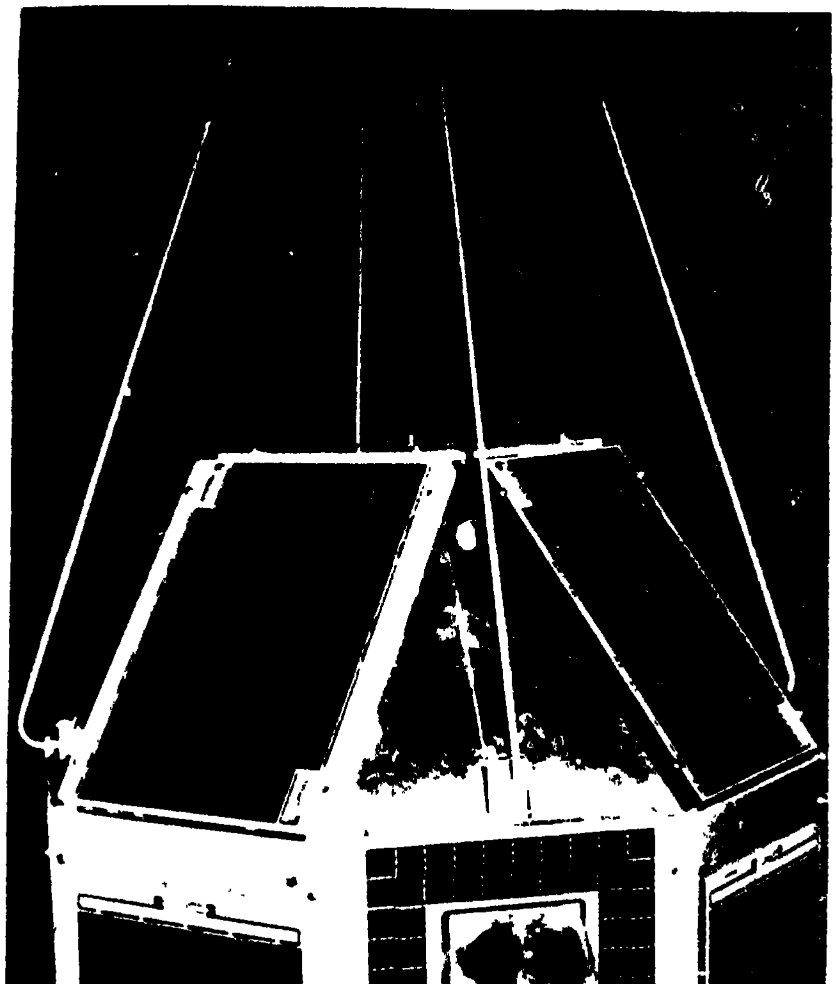
ابّاجی بولے "ہاں۔ ایسے سیارے بھی ہیں۔ ان سیاروں کو سیٹے لائٹس یعنی ثانوی سیارے کہتے ہیں۔ زمین سے زیادہ بڑے جتنے سیارے ہیں، ان کے آگے ثانوی سیارے ہیں۔ زیادہ تر ثانوی سیارے اُسی سمت میں اپنے سیاروں کے گرد گھومتے ہیں جس سمت میں اُن کے سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں لیکن مشتری اور زحل کے بعض ثانوی سیاروں کی بات کچھ انوکھی ہے۔ وہ الٹی گردش کرتے ہیں۔ سیاروں میں مشتری سب سے بڑا ہے۔ سب سے زیادہ ثانوی سیارے مشتری کے ہیں۔ ان کی تعداد بارہ ہے۔ زحل کے نو ثانوی سیارے ہیں۔ اسی طرح یورے نس کے پانچ، نپ چون کے دو اور یعنی زمین کا ایک اور مریخ کے دو ثانوی سیارے ہیں۔ عطارد، زہرہ اور پلوٹو ایسے سیارے جن کا کوئی ثانوی سیارہ نہیں۔ گویا اب تک کل ۳۱ ثانوی سیارے دریافت ہوئے ہیں۔ یہ پچھلے لاکھوں برس اپنے اپنے بڑے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں۔ انہیں چاند بھی کہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ سورج کی روشنی نیچے کی طرف پھیلاتے ہیں۔ سب سے چھوٹے چاند یعنی ثانوی سیارے مریخ کے ہیں۔

اس کے ثانوی سیارے فوبس کا گھیرا دس میل سے کم ہے۔ مریخ جتنی رفتار کے ساتھ اپنے محور کے گرد گھومتا ہے، یہ اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار کے ساتھ مریخ کے گرد گھوم جاتا ہے۔ یہ اپنا ایک گردش سات گھنٹے اور ۳۹ منٹ میں پوری کر لیتا ہے۔

"معلوم ہے! اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟"

تینوں بچّے بے اختیار بول اٹھے "کیا؟"

ابّاجی بولے "مریخ کا یہ ثانوی سیارہ ہمارے



روہنی

شمسی نظام کا ایک اکیلا چاند ہے جو مغرب میں نکلتا اور مشرق میں ڈوبتا ہے۔"

ایک پل چپ رہ کر اباجی بولے "کیا تمہیں معلوم ہے۔ خلا میں مصنوعی یعنی انسان کے بنائے ہوئے سیارے بھی گردش کر رہے ہیں؟"

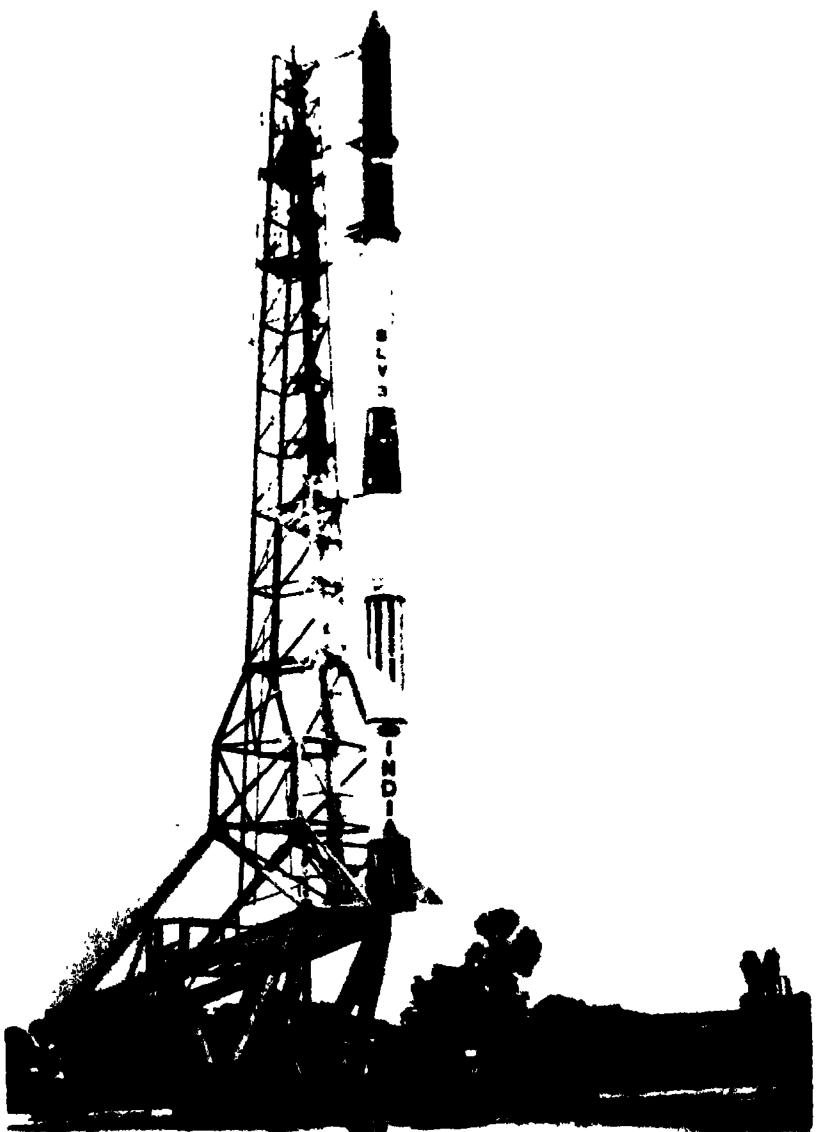
"مصنوعی یعنی انسان کے بنائے ہوئے ثانوی سیارے؟" تینوں بچے پلکیں جھپکاتے ہوئے ایک زبان ہو کر بول اٹھے۔

"ہاں۔" اباجی نے بتایا۔ "روسی سائنس دانوں نے ایسا پہلا مصنوعی سیارہ ۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو خلا میں چھوڑا تھا۔ روسی سائنس دانوں نے ایسا دوسرا مصنوعی سیارہ اسی برس ۳۔ نومبر کو چھوڑا۔ ان سیاروں کا نام اسپوٹنک ہے۔ امریکی سائنس دانوں نے پہلا فروری ۱۹۵۸ء میں خلاء میں چھوڑا تھا۔

نیلو سے نہ رہا گیا۔ بولی "مصنوعی سیارے کیوں چھوڑے جاتے ہیں؟"

"یہ بات ہوئی نا!" اباجی بولے۔ پھر کہنے لگے۔ سائنسی تحقیق کے کام میں مصنوعی سیاروں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کی بڑی ضرورت اور اہمیت ہے۔ ان مصنوعی سیاروں سے زمین کی شکل، بہت اونچائی پر فضا کا درجۂ حرارت، سورج سے حاصل ہونے والی روشنی کی مقدار، بیرونی خلا سے آنے والی کائناتی شعاعوں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ ہر مصنوعی سیارے میں چھوٹے چھوٹے ریڈیو ٹرانسمیٹر لگے ہوتے ہیں۔ مصنوعی سیاروں میں لگے آلے جو معلومات بھیجتے ہیں، وہ نیچے زمین پر ریڈیو ٹرانسمیٹروں کے ذریعے وصول ہوتی ہیں۔ امریکہ نے بعض ایسے مصنوعی سیارے چھوڑے ہیں جو اوپر سے بادلوں کی تصویریں لیتے اور زمین کو بھیجتے ہیں۔ یہ سیارے موسم کی پیش گوئی کے سلسلے میں بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

تینوں بچوں کو حیران اور ہکا بکا دیکھ کر اباجی بولے "سائنسی تحقیق میں یہ مصنوعی سیارے بڑے فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں لیکن ان کی بدولت سب سے بڑا انقلاب رسل و رسائل اور پیغام رسانی میں آیا ہے۔ یہ سیارے پیغام کو آگے پہنچانے والے میناروں کا کام دیتے ہیں۔ ایسے سیارے

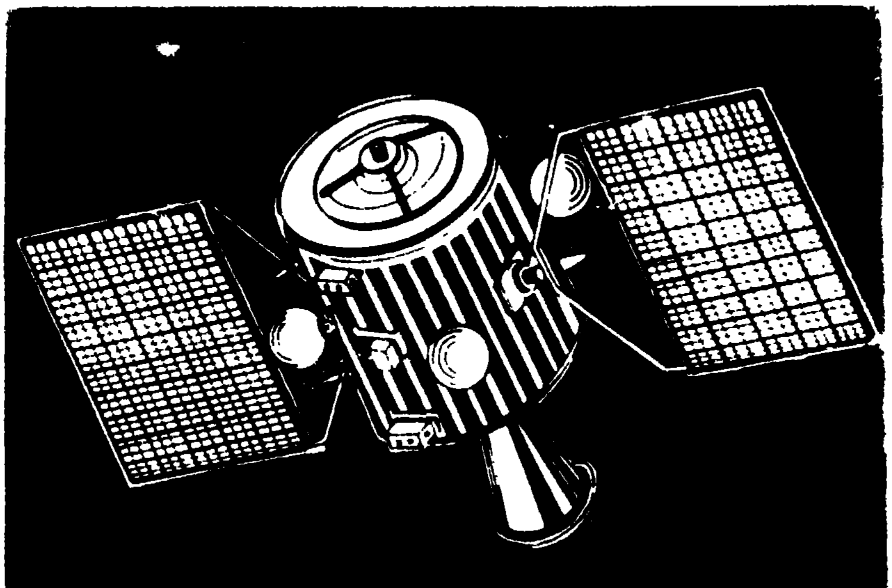


ایس۔ ایل۔ وی۔ ۳

دو قسموں کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو پیغام یعنی سگنل کو اس کی قوت کو بڑھائے بغیر آگے پہنچاتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو سگنل کی قوت کو بڑھا کر آگے پہنچاتے ہیں۔ ایسے مصنوعی سیارے ٹیلی ویژن پروگراموں کو ریلے کرنے میں بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" نیلو نے پوچھا۔

ابّاجی بولے۔ "مثلاً ایک ایسا مصنوعی ثانوی سیارہ TEL STAR ہے۔ یہ امریکہ کے



مواصلاتی سیّارہ ایپل

بیل ٹیلی فون سسٹم نے تیار کیا اور خلا میں چھوڑا تھا۔ اس کے خلا میں چھوڑے جانے کے بعد [illegible] گھنٹوں کے اندر اندر شمالی امریکہ میں پیش کیا جانے والا ٹیلی ویژن پروگرام یورپ کے ملکوں میں ٹیلی ویژن سیٹوں پر دیکھا جانے لگا تھا۔ یہ مصنوعی سیّارے قدرتی ثانوی سیّاروں کے مقابلے میں چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ مثلاً ٹیل اسٹار ہی کو لو۔ اس کا وزن کل ۱۷۰ پونڈ ہے۔ اس کا گھیرا ۳۴½ انچ ہے۔ ایسے دوسرے مصنوعی سیارے ریلے اوّل، سن کوم اور ارلی برڈ وغیرہ ہیں۔ سن کوم سوم کی بدولت ۱۹۶۴ء میں جاپان میں ہونے والے اولمپک کھیل امریکہ میں ٹیلی ویژن پر دیکھے گئے تھے۔ اسی طرح ارلی برڈ نے پہلی بار ۱۹۶۵ء میں امریکہ، یورپ اور ایشیا کے درمیان ٹیلی ویژن پروگرام ریلے کیے۔ اور اگر ہاں ٹیل اسٹار اوّل یا ریلے اوّل جیسے پچاس مصنوعی سیّارے خلا میں چھوڑ دیے جائیں تو کسی بھی ملک میں ہونے والا ٹیلی ویژن پروگرام دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں آسانی سے دیکھا جا سکے گا۔

ہندوستان نے بھی سائنسی تحقیق کے لیے مصنوعی سیّارے چھوڑنے کا پروگرام بنایا ہے۔ ایک ایسا سیّارہ پونا کے قریب آروی کے مقام سے چھوڑا گیا تھا۔ یہ بحر ہند کے اوپر ۲۴۰۰ میل کی اونچائی پر ہے۔ چونکہ یہ سیّارہ زمین ہی کی رفتار سے گھومتا ہے اس لیے ہمیشہ ایک ہی مقام پر دکھائی دیتا ہے۔ ہماری سرکار نے زمینی اسٹیشن ڈیرہ دون کے قریب بنایا ہے۔ اس کی مدد سے پانچ ہزار دیہات میں ٹیلی ویژن پر پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔ اسٹیپ وان (STEP VAN) بھی اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔ کراچی اور لاہور میں کھیلے گئے کرکٹ ٹیسٹ میچ بھی ہندوستان میں اسی STEP VAN کی مدد سے ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے تھے۔ ایسے دوسرے مصنوعی سیّارے آریہ بھٹ اور بھاسکر ہیں۔ مصنوعی سیّارہ آریہ بھٹ خلا میں بڑی مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔ روہنی کا تجربہ کچھ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ تجرباتی مواصلاتی سیّارے ایپل کا چھوڑا اور مدار میں پہنچایا جانا ہماری خلائی تاریخ کی ایک اہم کامیابی ہے۔ یہ سیّارہ ۱۹ جون کو چھوڑا گیا تھا۔

ابّاجی نے دیکھا۔ تینوں بچوں کی آنکھیں خلا میں کسی شے کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ کسی سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔ شاید سوچ رہے ہیں۔ "کاش ایسے بہت سے مصنوعی سیّارے خلا میں ہوتے اور تو وہ دنیا بھر میں ہونے والے کھیلوں اور اچھے اچھے پروگراموں کو اپنے گھر بیٹھے ہی ٹیلی ویژن پر دیکھ لیتے۔"

جگنو کی آنکھیں اب بھی خلا میں کھوئی ہوئی تھیں۔ جیسے سپنا ابھی ٹوٹا نہ ہو۔ جیسے کسی خواب کی تعبیر ابھی دیکھنا باقی ہو۔

فرحت زیدی

ہم شکل

۲۹ جولائی ۱۹۰۰ء کی بات ہے اٹلی کے بادشاہ امبرٹو مونزا نامی ایک قصبے کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں اپنے ایک مصاحب جنرل پونزیو ویگلیا کے ہمراہ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے دوران بادشاہ کی توجہ کا مرکز بڑی بڑی سفید مونچھوں والا وہ عمر رسیدہ شخص تھا جو ہوٹل کے ملازمین کو برابر ہدایت کر رہا تھا تاکہ بادشاہ کی خدمت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

"میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔" اچانک بادشاہ نے کہا "ذرا اس شخص کو بلاؤ میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہم پہلے کہاں مل چکے ہیں۔"

جنرل کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اُس نے اشارہ کیا اور اجنبی بادشاہ کی میز کے قریب آکر ادب کے ساتھ جھکا اور بادشاہ کے سوال کے جواب میں نہایت ادب سے یوں بولا:

"اگر حضور مجھے معاف فرمائیں تو میں عرض کروں کہ حضور نے مجھے اپنے آئینے میں دیکھا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ناچیز حضور سے کافی مشابہ ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" بادشاہ تقریباً اچھل پڑا۔ "تم یقیناً مجھ سے بہت زیادہ مشابہ ہو۔ اور مشابہت بھی کتنی حیرت انگیز، مونچھیں، قد، جسم، چہرہ سبھی ایک جیسا...... اچھا بھئی تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام امبرٹو ہے، عالی جناب۔ اور میرا یہ نام اس لیے رکھا گیا تھا کیوں کہ میں ۱۴ مارچ ۱۸۴۴ء کو ساڑھے دس بجے دن میں پیدا ہوا تھا۔"

"میری پیدائش کا وقت اور تاریخ بھی یہی ہے۔ تم کہاں پیدا ہوتے تھے؟"

"ٹورنیو میں!"

"میری بھی جائے پیدائش ٹورنیو ہے۔" بادشاہ نے زیرِ لب کہا۔ "تمہاری شادی کب ہوئی تھی؟" بادشاہ نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"میری شادی ۱۲ اپریل ۱۸۶۶ء کو ہوئی تھی اور میری بیوی کا نام مارگریٹا ہے۔"

"میری شادی کی تاریخ اور ملکہ کا حقیقی نام!" بادشاہ نے زیرِ لب پھر کہا۔

جنرل ویگلیا نے جو حیرانی سے یہ سارے مکالمے سن رہے تھے، اچانک پوچھا۔

"آپ کے بچے ہیں؟"

"میرا صرف ایک لڑکا ہے اس کا نام میں نے وکٹیوریو رکھا ہے۔"

"شہزادے کا نام!" بادشاہ بدبدایا حلق میں پھنسی ہوئی آواز میں بادشاہ نے کہا "حیرت ہے کہ ہم اس سے پہلے کبھی نہیں ملے۔ تم کیا اس کاروبار کو مدت سے چلا رہے ہو؟"

"میں نے یہ ہوٹل ۹ جنوری ۱۸۷۸ء کو کھولا تھا۔"

"اُسی دن مجھے اٹلی کی بادشاہت ملی تھی..... حیرت انگیز اتفاق ہے..... عجیب بات ہے۔ اس سے پہلے ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی" بادشاہ نے پوچھا۔

"حضور والا مجھے معاف فرمائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم پہلے مل چکے ہیں۔ مجھے حضور کے قریب دو بار کھڑے ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ایک بار ۱۸۶۶ء میں اور دوسری بار ۱۸۷۰ء میں۔ اور ان دونوں بار صرف ہم ہی دونوں تھے جنہیں بہادری کا تمغہ دیا گیا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، تمہارے سینے پر تمغے

● سینٹرل فشریز، ۹ کینٹونمنٹ روڈ، کٹک (اڑیسہ)

میں دیکھ رہا ہوں لیکن ایسا کیسے ہوا کہ میں نے تمہیں اُن مواقع پر دیکھا نہیں۔"

"حضور نے دھیان نہ دیا ہوگا کیوں کہ میں پہلی بار صرف سپاہی تھا اور دوسری بار سارجنٹ۔ جبکہ حضور پہلی بار کرنل تھے اور دوسری بار کمانڈر!"

"آج کی یہ ملاقات بڑی غیر معمولی اور حیرت انگیز ہے۔" بادشاہ نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

"کیا میں یہ اُمید کرنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ حضور آئندہ بھی مجھے خدمت کا موقع بخشتے رہیں گے؟"

"یقیناً۔ آئندہ جب کبھی میں مونزا آیا..... ویسے کیا تمہیں کھیل کود کے مقابلوں سے بھی دلچسپی ہے؟"

"انعام پانے والے اُن خوش قسمت لوگوں میں ایک میں بھی ہوں جنہیں کل حضور کے مبارک ہاتھوں سے انعام حاصل کرنے کا فخر حاصل ہوگا۔"

"میں یاد رکھوں گا۔ اور کل میں تمہیں خصوصی مراعات بھی دونگا۔ اچھا! خدا حافظ میرے ہم شکل دوست!"

اور جب ہوٹل کا مالک تعظیم ادا کرکے جاچکا تو بادشاہ نے اپنے جنرل سے کہا میرا ارادہ ہے، میں اپنے اس ہم نام اور ہم شکل شخص کو کل "تاج اٹلی کا شہسوار محافظ" بناؤں گا۔ خیال رکھنا کہ یہ ضرور موجود رہے۔"

دوسرے دن کھیل کود کے مقابلوں کے دوران جب بادشاہ کی نظریں اپنے ہم شکل کو تلاش کرنے لگیں تو جنرل ویگلیا نے بتایا۔

"حضور کو بتاتے ہوئے ہمیں افسوس ہو رہا ہے کہ ہوٹل کا مالک آج صبح مرگیا۔ پہلے تو پولیس نے سمجھا کہ اُس نے خودکشی کرلی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی موت اچانک گولی چل جانے سے ہوئی۔"

"افسوس!..... کتنی افسوس ناک بات ہے!" پھر بادشاہ نے حکم دیا "پتہ لگاؤ کہ جنازہ کب اُٹھے گا؟ میں جنازے کے ساتھ جاؤں گا۔"

اور جوں ہی بادشاہ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، تین گولیاں چلیں۔ ان میں سے دو گولیاں سیدھی بادشاہ کے دل میں اتر گئیں اور اُسی وقت بادشاہ کی موت ہوگئی۔

اس طرح بادشاہ کی موت دو ہم شکل، ہم نام اور ایک جیسے واقعات سے بھری دو زندگیوں کا خاتمہ ثابت ہوئی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

بقیہ : لیٹ لطیف

"دادی اُرکو! میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کام کروں گا!"

"میں آپ کا ہر کام کروں گا! میں اپنا ہر کام کروں گا!"

بھوں، بھوں، بھوں، اس نے روتے ہوئے چلاکر کہا۔

"میں کام کروں گا! میں کام کروں گا!"

"دادی میں ہمیشہ کام کروں گا! کام کروں گا!"

دادی کو لطیف کی حالت پر رحم آگیا۔ اس نے سارنگی پلنگ پر رکھ دی۔ دیر تک لطیف زمین پر پڑا ہانپتا اور سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے آنسو جاری تھے۔ دادی نے بکس میں سارنگی بند کرکے تالہ لگادیا۔ تاکہ لطیف پھر کبھی سارنگی نہ بجا سکے۔

اس دن سے لطیف انتہائی محنتی لڑکا بن گیا۔ وہ کام پر جانے لگا۔ صاف ستھرا رہنے لگا۔ اس کے جسم پر نئے کپڑے دکھائی دیتے لگے۔ تاہم اگر وہ کبھی بھولے سے کاہلی کا ارادہ کرتا تو فوراً دادی چابی کا گچھا اٹھاکر یہ کہتی ہوئی بکس کھولنے کو بڑھتی۔

"ابھی لاتی سارنگی جس پر ناچے گا۔ لیٹ لطیف!" اور لطیف میں ایک دم سے بجلی کی سی پھرتی آجاتی۔●

بدر مخمور

تتلی اور سارس

تتلی بہت جلدی میں تھی۔ وہ سمندر پار واقع سنگتروں کے باغ میں جلدی سے جلدی پہنچنا چاہتی تھی۔ کوئی وہاں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ قریب ہی کھڑا سارس اپنی عادت کے مطابق کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نہ اُسے جلدی تھی، نہ کہیں جانا تھا۔ سفید جھاگ والی نیلی نیلی لہریں ایک ایک کر کے کنارے پر آ رہی تھیں۔ کبھی کبھار کسی چڑیا کی پیاری سی بولی خاموشی کو ہلکے سے توڑ دیتی تھی۔ سمندر کے اُس پار آسمان اور سمندر جامنی رنگ کے کہر میں مل سے گئے تھے۔ تتلی نے سوچا کیوں نا میں اپنے دوست سارس سے سمندر کے اُس پار جانے میں مدد لوں۔ مگر وہ جانتی تھی، سارس اس پر راضی نہ ہوگا کہ اُسے سمندر پار سنگتروں کے باغ میں چھوڑ آئے۔ پھر بھی تتلی نے اُسے پھانس ہی لیا۔

تتلی بولی: "بھائی سارس میں سوچ رہی تھی کیا تم سے بھی تیز کوئی اُڑ سکتا ہے؟" سارس نے سینہ پھلا کر جواب دیا۔ "مجھ سے زیادہ تیز کون اُڑ سکتا ہے؟"

"ہاں میں جانتی ہوں ایک کوئی اور ہے جو تم سے تیز اُڑ سکتا ہے۔ کیا تم اس سے تیز اُڑ کر دکھا سکتے ہو؟" تتلی بولی، سارس نے جواب دیا "میں تم سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے، جو مجھ سے زیادہ تیز اُڑنے کی طاقت رکھتا ہے؟"

تتلی ہنس کر بولی: "تم اس جھگڑے میں کیوں پڑتے ہو۔ تم سے تیز تو خود میں اُڑ سکتی ہوں۔"

سارس ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ اور کہنے لگا۔ تمہارے تو پرخچے ہوا کے ایک ہی جھونکے سے اُڑ جائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، تم کسی گمان میں ہو۔

تتلی نے یہ بات سنی اور ہنس کر بولی "بھائی سچائی تو یہ ہے کہ تم مجھ سے مقابلے کرنا نہیں چاہتے۔ یہی ڈر ہے نا کہ ہار جاؤ گے۔ اور ہار کیسے برداشت کر پاؤ گے"۔ یہ سارس برداشت نہ کر سکا اور تڑخ کر بولا۔ "اگر تم اپنے کو بے وقوف ہی ثابت کرنا چاہتی ہو تو یہ احسان میں تم پر کر سکتا ہوں۔ میں تم سے کہیں بھی اور کہیں تک اُڑنے کے مقابلہ کے لیے تیار ہوں تاکہ تمہیں اپنی طاقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے۔"

تتلی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اُسے امید بندھتی نظر آئی۔ تتلی کو چپ دیکھ کر سارس بولا "خوب چلو اسی وقت مقابلہ شروع کرو۔" پھر سارس سوچ میں پڑ گیا۔ بولا "آخر تم سمندر پار ہی کیوں جانا چاہتی ہو؟"

تتلی بولی: "تم بھی کتنے نادان ہو! کیا تم نے کبھی رنگین مچھلیاں کھائی ہیں جو اتنی لذیذ ہوتی ہیں کہ بس خیال آتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے جو میں تم سے سمندر پار کے جزیرے میں اُڑ کر جانے کو کہہ رہی ہوں۔"

سارس پھر سوچنے لگا۔ بولا "تتلی کیا تم نہیں جانتی ہو کہ وہ کتنی دور ہے۔ اور میرا کیا لیکن تم تو وہاں تک کبھی نہیں پہنچ پاؤ گی۔ بس راستے ہی میں ڈھیر ہو جاؤ گی۔"

تتلی نے بات بگڑتی دیکھ کر طعنہ دیا۔

"پیچھے ہٹ گئے نا۔ بولو، ہار مانتے ہو نا۔"

سارس نے پھر جھلا کر کہا۔ "کیا کروں، اگر تم مرنا ہی چاہتی ہو تو چلو۔"

● مکان نمبر ۶، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

تتلی بولی "تم میری پروا نہ کرو۔ میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں۔ مقابلہ شروع کرو۔"

تتلی یہ کہتے ہوئے ٹھیک سارس کی ناک کی سیدھ میں آگے آگے اڑنے لگی۔ سارس نے بھی پنکھ تولے اور تتلی کے پیچھے پیچھے اُڑنے لگا۔ اور پھر آگے نکل گیا۔ تتلی ہوشیار تھی۔ وہ چپکے سے سارس کی پیٹھ پر بیٹھ گئی اس طرح کہ سارس کو پتہ بھی نہ چلا۔ سارس تیزی سے اُڑنے لگا۔ تتلی کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی آرام دہ تازہ دھنی ہوئی روئی کے گدے پر لیٹی ہے۔ ادھر سارس کے گمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ تتلی اس کی پیٹھ پر بیٹھی ہوئی ہے۔ سارس نے تھوڑی دور تک اُڑنے کے بعد محسوس کیا کہ وہ اکیلا ہی اُڑ رہا ہے۔ تتلی تو نہ آگے ہے اور نہ پیچھے۔ اس نے سوچا میں ابھی کیوں جلدی کروں اور وہ آہستہ آہستہ اُڑنے لگا۔ وہ جانتا تھا تتلی کبھی اس سے آگے نہیں نکل سکتی۔

مگر جیسے ہی سارس آہستہ ہوا تتلی اُڑ کر اس سے آگے نکل گئی۔ بولی "چچا جان میں یہاں ہوں۔"

سارس نے دیکھا کمال ہے۔ یہ تو بالکل نہیں تھکی۔ یہ کیا بات ہے۔ اور اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ تتلی موقع پا کر پھر سارس کی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد سارس نے پھر مڑ کر دیکھا۔ اب وہ تھک بھی چکا تھا اور چاہتا تھا کہ تھوڑا آرام کرے۔ جب تتلی اُسے دکھائی نہیں دی تو اُس نے شکر ادا کیا۔ سوچنے لگا چلو اچھا ہوا تتلی کہیں پیچھے رہ گئی۔ اس ضدی تتلی سے میرا پیچھا چھٹا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اطمینان کا سانس لے تتلی اُسے آگے اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ بالکل ناچنے کے انداز میں اُڑ رہی تھی۔ اُڑتے اُڑتے وہ چلائی "ارے بھائی سارس جلدی کرو۔ اگر تم وقت پر نہ پہنچے تو تمہاری رنگین مچھلیاں بوڑھی ہو کر مر جائیں گی۔ اور تم پھر کیا کھاؤ گے تمہاری یہ دوڑ بھی بے کار جائے گی۔"

سارس کو غصہ آگیا۔ اور وہ ایک بار پھر تیزی سے اُڑنے لگا۔ تتلی موقع پاتے ہی پھر اپنی پرانی جگہ پر بیٹھ گئی۔ سارس اُڑتا رہا اُڑتا رہا۔

پھر اسے وہ جزیرہ نظر آنے لگا، جس تک وہ مرکعب کر پہنچنے والا تھا۔ جزیرے پر پہنچنے کے بعد وہ ناریل کے ایک درخت پر بیٹھ گیا۔ اور خود کو شاباشی دینے لگا کہ آخر مقابلے میں اُسی کی جیت ہوئی۔

اچانک تتلی کے یہ لفظ اُس کے کانوں میں پڑے "میں یہاں ہوں چچا سارس۔ اور بہت بہت شکریہ کہ آپ مجھے یہاں تک لائے" اور یہ کہتے ہوئے تتلی پاس ہی سنگتروں کے باغ میں غائب ہو گئی۔

بقیہ : ٹھیس نہ لگاؤ

نہیں مل سکتیں۔"

"میں کیوں نہیں مل سکتی؟" صبوحی نے زور دے کر پوچھا۔

"اس سے اب کوئی نہیں مل سکتا۔ وہ اب اس دنیا کے دکھوں سے آزاد ہو گئی۔"

"یہ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟" صبوحی لگ بھگ چیختے ہوئے بولی۔

"سرکار! کیا بتلاتا۔ جب مالکن کا حکم ہوا کہ اُسے وہاں نہ لے جاؤں تو میں نے اُسے باغ میں لے جانا بند کر دیا۔ وہ دن بھر یہاں روتی رہتی۔ مجبوراً مجھے اُسے لے جانا پڑا۔ لیکن اس وقت آپ اپاہج رضیہ کو بھول کر گڑیا کے ساتھ کھیلنے لگی تھیں جس دن آپ نے کہا "میں اب تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گی . . ." وہ ضد کر کے گھر لوٹ آئی۔ دوسرے دن میں نے اُسے باغ میں چلنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ اسی دن جب شام میں میں کام کر کے لوٹا تو دیکھا وہ مری پڑی تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا: رضیہ دکھوں سے چھوٹ چکی تھی۔

صبوحی نڈھال قدموں سے گھر لوٹ رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہی خیال بار بار آ رہا تھا کہ وہ لوگوں سے چیخ چیخ کر کہے "لوگو۔ بے جان گڑیا سے انسان کے بچے زیادہ اہم ہیں۔ ان آبگینوں کو ٹھیس نہ لگاؤ ــــ نہ لگاؤ ٹھیس کہ کوئی نہیں جانتا!"

ہاں کون جانتا ہے، کل کیا ہوگا؟

زندگی کی کتاب

وقار خلیل

زندگی کو کتاب کہتے ہیں
علم کو آفتاب کہتے ہیں
زندگی، زہر بھی ہے امرت بھی
اِک مُصیبت بھی، ایک نعمت بھی
زندہ دِل اس طرح سے جیتے ہیں
ہر مُصیبت کو ہنس کے سہتے ہیں
زور جن کے قلم میں ہوتا ہے
ہر کوئی ان کی قدر کرتا ہے
زر، زمیں، ذات پات کے جھگڑے
یہ تو سامان ہیں تباہی کے
زینہ زینہ، قدم قدم، چلنا
اپنی منزل کو آپ پالینا
زندگانی کی اِک نشانی ہیں
بچّے اسبابِ شادمانی ہیں

● ایوان اُردو، پنج گٹہ روڈ، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۴

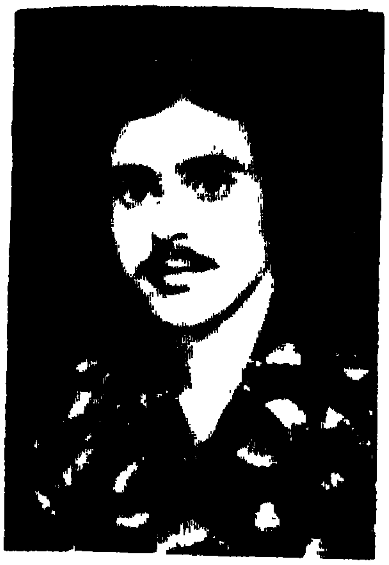
رُت گرمیوں کی آئی

طلحہ تابش

اسکول بند ہوئے ہیں رُت گرمیوں کی آئی
آؤ خوشی سے جھومیں، دھومیں مچائیں بھائی
سب کاپیاں کتابیں بستے میں اپنے رکھ دو
چھوڑو حساب کا حل، جُغرافیہ کو بھولو
کب جنگ پانی پت کی برپا ہوئی نہ سوچو
اب کچھ دنوں کی خاطر ان سے نجات پائی
میداں میں دوستوں سے کرکٹ کا میچ کھیلیں
لاؤ یہ بیٹ بھائی وِکٹیں زمیں میں گاڑیں
رَن کی اگر ہے چاہت کچھ اور تیز بھاگیں
سُستی ہوئی ہے جس سے اس نے وکٹ گنوائی
باغوں میں چل کے آؤ مالی کو ہم ڈرائیں
کچھ اس سے آم لے کر مل جُل کے ساتھ کھائیں
دن ڈھلتے ڈھلتے لیکن گھر اپنے لوٹ آئیں
ڈر ہے گرے نہ پانی کب سے گھٹا ہے چھائی
آؤ خوشی سے جھومیں، دھومیں مچائیں بھائی
اسکول بند ہوئے ہیں رُت گرمیوں کی آئی

● معرفت نازش پرتاپ گڈھی، پرتاپ گڈھ (یوپی)

خورشید حیات



انوکھی تبدیلی

ماسٹر صاحب کا لڑکا ندیم بڑا شرارتی تھا۔ شرارت اُس کی رگ رگ میں بسی تھی۔ کبھی کسی اپاہج کی بیساکھی چھین لی تو کبھی کسی کے سائیکل کی ہوا نکال دی۔ محلہ بھر میں بجلی کے کھمبوں کے بلب اُس کی غلیل کا نشانہ ہوتے تھے۔ کوئی کہاں تک گنواتے۔ اُس کی شرارتوں کی کوئی حد نہیں تھی۔

ماسٹر صاحب ہمیشہ اُسے سمجھاتے۔

"بیٹا! اتنی شرارتیں، مت کیا کرو۔ دوسروں کا دل کبھی نہیں دُکھانا چاہیے۔ بجلی کے سارے بلب جو تم نے توڑ ڈالے، کیا اس سے صرف دوسروں کا نقصان ہوگا؟ کیا اندھیرے میں تمہیں ٹھوکر نہیں لگ سکتی؟ اور اگر کسی کے پاؤں میں کانچ کے یہ ٹکڑے چُبھ جائیں تو؟ بیٹا! کھائی جو تم نے دوسروں کے لیے تیار کی ہے تم خود بھی تو اس میں گر سکتے ہو؟ میں تم کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔ اب ماشاء اللہ تم نو سال کے ہوگئے ہو، انگلی پکڑ کر ٹہلانے یا لوریاں دے کر بہلانے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ تمہیں اپنی صلاحیتوں کا بہت صحیح استعمال کرنا چاہیے۔

ندیم پر اپنے ابا کی ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اُس کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگی۔

وقت کا چکر چلتا رہا۔ صبح شام میں اور شام رات میں تبدیل ہوتی رہی۔ ہفتہ مہینے میں اور مہینے سال میں تبدیل ہوتے رہے۔ ندیم اب چودہ سال کا ہو گیا تھا۔ اُس کی شرارتیں بھی اُس کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھ گئی تھیں۔ بچوں کے بین الاقوامی سال کے موقع پر تو اس نے حد کر دی۔ محلّہ کے سارے بوڑھوں کے سر منڈوا کر اُن سب کو ایک لائن میں کھڑا کر دیا۔ پھر اُن کے ہاتھوں میں ایک بورڈ تھما دیا تھا جس پر لکھا تھا "یہ ہے بچوں کا سال تو اگلا سال گنجوں کا سال ہوگا۔"

محلے کے سارے لوگ اپنے بچوں کو اس کے قریب تک جانے نہ دیتے۔ معلوم نہیں، کس وقت کیا کر بیٹھے۔

ایک دن ندیم اپنے ساتھیوں کے ساتھ محلے کے چوراہے پر کھڑا تھا۔ اُدھر سے ایک اندھے فقیر کا گذر ہوا —— جو یہ کہہ رہا تھا ——

"کوئی سڑک پار کرا دے۔ میں اندھا ہوں۔ مجھ پر رحم کریں۔"

ندیم اور اس کے ساتھیوں کو شرارت سوجھی۔ چلئے بابا میں آپ کو راستہ بتا دوں۔ ندیم اُس اندھے فقیر کا ہاتھ پکڑ کر بڑھنے لگا۔ چوراہے پر کھڑے لوگ سمجھ رہے تھے کہ اب کوئی نئی شرارت ہونے والی ہے۔ لیکن منع کون کرے ..... اپنی عزت کون گنوائے .....

اندھا فقیر اور ندیم سڑک کے کنارے کنارے بڑھ رہے تھے ..... اور پھر اچانک اُس نے اندھے فقیر کو ایک گڈھے میں دھکیل دیا۔

اندھا بیچارہ چیختا چلاتا گڈھے میں جا گرا۔ اُس نے خوب دُعا دی۔ اللہ تمہارے ساتھ بھی ایک

• "الحیات"، نیو کریم گنج، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

دن..... اللہ کی لاٹھی میں آواز..... !

●

ایک دن رات میں ماسٹر صاحب اپنے گھر کے پاس والی دُکان سے پان لانے کے لیے ننگے پاؤں چلے گئے۔ جب وہ پان کھا کر لوٹنے لگے تو اچانک کانچ کے کئی ٹکڑے اُن کے پاؤں میں چبھ گئے۔ خون کی دھار بہنے لگی۔ کپڑا جلا کر اُس میں لگایا گیا۔ کسی نے ڈٹول لگانے کو کہا۔ پڑوسیوں کے پاس اس وقت قسمت سے ڈٹول نہیں تھا۔

بالآخر ندیم کو دوا کی دُکان تک جانا پڑا۔ فلمی ہیرو کی طرح دوڑتا ہوا گیا اور دوڑتا ہوا واپس لوٹنے لگا۔ آہ..... اُسے ایک زوردار ٹھوکر لگی۔ راستے کے بیچ میں پتھر آج ہی اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے رکھا تھا تاکہ اندھیرے میں سڑک پر آنے جانے والے گریں اور اُسے مزا آئے۔ Dettol (ڈٹول) کی شیشی دور جا گری تھی۔ کھوجنے پر نہیں ملی۔ اندھیرے میں ٹٹولنے پر رقیق جیسا کچھ ہاتھ میں لگا --- ڈٹول بہہ چکا تھا --- اب کیا ہوگا؟ پیسہ بھی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے کسی طرح گھر پہنچا۔ اپنے ابا کی طرف دھیان دئے بغیر وہ اپنے کمرے میں جا گھسا۔ رات بھر درد کی شدت سے کراہتا رہا۔

●

ایک دفعہ ٹھوکر لگنے کے بعد بھی اُس کی شرارتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ روز بروز اضافہ ہوتا رہا..... اور پھر ایک دن اُس نے اپنی زندگی کے پھولوں بھرے چمن کو اپنے ہاتھوں سے جلا کر راکھ کر دیا۔

●

رات گہری ہو رہی تھی۔ ندیم نائٹ شو دیکھنے کے لیے سائکل پر بہت تیز رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ حالانکہ اُسے معلوم تھا، دونوں بریک کام نہیں کرتے۔

وہ تیز تیز پیر مارتا جا رہا تھا۔ سائکل کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی..... تیز..... اور تیز..... ! یا اللہ یہ کیا ہوا؟ روشنی بھی گل ہوگئی۔ ابھی تو سینما ہال کافی دور ہے۔ اُف! اندھیرے میں وہ سائکل چلاتے تو کیسے چلاتے؟ سینما ہال بھی جلدی پہنچنا ہے اور اندھیرے میں ٹکر ہوگئی تو ایک الگ مصیبت اُٹھ کھڑی ہوگی۔

ندیم نے اپنی سائکل کی رفتار اور تیز کر دی۔ اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اچانک اندھیرے میں کوئی آدمی اس کی سائکل کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ کون تھا؟ اندھیرے میں اسے کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ وہ آدمی بُری طرح کراہ رہا تھا --- !

ندیم نے جلدی سے سائکل سنبھالی اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ سینما ہال پہنچا تو معلوم ہوا فلم شروع ہوئے ایک گھنٹہ ہوگیا ہے۔ اُس کا موڈ آف ہوگیا۔

اب اس کی سائکل دھیمی رفتار سے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ بوجھل قدموں سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اچانک باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے سمجھا شاید ابا ہوں گے --- اُس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان کے قدموں کے پاس کسی کی لاش پڑی تھی۔ لاش کا منہ ڈھکا ہوا تھا

"کیا ہوا حلیم بھیا؟ یہ لاش..... یہ لوگ..... میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔" "کیا بتاؤں بیٹا؟ تمہارے ابا کو کسی نے سائکل سے اتنی زبردست ٹکر ماری کہ وہ.....!"

یہ سنتے ہی ندیم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں۔ اس کی سانسوں میں دبی دبی ہچکیاں گھل گئیں۔

ندیم نے ابا کی لاش کی طرف آخری بار دیکھا بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھیں آسمان کی بلندیوں کی طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسو اس کے پلکوں سے گر کر ابا کے کفن میں جذب ہوگئے۔ اُس کی شرارتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھن لگ چکا تھا ---

اگلی صبح محلے والوں نے دیکھا: ندیم کُرتا پاجامہ اور سر پر ٹوپی پہنے، محلہ کے بزرگوں کو سلام کرتا ہوا مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ ندیم کی اچانک اس تبدیلی کو بھی کچھ لوگ نئی شرارت سمجھ رہے تھے۔

محسنؔ ملیح آبادی

براوقت

وہ اخبار کے اس حصّے کو کتنے ہی بار دیکھ چکا تھا۔ ہر بار ایک نئی امید کے ساتھ۔ لیکن ہر بار اسے مایوس ہونا پڑا تھا۔ اخبار کے اس کالم میں جس میں اس کا نتیجہ نکلا تھا اس کا نمبر غائب تھا۔ پھر اسے خیال آیا اس نے اخبار کے اس کالم میں اپنا نمبر تلاش کیا جس میں سپلی منٹری والوں کے نمبر تھے لیکن اس بار بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ افسردہ سا پلنگ پر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے اس نے سوچا آج ہی اس کی مارکشیٹ ملے گی۔ لیکن مارکشیٹ لینے کیسے جاؤں اب تو میں اپنے کسی دوست کو منھ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہا۔ یہ سوچ کر اسے بہت دکھ ہوا۔ پھر اس نے سوچا مسرت کو بھیج کر ایاز کو بلوالے اور اس سے کہدے کہ وہ اسکول جائے تو میری مارکشیٹ بھی لیتا آئے۔ اس وقت مسرت امی کو اپنی مارکشیٹ دکھارہی تھی اس کا نتیجہ پرسوں نکلا تھا وہ پانچویں میں گڈ سکینڈ ڈویژن پاس ہوئی تھی۔ مسرت او مسرت اس نے مسرت کو دبی بی آواز میں پکارا۔ جیسے سنتی ہی نہیں کمبخت۔ مسرت کے اس کی طرف نہ دیکھنے پر وہ بری طرح جھلایا۔ کمبخت گڈ سکینڈ ڈویژن کیا پاس ہوئی ہے جیسے ٹاپ کر لیا ہو، سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔ میں جو ہر سال فرسٹ کلاس پاس ہوتا تھا میں نے تو کبھی اس پر اپنا رعب نہیں جمایا، میں کبھی مغرور نہیں ہوا۔ مگر یہ ... یا پھر شاید ابو اور امی نے ہم سے بولنے کے لیے اسے منع کردیا ہو۔ وہ لوگ شاید مجھے یہی سزا دینا چاہتے ہیں خاموش نظروں کے تیروں سے گھائل کرنا چاہتے ہیں۔ امی نے جب سے اس کے فیل ہونے کی خبر سنی تھی خاموش تھیں جیسے اس سے نہ بولنے کی قسم کھالی ہو۔ اور ابو اُف! ابو کی قہر آلود نظروں سے تو وہ سہم گیا تھا۔ خیر ہوئی ابو کا غصہ ان کی نظروں تک محدود رہا۔ ورنہ وہ تو جب غصے میں آتے ہیں قیامت برپا کردیتے ہیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا ایک بار جب وہ اسٹڈی ٹائم میں پتنگ اڑا رہا تھا۔ اور غیر متوقع وقت میں ابو آگئے تھے بس پھر کیا تھا۔ اس دن امی کے لاکھ چھڑانے پر بھی انھوں نے اسے ادھ مرا کردیا تھا۔

کئی بار پکارنے کے بعد بھی جب مسرت نے اس کی طرف نہیں دیکھا تو اس نے سوچا۔ وہ خود ایاز کے گھر چلا جائے گا۔ آنٹی سے سامنے ہوگا تو ہوجائے کم سے کم وہ اسکول جانے سے تو بچ جائے گا۔ ورنہ اسکول میں تو اسے کتنے دوستوں اور ماسٹروں سے سامنا کرنا پڑے گا وہ کیسے کیسے بتائے گا۔ اور پھر آنٹی کو تو ایاز نے پہلے ہی بتادیا ہوگا۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور قلم لینے کے لیے الماری کھولی۔ الماری کھولتے ہی اس کی نظریں کتابوں پر پڑیں اور اس کا سر چکرا گیا۔ اس نے بڑی اذیت سے سوچا۔ کیا یہی کتابیں مجھے پھر پڑھنا پڑیں گی پھر اسی کلاس میں بیٹھنا پڑے گا۔ نئے نئے لڑکوں کے ساتھ وہ لوگ اس سے ضرور پوچھیں گے۔ پھر کیا اسے بتانا پڑے گا کہ وہ فیلیر ہے۔ اپنے دوستوں میں وہی اکیلا فیلیر ہے۔ اس نے اخبار میں اپنے سب دوستوں کے نمبر تلاش کیے تھے اس کے سب دوست پاس تھے۔ بس وہی ... اچانک اس کی نظریں کتابوں سے ہٹ کر ایک طرف رکھے ہوئے انعامات پر جم گئیں۔ اُف ـــــ

یہ ڈھیر سارے انعامات جو اسے منہ چڑا رہے تھے ۔
یہ سارے انعامات اسے ہر سال پاس ہونے پر ملے تھے ۔
زہ خوبصورت سا پین ـــــ یہ اس کے انکل نے پچھلے ہی
سال دیا تھا ۔ وہ خوبصورت سی ڈائری ـــــ یہ اسے ایاز
کی امّی نے دی تھی ۔ اور یہ قلمدان ـــــ قلمدان پہ نظر پڑتے
ہی اسے اپنے ماسٹر رحمٰن صاحب کا خیال آگیا اور اس نے
کرب سے منہ پھیر لیا ۔ یہ انعام پچھلے سال فرسٹ کلاس
اس ہونے پر ماسٹر رحمٰن صاحب نے خصوصی طور پر اسے
یا تھا ۔ انعام دیتے وقت انھوں نے بڑی شفقت سے
ر اکے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا بہت ہونہار
بچّہ ہے ۔ ایک روز یہ ساری دنیا میں اپنا اپنے والدین
ر اپنے ملک کا نام روشن کرے گا ۔

لیکن اس بار . . . اس بار اسے کیا ملا ، سوائے طنز
امت اور غصّے کے ۔ رزلٹ آؤٹ ہونے پر جب
کل آئے تھے حسب روایت انھوں نے اسے انعام
ے نوازا تھا ، سینے سے لگایا تھا اور نہ خوش آیند
عبیریں دی تھیں بلکہ آتے ہی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے
ں سے پوچھا تھا ۔ اس بار ایسا کیسے ہوگیا ؟ اور وہ ابّو
کے جواب پر بے حد افسردہ ہوگیا تھا ۔ انھوں نے کہا
قا ، پتنگ بازی بھی تو حد سے بڑھ گئی تھی ۔ پھر انھوں
نے اس کی طرف غصّے سے دیکھتے ہوئے کہا تھا ـــــ "بس
ب پتنگ بازی کرتے رہو پڑھائی وڑھائی ختم ۔

" یہ بھی کہاں کی حماقت ہے ایک تو بچہ فیل ہو
ں پر اسے بار بار اس کے فیل ہونے کا احساس
لایا جائے ۔ ڈرایا دھمکایا جائے ۔ ویسے ہی بچّے کو
پنے فیل ہونے کا کیا کم دکھ ہوتا ہے " انکل نے ابّا
کو سمجھایا تھا ۔

اس نے الماری بند کردی اور باہر نکل آیا ـــــ
سیدھا ایاز کے گھر کی طرف چل دیا ۔ ایاز کے گھر کی طرف
جاتے ہوئے وہ عجیب سا خوف محسوس کر رہا تھا ۔
اور دل ہی دل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ خدا کرے
گھر میں آنٹی نہ ہوں ، کوثر بھی نہ ہو صرف ایاز ہو لیکن
اس کی دعاؤں نے کچھ بھی اثر نہ دکھایا جیسے ہی وہ ایاز
کے گھر میں گھسا سامنے ہی آنٹی کھڑی الگنی پر کپڑا پھیلا
رہی تھیں ۔ آنٹی نے اسے دیکھ لیا تھا ۔ اس سے پہلے کہ
آنٹی اس سے کوئی سوال کریں وہ جلدی سے پوچھ بیٹھا ۔
"آنٹی ایاز کہاں گیا ہے ؟" وہ تو سویرے ہی سویرے اسکول
چلا گیا تھا ۔ وہ تو پاس ہوگیا ہے مگر تمھارے متعلق بتا رہا
تھا کہ تم . . . فیل ہوگئے ہو ۔ وہ نظریں جھکائے خاموش
کھڑا رہا ۔ اس سے پہلے کہ آنٹی اس سے دوبارہ پوچھتیں وہ
بول اٹھا ـــــ اچھا آنٹی ایاز آئے تو بتا دیجئے گا شکیل
پوچھنے آیا تھا ۔ اور وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا باہر
نکل آیا ۔ وہاں سے نکل کر اس نے سوچا اب وہ خود
اسکول جائے گا اور اپنی مارکشیٹ لائے گا ۔ چھپنے سے
کہاں تک بات بنے گی ـــــ اور وہ اسکول کی طرف چل
دیا ۔ مگر دل میں عجیب عجیب اندیشے پیدا ہو رہے تھے
کہیں راستے میں اس کا کوئی کلاس فیلو نہ مل جائے تو پھر
وہ کس طرح اس سے نظریں ملائے گا ۔ اس نے تو اپنے
دوستوں سے بڑی بڑی ڈینگیں ماری تھیں ۔ میرا حساب کا
پیپر تو اتنا اچھا ہوا ہے کہ بس اور سوکس کا تو اس سے بھی
اچھا ہوا ہے اور پریکٹیکل میں تو وہ سب سے زیادہ
نمبر لائے گا ۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا اور
اب وہ کون سا منہ لے کر ان لوگوں کے سامنے جائے
گا ـــــ

جب وہ اسکول کے گیٹ پر پہنچا ، اس نے دور
سے دیکھا ۔ اسکول کے کمپاؤنڈ میں بہت سے لڑکے جمع

تھے۔ اس نے سوچا وہ گھر واپس چلا جائے ورنہ اتنے ڈھیر سارے لڑکوں کے سامنے اگر کسی نے اس سے پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گا، کیا وہ ان سب کے سامنے کہہ دے گا کہ فیل ہوگیا ہے — "نہیں !" اسے لوٹ جانا چاہیے۔ ابھی وہ اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ اسے اپنے پیچھے سنائی دی —" او ہو شکیل تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو ؟" اس نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا سامنے ایاز اور پرویز کھڑے تھے۔

"یار بڑا دکھ ہوا" ایاز نے دکھ کا اظہار کیا۔ مگر یار تم تو کہتے تھے کہ تمھارے پیپر بہت اچھے ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا وہ خاموش کھڑا پینترے بدل رہا تھا کہ کس طرح ان لوگوں سے نجات ملے اور وہ آگے بڑھے۔ "یہ دیکھو ہماری مارکشیٹ" — ایاز نے اپنی مارکشیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے ایاز کے ہاتھ سے مارکشیٹ لے کر دیکھی۔ ایاز سیکنڈ ڈویژن پاس ہوا تھا۔ "مبارک ہو" اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ایاز کی مارکشیٹ اسے لوٹا دی۔ پرویز نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اور نہ ہی اس نے پرویز سے۔ پرویز سے اس کی بول چال نہیں تھی۔ اس نے سوچا۔ پرویز یقیناً اس کے فیل ہونے پر خوش ہوا ہوگا۔ اس نے چور نظروں سے پرویز کی طرف دیکھا۔ اس وقت پرویز کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اس کا خون خشک ہوگیا۔ اس کے سارے جسم میں پرویز کی طنزیہ مسکراہٹ کے تیر پیوست ہوگئے۔ وہ تلملا اٹھا مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔

" وقت تنگ ہو چکا ہے، فلم شروع ہو جائے گی" پرویز نے گھڑی دیکھتے ہوئے ایاز سے کہا۔

" اچھا یار میں ذرا جلدی میں ہوں" — ایاز نے اسے معذرت چاہی اور سائیکل آگے بڑھا دی۔

—— اور وہ اسکول کے کمپاؤنڈ کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ایاز میرا کتنا اچھا دوست ہے مگر آج مجھے کس طرح نظر انداز کر گیا، دن دن بھر وہ میرے ساتھ رہتا تھا۔ ہم دونوں ہر سال پاس ہونے کی خوشی میں ایک ساتھ پکچر بھی دیکھتے تھے۔ اس بار میں فیل ہوگیا تو اس نے مجھے اس طرح نظر انداز کر دیا۔ ٹھیک ہی ہے، آگے بڑھنے والوں کو ہر کوئی دیکھتا ہے، پیچھے مڑ کر کون دیکھتا ہے۔

جب وہ کمپاؤنڈ میں پہنچا ایک ساتھ کئی نظریں اس کی طرف اٹھیں مگر وہ نظریں جھکائے تیزی سے آفس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ کاؤنٹر پر پہنچتے ہی اس کی نظریں کیلاش بابو پر جم گئیں۔ کیلاش بابو نے مسکرا کے اس کی طرف دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ کیلاش بابو نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا ہو۔ شرم نہیں آتی کیلاش بابو کو، یہ تو مجھ سے بڑی ہمدردی جتاتے تھے۔ اور آج میرے فیل ہونے پر ہنس رہے ہیں۔ میرے فیل ہونے سے انھیں کیا خوشی ہوئی —— سچ ہے برے وقت میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا — اس نے سوچا۔ وہ تو بہت کچھ سوچتا مگر کیلاش بابو کے ان جملوں نے اسے بری طرح چونکا دیا — کیلاش بابو کے ہاتھ میں مارکشیٹ تھی اور وہ پیار بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "میں تمھیں مارکشیٹ اس وقت تک نہیں دوں گا جب تک تم ہمارے لیے مٹھائی لے کر نہیں آؤ گے، ہر سال کی طرح تم اس سال بھی اسکول بھر میں اول نمبروں سے پاس ہوئے ہو" — اسے محسوس ہوا کیلاش بابو نے اسے خلاء میں اچھال دیا ہے اور آسمان کی طرف اٹھتا اوپر بہت اوپر چلا جا رہا ہے۔





جسمانی طور پر معذور بچوں کو نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے بلکہ عام بچوں کی طرح انہیں ورزش (قواعد) بھی کرائی جاتی ہے۔ تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ وہ بالکل دوسرے تندرست بچوں جیسے ہیں۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Arcee Press, 5, Deshbandhu Gupta Road, Paharganj, New Delhi-110055

ے
مگر
ے
خوشی
ہوگیا
ے،
ان

